الجزء الثالث (3)

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَ رَفَعَ وقف لازم

ان رسولوں میں سے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے(324) ان میں سے وہ ہیں جن سے اللہ نے کلام کیا

324- تِلْكَ۔ یہ اشارہ ان رسولوں کی طرف ہے جن کا ذکر اسی سورت میں ہو چکا ہے۔ اور غور کیا جائے تو ﴿مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ [البقرة:4:2] ''جو تجھ سے پہلے اتارا گیا'' اور ﴿مَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ﴾ [البقرة: 136:2] ''جو نبیوں کو اپنے رب کی طرف سے دیا گیا'' میں کل دنیا کے انبیاء علیہم السلام کا ذکر ہو چکا۔ پس ﴿تِلْكَ الرُّسُلُ﴾ میں کل دنیا کے رسولوں کی طرف اشارہ ہے۔

فَضَّلْنَا۔ تَفْضِيْلٌ۔ فَضِيْلَةٌ۔ فَضْلٌ میں درجہ بلند ہے اور تفضیل فضیلت کا عطا کرنا یا کسی ایسی صفت یا خصلت کا ایک میں رکھ دینا ہے جو اس کو دوسروں سے ممیز کر دے۔ (ت)

رسولوں کی فضیلت کا ذکر یہاں کس تعلق سے شروع کیا؟

پیچھے فرمایا تھا تم رسولوں میں سے ایک ہو اور یہاں فرمایا ان رسولوں کو ہم نے ایک دوسرے پر فضیلت دی تھی۔ گویا یوں فرمایا کہ تم رسولوں میں سے ایک ہو اور سب پر فضیلت رکھتے ہو اور یہ کوئی امر مستبعد نہیں اس لیے کہ رسولوں کو ایک دوسرے پر فضیلت ہونے میں کوئی حرج نہیں۔ بغیر اس کے سلسلہ مضمون ٹھیک نہیں رہتا اسی کے مطابق روح المعانی میں ہے: [اِسْتِئْنَافُ مَشْعَرٍ بِالتَّرَقِّيْ كَأَنَّهُ قِيْلَ إِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ وَأَفْضَلِهِمْ فَضْلًا] (روح المعانی، جلد3، صفحہ: 2) اور اصل میں اشارہ یہاں اس لیے کیا کہ متعدد موقعوں پر رسول کریم ﷺ کی فضیلت کا ذکر ہو چکا تھا۔ مثلاً کل جہانوں کی طرف مبعوث ہونے میں پھر قرآن کریم کی سب کتابوں پر فضیلت میں۔ پھر اس کے پہلی ساری شرائع کے ناسخ ہونے اور ان سے بہتر ہونے میں۔ پھر آنحضرت ﷺ کے تمام مذاہب عالم کے جھگڑوں میں فیصلہ کرنے والا ہونے میں۔ اس لیے فرمایا کہ تم جو ان سب رسولوں کی جگہ لیتے ہو یہ تمہاری فضیلت ﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ﴾ [البقرة: 136:2] ''ہم ان میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے۔'' کے خلاف نہیں۔ کیونکہ پہلے رسولوں کو بھی ایک دوسرے پر فضیلت دی ہے اور یہاں چونکہ حضرت داؤد علیہ السلام کو بادشاہت اور نبوت دونوں دینے کا ذکر آیا تھا جو دوسرے انبیائے بنی اسرائیل پر ان کی ایک فضیلت تھی۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ کی فضیلت کا ذکر کیا **کیونکہ آپ کو بھی نبوت کے ساتھ اب بادشاہت مل رہی تھی** اور ایک کو دوسرے پر **فضیلت دینے سے یہ منشا نہیں کہ وہ دوسرا ناقص ہے**۔ بلکہ دو کامل انسانوں میں جو چیز ایک کو دوسرے سے ممیز کرتی ہے یا جو کوئی زائد بلند مرتبہ دیا جاتا ہے وہی اس کی فضیلت ہے۔ گویا کمال انسانی کے بھی مختلف مدارج ہیں۔

آنحضرت ﷺ کا جامع کمالاتِ انبیاء بنی اسرائیل ہونا:

ایک اور بات اس جگہ یاد رکھنے کے قابل ہے۔ نبی کریم ﷺ کی اس فضیلت کا ذکر سلسلہ موسویہ کے دو عظیم الشان انبیاء داؤد اور عیسیٰ علیہما السلام کے درمیان کیا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام ظاہری شان و شوکت کے لحاظ سے ان انبیاء میں سب سے بڑھ کر ہیں تو

بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَ اٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَ اَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ

اور بعض کو مراتب میں (اور) بلند کیا(325) اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو کھلے دلائل دیئے اور روح القدس سے

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اخلاقی اور روحانی تعلیم کے لحاظ سے۔ نبی کریم ﷺ ان دونوں پہلوؤں سے دونوں سے بلند تر ثابت ہوئے۔ علاوہ بریں ان دونوں نبیوں نے آنحضرت ﷺ کے متعلق جو پیشگوئیاں کی ہیں ان میں آپ کی آمد کو خدا کی آمد قرار دیا ہے۔ دیکھو [زبور: 110] اور [متی: 21:33-44] گویا باوجود اپنے اپنے کمالات ظاہری و باطنی کے انہوں نے آنحضرت ﷺ کے کمالات ظاہری و باطنی کو اس بلند مرتبہ پر پایا کہ آپ کی ہر دو شانوں میں ان کو خدا کی شان نظر آئی۔

آنحضرت ﷺ کی یہ فضیلت جس کا ذکر اس لطیف پیرایہ میں کلام الٰہی میں پایا جاتا ہے اس کے برخلاف وہ احادیث نہیں جن میں ایسے الفاظ آتے ہیں کہ مجھے موسیٰ پر فضلیت مت دو، یا یونس پر فضیلت مت دو۔ کیونکہ اصل میں وہ خاص موقع کی باتیں ہیں۔ بخاری کی اس حدیث میں جس میں موسیٰ علیہ السلام پر فضیلت نہ دینے کا ذکر ہے۔ یہ واقعہ درج ہے کہ ایک صحابی کا ایک یہودی کے ساتھ اسی بات پر جھگڑا ہو گیا تھا اور آپ کو غالباً یہ خیال گزرا ہوگا کہ ایسا نہ ہو کہ اس طرح مقابلہ میں ایک نبی اللہ کی تحقیر ہو جائے۔

325- ﴿كَلَّمَ اللّٰهُ﴾۔ كَلَامٌ۔ الفاظ منظومہ کا نام ہے جو معنی رکھتے ہوں [دیکھو نمبر: 100]۔ اللہ کا کلام کرنا کس طرح ہوتا ہے؟ اس کی تصریح خود قرآن کریم نے [الشوری: 51:42] میں فرمائی ہے جہاں فرمایا کہ **صرف تین طرح پر اللہ تعالیٰ کا کلام بندہ کے ساتھ ہوتا ہے**۔ ایک دل میں ڈال کر یعنی وحی خفی۔ ایک پردہ کے پیچھے سے یعنی رؤیا کشف الہام کی صورت میں۔ ایک ملک یعنی جبریل علیہ السلام کو بھیج کر۔ ان کے علاوہ اور کوئی طریق کلام کا نہیں۔ امام راغب نے بھی دنیا میں اللہ کے انسان کے ساتھ کلام کرنے کو انہی تین طریقوں پر قرار دیا ہے۔

رَفَعَ۔ رَفَعَ کے چار معنی [نمبر: 93] میں بیان ہوئے ہیں ان میں یہاں شرف منزلت مراد ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا انسان کو رفع کرنا صرف اسی معنی میں آتا ہے نہ اس کو نیچی جگہ سے اٹھا کر بلند جگہ پر رکھ دینے میں جس میں خود اللہ تعالیٰ کا اسم الرافع شاہد ہے جس کے معنی ہیں: [اَلَّذِيْ يَرْفَعُ الْمُؤْمِنَ بِالْإِسْعَادِ وَأَوْلِيَاءَهُ بِالتَّقْرِيْبِ.] (ل) وہ جو مومن کو نیک بخت بنا کر اور اپنے اولیاء کو اپنا قرب عطا فرما کر رفع کرتا ہے۔

درجات کے پہلے یا کچھ محذوف ہے جیسے فِيْ اور یا درجہ بمعنی رِفْعَةٌ لے کر انتصاب علی المصدر ہے یا حال ہے اور مراد ذو درجات ہے ان الفاظ کا کیا منشا ہے؟ صورت کلام سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ صرف بعض رسولوں کے ساتھ کلام ہوا اور بعض کے مرتبے بلند ہوئے ان سے کلام نہیں ہوا۔ اس لیے کسی نے کہا یہاں کلام بلا واسطہ ملک مراد ہے جیسے طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اور معراج کی رات آنحضرت ﷺ سے مگر یہ ﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ﴾ [الشوری: 51:42] ''کسی بشر کے لیے یہ میسر نہیں'' کے حصر سے خارج ہے۔ اس لیے وہ کلام بھی ان تینوں اقسام میں سے ایک قسم کا ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ ابھی لکھا جا چکا ہے اور کسی نے کہا كَلَّمَ

الْقُدُسِ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَ لٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَ مِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۫ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۲۵۳﴾ ع 33 5 1

اس کی تائید کی[326] اور اگر اللہ چاہتا تو وہ لوگ جو ان کے بعد ہوئے آپس میں نہ لڑتے۔ اس کے بعد ان کے پاس کھلی دلیلیں آچکی تھیں۔ لیکن انہوں نے اختلاف کیا پس ان میں سے وہ ہے جو ایمان لایا اور ان میں سے وہ ہے جس نے انکار کیا اور اگر اللہ چاہتا تو وہ آپس میں نہ لڑتے لیکن اللہ جو کچھ ارادہ کرتا ہے کر دیتا ہے۔[327]

اللہُ سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ﴿ رَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ﴾ سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ مگر یہ تخصیص بلا وجہ ہے۔ کلام تو سب سے ہوا۔ اصل میں یہ ترکیب ایسی ہی ہے جیسے دوسری جگہ فرمایا: ﴿ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴾ ایک فریق کو تم نے جھٹلایا اور ایک فریق کو قتل کرتے ہو۔ یہ مراد نہیں کہ جن کو قتل کرتے ہو ان کو جھٹلایا نہیں بلکہ وہ پہلا مرتبہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ ایک کے ساتھ تو اسی قدر مخالفت کی کہ ان کے جھٹلانے پر بس کی مگر دوسرے کے لیے قتل کے منصوبے بھی کیے اسی طرح پر یہاں مراد یہ ہے کہ کلام تو پہلا مرتبہ ہے۔ بعض رسولوں کے ساتھ تو اللہ تعالیٰ نے کلام ہی کیا یعنی ان کو صرف تعلیم اور ہدایت کے ساتھ بھیجا اور بعض کو کچھ اور مراتب بھی دیئے جیسے بادشاہت جس کا اوپر حضرت داؤد علیہ السلام کے ذکر میں بیان ہوا۔ نبوت اور بادشاہت دونوں اکٹھی بہت کم کو ملی ہیں اور ان سب کے سرتاج ہمارے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

326- ان الفاظ کی تشریح پہلے ہو چکی ہے [نمبر: 111]۔ **یہاں حضرت عیسیٰ کا علیہ السلام نام اس لیے لیا** کہ جب ایک طرف حضرت داؤد علیہ السلام کی فضیلت اس رنگ میں بیان کی کہ ان کو نبوت کے ساتھ بادشاہت دی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو بادشاہت سے بالکل خالی گزرے ان کا نام بھی لیا کہ ان کو اور رنگ کے کمالات دے دیئے گئے یا اس لیے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قومی نبیوں میں سے آخری نبی ہیں اور اس سے اگلے الفاظ میں اس نبی کی طرف اشارہ ہے جو کل دنیا کی طرف آیا۔

327- اِقْتَتَلَ۔ اِقْتِتَالٌ اور مُقَاتَلَةٌ کے ایک ہی معنی ہیں یعنی باہم جنگ کرنا۔

سب قوموں کی طرف ایک رسول کے آنے کی ضرورت:

یہاں فرماتا ہے کہ اگر خدا چاہتا تو پہلے جو رسول قوموں کی طرف بھیجے گئے تھے ان کے بعد ان کے پیرو باہم جنگ نہ کرتے۔ لیکن چونکہ ارادہ الٰہی یہی ہو چکا تھا کہ سب نبیوں کے آخر میں ایک نبی آئے اور وہ سب دنیا کی قوموں کو بھائی بھائی بنائے۔ اس لیے اہل مذاہب نے باہم جھگڑے کیے اور گو مَشِیَّتْ کا بمعنی ارادہ بھی استعمال ہو جاتا ہے مگر اصل میں اللہ کی مشیت اس کا چیزوں کو خاص رنگ میں وجود میں لانا ہے۔ پس چونکہ اس نے انسان کو بنایا ہی ایسا ہے کہ اس کے اندر قوائے مختلفہ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّ لَا شَفَاعَةٌ ؕ وَ الْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۵۴﴾

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اس میں سے جو ہم نے تم کو دیا ہے خرچ کرو، اس سے پہلے کہ وہ دن آجائے جس میں نہ کوئی خرید وفروخت ہوگی اور نہ کوئی دوستی اور نہ ہی کوئی سفارش اور کافر ہی ظالم ہیں۔ (328)

جمع ہوں جن سے اس کی تمام ترقیات پیدا ہوتی ہیں اور قوائے مختلفہ کے غلط استعمال سے ہی جھگڑا پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے ﴿وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا﴾ کے معنی صرف یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ چاہتا تو انسان کو ایسا بناتا کہ اس کے اندر قوائے مختلفہ نہ ہوتے مگر اس کی مشیت نے یہی چاہا کہ وہ دوسری مخلوق سے بڑھ کر ترقی کرے اور اس لیے قوائے مختلفہ اس کے اندر رکھے یَفْعَلُ مَا یُرِیْدُ میں یا تو یہی اشارہ ہے کہ انہی قویٰ کے اچھے استعمال سے وہ نیک نتیجہ پالیتا ہے اور بد استعمال سے برا اور یا یہ کہ ارادہ الٰہی یہ ہے کہ کل دنیا کے جھگڑوں اور اختلافوں کے فیصلہ کے لیے ایک رسول کل دنیا کی قوموں کی طرف بھیجے۔

328- خُلَّةٌ۔ خَلَلٌ دو چیزوں کی درمیانی کشادگی کو کہتے ہیں اور خُلَّةٌ محبت ہے یا اس لیے کہ وہ دل کے وسط میں ہوتی ہے اور یا اس لیے کہ وہ دل کے اندر گھس جاتی ہے۔ محبت کو بھی محبت اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ حَبَّةُ الْقَلْبِ کے اندر داخل ہوتی ہے۔ (غ)

قیامت میں بیع، خلت، شفاعت کے نہ ہونے سے کیا مراد ہے:

قیامت کے دن جن تین چیزوں کے نہ ہونے کا ذکر کیا ہے یعنی تجارت، تعلقات محبت، سفارش۔ وہ وہی ہیں جو انسان کے لیے خدا کی راہ میں مال خرچ کرنے میں روک ہوجاتی ہیں۔ ایک شخص اپنی تجارت میں اس قدر غرق ہوتا ہے کہ وہ نہیں چاہتا کہ اس کا ایک پیسہ بھی اس تجارت سے باہر لگے۔ اس لیے خدا کی راہ میں دینے سے رکتا ہے۔ یا جہاں تعلق محبت ہوتا ہے وہیں سارا مال خرچ کر دیتا ہے اور خدا کی راہ میں نہیں دیتا۔ یا سفارش یعنی کسی بڑے آدمی کا تعلق مانع ہوجاتا ہے۔ اس لیے جب ضرورت جنگ کا مضمون ختم ہوا تو اسلام کی کامیابی کی بشارت دیتے ہوئے انفاق کی ضرورت اول ظاہر کی جس مضمون کو آگے دو رکوعوں میں بسط کے ساتھ بیان کیا ہے اور مال کے خدا کی راہ میں دینے میں جو چیزیں مانع ہیں ان کے متعلق فرمایا کہ یہ قیامت کے دن تمہارے کسی کام نہ آئیں گی اور تلافی مافات نہ کریں گی۔ یہاں اصل مقصد بیان کرنے کا صرف اسی قدر ہے کہ اس دنیا کی تجارت، اس دنیا کی دوستی، اس دنیا کی سفارش وہاں نہ ہوگی۔ کیونکہ یہی چیزیں خدا کی راہ میں مال خرچ کرنے سے روک ہیں۔

<u>اس عالم کی خلت اور شفاعت اور چیزیں ہیں</u>۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍۢ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ﴾ [الزخرف: 67:43] دوست اس دن ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے سوائے متقیوں کے۔ معلوم ہوا کہ وہ خُلَّتْ جو اتقاء سے پیدا ہوتی ہے اور جو درحقیقت اس عالم کی چیز نہیں وہ باقی رہے گی، اس دنیا کی دوستی نہ رہے گی۔ اسی طرح فرمایا: ﴿لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يَرْضٰى﴾ [النجم: 26:53] ''جن کی شفاعت کام نہیں دیتی، مگر اس کے

اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ ۚ وَ لَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ

اللہ، اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ ہمیشہ زندہ خود قائم، قائم رکھنے والا ہے۔[329] اس پر نہ اونگھ غالب آتی ہے اور نہ نیند، اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، وہ کون ہے جو اس کے پاس سوائے اس کی اجازت کے سفارش کرے؟ وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے سامنے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے اور وہ اس کے علم میں سے کسی چیز پر احاطہ نہیں کر سکتے سوائے اس

بعد کہ اللہ جسے چاہے اور پسند کرے اجازت دے۔'' پس وہ شفاعت جس کی بنا اللہ تعالیٰ کی رضا ہے وہ اس کے اذن سے وہاں ہوگی۔ مگر وہ شفاعتیں جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے خلاف ہیں اور جن کا تعلق محض اس دنیا سے ہے وہ باقی نہ رہیں گی۔

کفار سے مشابہت نہ ہو:

آیت کے آخری الفاظ کافر ہی ظالم ہیں۔ دو باتوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ اول یہ کہ مومنوں کو جو یہ ضرورت جنگ پیش آئی، تو یہ ان کی خواہش سے نہیں بلکہ ظلم کافروں کی طرف سے ہے کہ وہ حق کو نیست و نابود کرنا چاہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ خدا کی راہ میں مال نہ خرچ کرنا جو ظلم ہے کیونکہ اس کا حق ادا نہیں ہوتا، یہ کافروں کا کام ہے۔ مومن کے لیے یہ شایاں نہیں۔ یا ڈرایا کہ انفاق سے انکار کر کے کافروں سے مشابہت پیدا نہ کریں۔

329- اَلْحَیُّ۔ وہ جس کے لیے ہمیشہ کی زندگی ہے۔ (ج) یعنی نہ اس کے اول کی کوئی حد بندی ہے نہ آخر کی۔ امام راغب نے جو اقسام حیات بیان کی ہیں ان میں سے چھٹی قسم جو اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص کی ہے وہ ہے جس پر موت کا لفظ کبھی صادق نہیں آ سکتا۔ پھر بعض لوگوں نے توجیہات کی ہیں کہ وہ حی بالتدبیر ہے یعنی جس طرح چاہتا ہے امور میں تصرف کرتا ہے اور جو اندازے چاہتا ہے مقرر کرتا ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ اگر حیات مخلوق کی ایک صفت ہے تو خالق کی صفت حیات ضرور ہے کیونکہ جو صفت خالق میں نہیں وہ مخلوق میں پیدا نہیں ہو سکتی۔ وہ حیّ ہے اور حیات کا سرچشمہ ہے۔

اَلْقَیُّوْمُ۔ قِیَامٌ سے مبالغہ کا صیغہ ہے۔ [اَلْقَائِمُ الْحَافِظُ لِكُلِّ شَيْءٍ وَالْمُعْطِيْ لَهُ مَا بِهِ قَوَامُهُ.]۔ (المفردات للراغب، جلد1، صفحہ 417) (غ) یعنی خود قائم اور ہر چیز کا حافظ اور اس کو وہ اسباب عطا فرمانے والا جن کے ساتھ اس کا قیام ہے۔ اس کے معنی میں دونوں باتیں شامل ہیں: [اَلْقَائِمُ بِذَاتِهِ وَالْمُقَوِّمُ لِغَيْرِهِ] یعنی اپنی ذات میں قائم دوسروں کو قائم رکھنے والا۔

الْاَرْضَ ۚ وَ لَا يَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ کے جو وہ چاہے۔ (329ل) اس کا علم آسمانوں اور زمین

329ل- تَاْخُذُهٗ۔ اَخَذَ یعنی پکڑ نا کبھی قہر یعنی غلبہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ (غ) تَاْخُذُ کے معنی یہاں یہی ہیں یعنی اس پر غالب آتی ہے۔

سِنَةٌ۔ اس کا مادہ وَسَنٌ ہے دونوں کے معنی غفلت اور خواب ہیں۔ (غ) یا سِنَةٌ اونگھ ہے جو نیند تک نہ پہنچے جس پر یہ شعر بطور شہادت ہے: [فِيْ عَيْنِهِ سِنَةٌ وَلَيْسَ بِنَائِمٍ]۔ (ل) اس کی آنکھ میں اونگھ ہے وہ سویا ہوا نہیں۔

سِنَةٌ کو نوم پر مقدم کرنے کی وجہ: نیند سے پہلے اونگھ کا ذکر اس لیے کیا کہ تَاْخُذُهٗ کے معنی میں غلبہ ہے۔ اونگھ اس پر غالب نہیں آتی بلکہ نیند جو اس سے شدید تر ہے وہ بھی اس پر غالب نہیں آسکتی۔ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ ایک شخص پر اونگھ تو غالب نہ آئے مگر نیند سے وہ مغلوب ہو جائے۔

شفاعت کے لیے ضرورتِ اذن:

﴿يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾ شفاعت پر [دیکھو نمبر: 71]۔ یہاں شفاعت کے لیے اذن الٰہی کو ضروری قرار دیا ہے اور اس اذن کی ضرورت نہ صرف شفاعت کرنے والے کے ہی بکار ہے بلکہ جس کے لیے شفاعت کی جائے اس کے متعلق بھی فرمایا: ﴿لَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى﴾ [الأنبياء: 28:21] شفاعت کرنے والے بھی اسی کے متعلق شفاعت کریں گے جسے اللہ تعالیٰ پسند کرے۔ پس شفاعت نہ تو شفاعت کرنے والے کے اختیار کی کوئی چیز ہے کہ جب چاہے شفاعت کرے اور نہ جس کے لیے شفاعت کی جائے اسے کوئی حق ہے کہ وہ اپنا شفیع پیش کرے۔ شفاعت میں اذن کا مفہوم اصل میں کیا ہے۔ اس کی حقیقت حدیث شفاعت سے منکشف ہوتی ہے۔ اس میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ میں قیامت کے دن بارگاہ الٰہی میں سجدہ میں گر جاؤں گا یہاں تک کہ مجھے حکم ہوگا کہ کہو تمہاری بات قبول کی جائے گی اور شفاعت کرو تمہاری شفاعت قبول کی جائے گی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی **یہ شفاعت بھی درحقیقت قیامت کے دن دعا کا ہی ایک رنگ ہے** جس طرح اس دنیا میں آپ نے اپنے صحابہ کے لیے اور اپنی امت کے لیے دعائیں کر کے ان کو گناہوں سے پاک وصاف کیا۔ اسی طرح قیامت کے دن بھی آپ ان لوگوں کے لیے دعا کریں گے اور وہ آپ کی دعا قبول ہو کر آپ کی شفاعت قبول کی جائے گی۔ جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ اس دنیا میں نیک لوگوں کی دعائیں قبول ہوتی ہیں وہ اس رنگ کی شفاعت کا انکار نہیں کر سکتے اور یہ بات بالکل صاف ہے کہ جب ہمارے نبی کریم ﷺ کی شفاعت اس دنیا میں بھی ظاہر ہوئی، یہاں تک کہ صحابہ کو نہ صرف روحانی طور پر تزکیہ کے مقام پر ہی پہنچایا بلکہ ظاہری طور پر بھی بادشاہت ان کو عطا فرمائی۔ تو قیامت کے دن آپ کی شفاعت کا ظہور ہونا خود ایک ثابت شدہ امر ہے۔ اسلام نے ہر ایک سچائی پر ایسی کامل روشنی ڈالی ہے کہ اس کے کسی پہلو کو تاریکی میں نہیں چھوڑا۔

﴿مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ﴾ جو کچھ سامنے ہے وہ امر دنیا ہے اور جو پیچھے ہے وہ امر آخرت ہے۔ (ج) یا اس کے خلاف۔ (غ) یا مراد ہیں پہلی گزری ہوئی باتیں اور آئندہ ہونے والی یا محسوس اور غیر محسوس۔

وَ هُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ﴿۲۵۵﴾ پر حاوی ہے (329ب) اور ان دونوں کی حفاظت اس پر

يُحِيْطُوْنَ ۔ اِحَاطَةٌ ۔ دوطرح پر ہے۔ایک اجسام میں دوسرا علم میں۔علم میں احاطہ سے مراد ہے کہ ایک چیز کے وجود اور جنس اور کیفیت اور غرض کو جو اس سے مقصود ہے پوری طرح جانا جائے اور یہ بات سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کو حاصل نہیں۔(غ) حتیٰ کہ ایک ریت کے ذرہ کے پورے علم کا بھی انسان احاطہ نہیں کرسکتا۔

329ب- كُرْسِيٌّ عرف عام میں وہ چیز ہے جس پر بیٹھا جاتا ہے۔مگر یہاں ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کرسی کے معنی علم کیے ہیں اور بعض نے مِلْكٌ ۔(غ) ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت بخاری میں ہے۔اس معنی پر ذیل کے اعتراض کیے گئے ہیں:

① اول لغت عرب میں كُرْسِيٌّ کے معنی علم نہیں آئے۔

جواب: کرسی کے مادہ کرس میں علم کا مفہوم پایا جاتا ہے بلکہ ابن جریر کہتے ہیں کہ کرسی کا اصل مفہوم علم ہے اس لیے ایسے صحیفہ کو جس میں علم کی بات لکھی ہوئی ہو كَرَّاسَةٌ کہا جاتا ہے اور ایسا ہی تَكَرَّسَ کے معنی عَلِمَ یعنی جان لیا پر ایک راجز کا قول نقل کیا ہے۔اسی وجہ سے علماء کو كَرَاسِيُّ (کرسی کی جمع) کہا جاتا ہے۔(ت) اور زمخشری نے قطرب سے یہ ضرب المثل نقل کی ہے:[خَيْرُ هٰذَا الْحَيْوَانِ الْأُنَاسِيَ وَخَيْرُ الْأُنَاسِيْ الْكُرَاسِيْ]۔(ت) یعنی حیوانوں میں سب سے بہتر انسان ہیں اور انسانوں میں سب سے بہتر علماء۔پس جب اصل معنی میں علم موجود ہے تو قرآن شریف کا اس لفظ کو صفات الٰہی میں استعمال کرنا بالکل درست ہے۔کیونکہ نئے مفہوم کو پرانے الفاظ میں ہی ادا کرنا تھا۔

② دوسرا اعتراض یہ ہے کہ کرسی بمعنی علم کی روایت صحیح نہیں اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے [مَوْضَعُ قَدَمَيْهِ] اس کے معنی ثابت ہیں۔

جواب: وہ معنی بلحاظ ظاہر ہیں اور نہ صرف بخاری اس روایت کو قبول کرتے ہیں بلکہ اور کئی ذرائع سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

③ تیسرا اعتراض یہ ہے کہ حدیث میں ہے:[مَا السَّمٰوَاتُ السَّبعُ وَالْأَرْضُوْنَ السَّبْعِ عِنْدَ الْكُرْسِيِّ إِلَّا كَحَلْقَةٍ مُلْقَاةٍ بِأَرْضِ فَلَاةٍ] (تفسیر ابن کثیر، جلد1، صفحہ 681) یعنی ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں کرسی کے سامنے ایسی ہیں جیسے ایک انگوٹھی بیابان میں۔

جواب: یہ حدیث کرسی بمعنی علم لے کر بھی ویسے ہی صحیح ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے علم کے سامنے آسمان اور زمین کیا حقیقت رکھتے ہیں۔خود قرآن شریف سے کرسی کے معنی علم ہی صحیح ثابت ہوتے ہیں۔اول سیاق وسباق میں علم کا ذکر ہے کیونکہ حفاظت بھی بذریعہ علم ہی ہے۔دوم قرآن کریم میں ایسے بیانات تو بکثرت ہیں کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اسی کا ہے یا اس کو وہ جانتا ہے۔مگر یہ نہیں آتا کہ جو کچھ کرسی میں ہے وہ اس کا ہے یا اس کو وہ جانتا ہے اور یہ تو بہرحال ظاہر ہے کہ جیسے خدا کا ہاتھ ہمارے ہاتھوں کی طرح نہیں۔اس کی کرسی بھی ہمارے بیٹھنے کی جگہوں کی طرح نہیں بلکہ جیسے کرسی اہل علم کے لیے ہوتی ہے اور اصل غرض اس پر بیٹھنے کی علم ہے۔بس وہی غرض یہاں مراد ہے۔[دیکھو نمبر: 27]۔

بوجھ نہیں اور وہ بہت بلند عظمت والا ہے۔(329ج)

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ

دین میں کوئی زبردستی (منوانا) نہیں۔ ہدایت (کی راہ) گمراہی سے واضح ہو چکی ہے۔(330) پس جو شخص شیطان

جو اونگھ اور نیند سے بالا ہے وہ بیٹھنے اور لیٹنے سے بھی غنی ہے۔[وَلَا كُرْسِيٌّ فِي الْحَقِيْقَةِ وَلَا قَاعِدَ]۔(ض) فی الحقیقت نہ کرسی ہے نہ بیٹھنے والا۔

329ج- ﴿يَـُٔوْدُهٗ﴾۔ اٰوْدٌ سے ہے جس کے معنی جدوجہد مشقت کو پہنچنا ہیں۔

یہ آیۃ کریمہ **آیت الکرسی** کے نام سے مشہور ہے اور حدیث میں اس کی بڑی عظمت مذکور ہے۔ ہر فرض نماز کے بعد اس کے پڑھنے کی تاکید ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ یہ سب سے زیادہ عظمت والی آیت ہے اور ایک میں ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ہے اور احمد، ابوداؤد و ترمذی کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت اور آل عمران کی پہلی آیت کو پڑھ کر فرمایا ان دونوں میں اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ہے اور ایک میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم سورہ بقرہ، آل عمران، طٰہٰ میں ہے اور تینوں میں یہی اسم اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ آئے ہیں جو اور کسی سورت میں نہیں آئے۔ اور یہ بھی ثابت ہے کہ جنگ بدر میں جب علیحدہ عریش بنا کر آنحضرت ﷺ دعا میں مصروف تھے تو آپ کی زبان پر یہی لفظ بار بار آتے تھے یَاحَیُّ یَاقَیُّوْمُ۔

پس اس آیت میں یہ اشارہ ہے کہ حی و قیوم خدا مسلمانوں کو کافروں کے ہاتھ سے تباہ ہونے سے بچائے گا اور انہیں ایک زندہ قوم بنائے گا۔ نیز اس میں مذاہب باطلہ کا رد ہے۔ پہلے اللہ تعالیٰ کی توحید کو بیان کیا، پھر اَلْحَیُّ میں بتایا کہ زندگی اس کی صفت ہے اور اس دنیا میں جو کچھ حیات یا زندگی ہم دیکھتے ہیں یہ اسی کی صفت الحی کا ظہور ہے۔ یہ رد ہے ان لوگوں کا جو مادہ اور روح کو غیر مخلوق مانتے ہیں، پھر یہ بتایا کہ اسے اونگھ نہیں آتی۔ عیسیٰ مسیح جس کو خدا بنایا جاتا ہے سوتے تھے۔ ایسا ہی شفاعت کے مسئلہ میں **افراط و تفریط کی غلطیوں کو دور کیا۔** جیسے مثلاً عیسائیوں نے تو ایسا دروازہ کھولا کہ جو مسیح کے کفارہ پر ایمان لایا جو چاہے کرے عیسیٰ مسیح اس کے شفیع بن جائیں گے۔ اس کے مقابل بعض لوگوں نے اللہ تعالیٰ کو ایسا قانون کے پنجہ میں جکڑا ہوا سمجھا شفاعت سے کلی انکار کر دیا۔ قرآن شریف نے بِاِذْنِہٖ کے ساتھ دونوں غلطیوں کو دور کیا کوئی شخص کسی پر ایمان لانے سے شفاعت کا حق دار نہیں ہو جاتا اور احادیث سے ثابت ہے کہ قیامت کے دن آنحضرت ﷺ سجدہ میں گر کر دعا کریں گے یہاں تک کہ آپ کو شفاعت کی اجازت دی جائے۔ پس جو لوگ یہاں نیکوں کی دعا کے قبول ہو جانے کو مانتے ہیں وہ شفاعت کا جو وہ بھی ایک دعا کا رنگ اپنے اندر رکھتی ہے انکار نہیں کر سکتے۔

330- اِکْرَاہٌ انسان سے ایسا بوجھ اٹھوانا جسے وہ پسند نہ کرتا ہو۔

الدِّیْنُ میں ''ال'' عہد کا ہے یا اضافت سے بدل ہے اور مراد دین اللہ ہے۔

وَ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ کا انکار کرتا ہے اور اللہ پر ایمان لاتا ہے اس نے ایک محکم

غَيِّ۔ غیٌّ وہ جہالت ہے جو اعتقاد فاسد سے پیدا ہو مگر مطلق جہل کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ (غ) اس کے خلاف رُشْدٌ ہے یعنی ہدایت۔ رُشْدٌ وَ غَيٌّ سے سے حق و باطل مراد ہیں۔

انصار میں بچہ کو بطور نذر یہودی بنانے کا دستور:

لکھا ہے کہ اہل مدینہ میں یہ دستور تھا کہ بعض عورتیں جب اولاد زندہ نہ رہے تو نذر مان لیتیں کہ بچہ کو اہل کتاب کے دین میں داخل کر دیں گے کیونکہ اس دین کو اپنے دین سے بہتر سمجھتے تھے۔ جب اسلام آیا تو انصار نے چاہا کہ جو اس طرح دین یہود میں داخل ہو گئے تھے ان کو اسلام میں داخل کریں تو یہ آیت نازل ہوئی جس میں اصول یہ بتایا کہ ایک دین سے دوسرے دین میں داخل ہونا اپنی خوشی کی بات ہے، جبر اس میں جائز نہیں۔ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ قبیلہ بنی سالم بن عوف میں سے ایک شخص کے دو بیٹے عیسائی تھے جب وہ مسلمان ہوا تو آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں انہیں اسلام میں داخل ہونے کے لیے مجبور نہ کروں؟ تب یہ آیت نازل ہوئی۔

آیت لَا اِكْرَاهَ منسوخ نہیں:

یہ الفاظ ایسے صاف اور اس قدر وسیع ہیں کہ دین اسلام پر بجبر پھیلایا جانے کے جس قدر اعتراضات ہیں ان سب کا ایک ہی جواب کافی ہے اور اس کو منسوخ کہنا محض ایک غلط خیال ہے زید یا بکر کے کہنے سے کوئی آیت منسوخ نہیں ہو سکتی۔ ہاں رسول اللہ ﷺ کا کوئی فرمان ہو تو تسلیم کر لیا جائے۔ اس کو آیت ﴿جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِيْنَ﴾ [التوبة: 73:9] ''کافروں اور منافقوں سے جہاد کر۔'' سے منسوخ قرار دینا اور بھی غلطی ہے۔ اس حکم کے ماتحت کسی ایک شخص کا نام بھی نہیں لیا جا سکتا جسے بجبر مسلمان کیا گیا ہو۔ اور ایسا حکم تو اس سے پیشتر مکہ میں نازل ہو چکا تھا ﴿جَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا﴾ [الفرقان: 52:25] ''اس (قرآن) کے ساتھ ان سے (وہ) جہاد کر (جو) بڑا جہاد (ہے)۔'' جب جَاهِدْ کا حکم اس کے دونوں طرف موجود ہے یعنی اس کے نزول سے پہلے بھی اور اس کے نزول کے بعد بھی تو اس کو منسوخ کہنا بالکل بے معنی بات ہے۔

حکم لَا اِكْرَاهَ اہل کتاب سے مقید نہیں:

ایسا ہی اس کے حکم کو اہل کتاب پر محدود کرنا بھی صریحاً خلاف قرآن ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ اس حکم کے ساتھ تو دلیل بھی موجود ہے۔ پھر حکم کو منسوخ یا محدود کرنا اس دلیل کو غلط قرار دینا ہے اور وہ دلیل یہ ہے کہ ہدایت کی راہ گمراہی سے متمیّز ہو چکی ہے اس لیے بہ جبر داخل کرنے کی ضرورت نہیں۔ اب حکم منسوخ تب ہو جب یہ تمیز دور ہو جائے جو بالبداہت باطل ہے کیونکہ ایسا کبھی ہو نہیں سکتا۔ بلکہ اس کو اہل کتاب سے مقید کرنا تو ایک طرف رہا میں کہتا ہوں جو دلیل دی ہے اس کی رو سے تو دعویٰ یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن شریف اپنے پیروؤں کو بھی بہ جبر کچھ نہیں منواتا۔ بلکہ جو چیز منواتا ہے اس کی دلیل بھی دیتا ہے کیونکہ وہ فرماتا ہے کہ ہدایت کی راہ واضح ہو چکی بہ جبر منوانے کی ضرورت ہی کوئی نہیں۔ سب مذاہب کچھ نہ کچھ حصہ انسان سے بہ جبر

الْوُثْقٰى ؕ لَا انْفِصَامَ لَهَا ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵۶﴾

جائے گرفت کو مضبوط پکڑ لیا جو ٹوٹنے والی نہیں اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔(331)

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا

اللہ ان لوگوں کا ولی ہے جو ایمان لائے، وہ ان کو سخت اندھیرے سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے اور جو کافر

منواتے ہیں جسے طبیعت قبول نہیں کرتی مگر اسلام کچھ بہ جبر نہیں منواتا۔ پس جبر کا کلی استیصال مذاہب میں سے اسلام نے ہی کیا ہے۔

331- الطَّاغُوْتُ۔ طَغٰی سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں حد سے گزر گیا ﴿لَمَّا طَغَا الْمَآءُ﴾ [الحآقة: 11:69] ''جب پانی حد سے بڑھنے لگا'' اور طغیان نافرمانی میں حد سے گزرنا ہے۔ طَاغُوْتٌ اس مادہ سے وزن فعلوت پر ہے اور اس سے مراد ہر ایک سرکش اور ہر معبود اللہ کے سوائے ہے واحد اور جمع میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ ساحر، کاہن، مارد، جن اور نیکی کے رستے سے پھیرنے والے کو طاغوت کہا جاتا ہے۔ (غ) یہاں طاغوت کے معنی شیطان حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں۔ بعض نے کاہن، بعض نے ساحر، بعض نے باطل معبود، بعض نے اصنام یعنی بت معنی لیے ہیں۔ فی الحقیقت غَیٌّ یا گمراہی کی طرف لے جانے والی سب چیزیں طاغوت کے مفہوم میں شامل ہیں۔

اِسْتَمْسَكَ۔ ایسی مضبوطی سے پکڑنا کہ اس پر ثبات کا قصد ہو۔

عُرْوَةٌ۔ اصل میں عُری سے ہے جس کے معنی ننگا ہونا ہیں۔ عَرَاءٌ وہ مکان جو بالکل کھلا ہو اور اس میں کسی قسم کا سترہ نہ ہو ﴿لَنُبْذَ بِالْعَرَآءِ﴾ [القلم: 49:68] ''کھلے میدان میں ڈال دیا جاتا'' اور عُرَاءٌ کے معنی جانب یا پہلو ہیں اور عُرْوَةٌ وہ چیز جو کسی کی جانب میں ہو اور جسے پکڑا جائے۔ (غ) اس لیے ڈول اور کوزہ کی جائے گرفت کو عروہ کہا جاتا ہے۔

اِنْفِصَامٌ۔ فَصَمَ سے ہے جس کے معنی توڑنا ہیں۔

یہاں کفر بالطاغوت اور ایمان باللہ کو اکٹھا بیان کیا ہے اور جس طرح کفر بالطاغوت سے مراد صرف یہی ہے کہ شیطان کی بات نہ مانے۔ ایمان باللہ سے مراد صرف یہی ہے کہ اللہ کے احکام کی تعمیل کرے جو شخص اس اصول صحیح پر قائم ہو جاتا ہے اس نے ایک مضبوط جائے گرفت کو پکڑا ہے جو ٹوٹتی نہیں یعنی اس کا عمل ضائع نہیں جاتا۔ جیسا کہ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا قول ہے: [لَا انْفِصَامَ لَهَا دُوْنَ الْجَنَّةِ] ایمان یا اسلام کو عروہ سے تشبیہ دی ہے اور اس کو زور سے پکڑنا یہ ہے کہ انسان پوری کوشش سے اس پر عمل کرے۔ مجاہد سے روایت ہے کہ ان الفاظ کو پڑھ کر آپ نے فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ﴾ [الرعد: 11:13] ''اللہ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک وہ اپنی حالت کو (نہ بدلیں)۔'' آج وہی عروہ وثقیٰ موجود ہے مگر اس پر مسلمانوں کی گرفت نہیں۔

اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵۷﴾ ع 34 4 2

ہیں ان کے ولی شیطان ہیں وہ انہیں روشنی سے نکال کر اندھیرے کی طرف لے جاتے ہیں۔ یہ آگ والے ہیں وہ اسی میں رہیں گے۔(332)

332- وَلِیٌّ۔ وَلَاءٌ اور تَوَالِیٌّ قرب کے لیے استعمال ہوتے ہیں خواہ مکان کے لحاظ سے ہو یا نسبت کے لحاظ سے یا دین کے یا صداقت کے یا نصرت کے یا اعتقاد کے اور وِلَایَۃٌ کے معنی نصرت اور وَلَایَۃٌ کے معنی تَوَلّٰی اَمْرٌ ہیں یا دونوں کے ایک ہی معنی ہیں یعنی تَوَلّٰی اَمْرًا یعنی کسی معاملہ کا متولی ہونا اور ولی اور مولیٰ دونوں فاعل کے معنی میں بھی آتے ہیں اور مفعول کے بھی یعنی بمعنی مُوَالِیْ۔ ولایت کرنے والا۔ یا موالی جس کی ولایت کی گئی ہو۔ اور اللہ تعالیٰ (بمعنی مُوَالِیْ) بندہ کا ولی بھی کہلاتا ہے اور مولیٰ بھی اور بندہ کو بھی خدا کا ولی کہا جاتا ہے (بمعنی موالی) مگر مولیٰ نہیں کہا جاتا۔ (غ) اور چونکہ ولاء کے اصل معنی شدید تعلق قرب ہیں [لَیْسَ بَیْنَهُمَا مَا لَیْسَ مِنْهُمَا]۔ (غ) اس لیے اللہ کا بندہ کا ولی ہونا یا بندہ کا اللہ کا ولی ہونا اسی شدید قرب پر دلالت کرتا ہے اور دونوں میں نصرت دینے یا نصرت دیا جانے کے معنی بھی شامل ہیں اور وَلِیٌّ کے معنی محب بھی ہیں اور صدیق بھی اور نصیر بھی۔ (ت) گویا ولی میں قرب اور محبت اور صداقت کا تعلق ہے جس کے ساتھ نصرت ملی ہوئی ہو۔ اس لیے قرآن کریم میں مومنوں کو مومنوں کے ولی کہا گیا ہے اور منافقوں کو منافقوں کے اور کفار کا ولی شیطان کو کہا گیا ہے۔ جیسے یہاں بھی ہے: ﴿اَوْلِیٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ﴾ (اولیاء ولی کی جمع ہے) اور قیامت میں کفار کی ایک دوسرے سے ولایت اور شیطان کی مولاۃ کو منقطع قرار دیا ہے جیسے فرمایا: ﴿یَوْمَ لَا یُغْنِیْ مَوْلًی عَنْ مَّوْلًی شَیْئًا﴾ [الدخان: 41:44] ''جس دن کوئی دوست کسی دوست کے کچھ کام نہ آئے گا۔''

اللہ کی ولایت مومنوں سے کیا ہے:

اللہ کا مومنوں سے تعلق ہے وہ ان کا ولی ہے اور اس کی ولایت یہ ہے کہ جب ایک شخص عملی رنگ میں ایمان لاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو کفر، شرک، معاصی، گندے رسم و رواج، فاسد اعتقادات، جہالت غرض ہر قسم کی تاریکی سے نکال روشنی میں لے آتا ہے۔ پس سچے ایمان کی یہ علامت ہے کہ انسان تاریکی سے باہر نکل آئے۔ کافر جو نیکی کی طرف قدم اٹھانے سے انکار کرتا ہے اس کا تعلق روز بروز ظلمت سے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ایک بدی سے دوسری بدی کی طرف قدم اٹھاتا ہے اور ایک نیکی سے دوسری نیکی کی طرف۔

یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ **قرآن شریف نے ہمیشہ نور کو واحد میں استعمال کیا ہے اور ظلمات کو جمع میں**۔ کیونکہ نور یعنی حق ایک ہی ہے اور ظلمات یعنی باطل بہت سے ہیں۔ نور کے کمال کو ظاہر کرنے کے لیے بھی ﴿نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ﴾ [النور: 35:24] ''روشنی پر روشنی ہے۔'' فرمایا اور اسی کے مطابق ہے: ﴿وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ﴾ [الأنعام: 153:6] ''اور یہ یہ میرا راستہ سیدھا ہے سو اس کی پیروی کرو اور (دوسرے) راستوں کی پیروی نہ کرو۔'' خدا کی طرف لے جانے والا

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِیْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَ اُمِیْتُ ؕ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۚ﴿۲۵۸﴾

وقف لازم

کیا تو نے اس (کی حالت) پر غور نہیں کیا جس نے ابراہیم سے اس کے رب کے بارے میں جھگڑا کیا؟ اس لیے کہ اللہ نے اسے ملک دیا۔ جب ابراہیم نے کہا میرا رب وہ ہے جو زندگی بخشتا اور مارتا ہے۔ اس نے کہا میں بھی زندگی دیتا ہوں اور مارتا ہوں۔ اور ابراہیم نے کہا کہ اللہ تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو تُو اسے مغرب سے نکال۔ پھر وہ جو کافر تھا حیران رہ گیا۔ اور اللہ ظالم لوگوں کو راہ نہیں دکھاتا۔(333)

رستہ ایک ہی ہے، اس سے دور لے جانے والے بہت ہیں۔

333- بُہِتَ کے معنی ہیں دہشت زدہ اور متحیر رہ گیا۔ بہتان ایسا جھوٹ جو سننے والے کو متحیر کر دے۔ (غ) بخاری میں ہے: [بُهِتَ ذَهَبَتْ حُجَّتُهُ] (صحیح البخاري، التفسیر، باب: قوله تعالى فإن خفتم ...الخ) یعنی اس کو کوئی دلیل نہ سوجھی یا دلیل میں ہار گیا۔

﴿لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ﴾ قرآن کریم میں بار بار آتا ہے کہ اللہ ظالموں یا کافروں کو ہدایت نہیں کرتا۔ حالانکہ قرآن کریم کو هُدًى لِلنَّاسِ بھی فرمایا ہے۔ امام راغب کہتے ہیں کہ ہدایت اور تعلیم دو چیزوں کو چاہتی ہے۔ ہدایت یا تعلیم دینے والے کی طرف سے اس کا دے دینا، اور جس کو ہدایت یا تعلیم دی جاتی ہے اس کا اس کو حاصل کر لینا۔ دونوں باتوں سے ہدایت اور تعلیم کامل ہوتی ہے۔ پس جب ہدایت یا تعلیم دینے والے نے اپنا کام کر دیا ہو اور جس کو ہدایت یا تعلیم پہنچائی گئی ہے اس نے اسے قبول نہ کیا ہو تو نہ قبول کرنے کے لحاظ سے کہا جائے گا کہ اس نے ہدایت اور تعلیم نہیں دی۔ (غ) کیونکہ وہ کام اپنے کمال کو نہیں پہنچا۔ مگر یہاں ہدایت سے مراد صحیح دلیل کا نہ ملنا ہے۔ (ت)

اس رکوع میں تین آیتیں ہیں اور تینوں میں کسی نہ کسی رنگ میں احیائے موتی کا ذکر ہے۔ گو باقی باتیں مختلف ہوں۔ پس اس رکوع کا اصل منشا احیائے موتی پر روشنی ڈالنا ہے اس سے پہلے رکوع میں مسلمانوں کو بشارت دی گئی تھی کہ وہ انہیں ایک زندہ قوم بنائے گا۔ اب تین مثالوں سے سمجھایا ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کیا کرتا ہے؟

حضرت ابراہیمؑ کا بادشاہ سے جھگڑا:

پہلی مثال حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایک شخص کے ساتھ جھگڑا ہوتا ہے بظاہر وہ کوئی بادشاہ ہے جیسا کہ

اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَةٍ وَّ هِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰی عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰی یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰی طَعَامِكَ وَ شَرَابِكَ لَمْ یَتَسَنَّهْ ۚ وَ انْظُرْ اِلٰی حِمَارِكَ وَ لِنَجْعَلَكَ اٰیَةً لِّلنَّاسِ وَ انْظُرْ

یا اُس کی مثال پر غور نہیں کیا جو ایک بستی پر گزرا اور وہ ویران تھی، اس کی عمارتیں گری ہوئی تھیں۔ اس نے کہا اللہ اسے اس کی موت کے بعد کب زندہ کرے گا؟ سو اللہ نے اسے ایک سو سال موت کی حالت میں رکھا پھر اسے اٹھایا، کہا تو کتنا ٹھہرا؟ اس نے کہا میں ایک دن یا دن کا کوئی حصہ ٹھہرا ہوں۔ کہا بلکہ تو سو سال ٹھہرا۔ پس تو اپنے کھانے اور پانی کو دیکھ وہ نہیں سڑا اور اپنے گدھے کو دیکھ اور تاکہ ہم تجھے لوگوں کے لیے نشان بنائیں اور

اس کے اس قول سے ظاہر ہوتا ہے ﴿اَنَا اُحْیٖ وَ اُمِیْتُ﴾۔ مگر ﴿اَنَّ اللّٰهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ﴾ میں ضمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف جاتی ہے اور مراد وہ وعدہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیا تھا کہ زمین مقدس کا وارث آپ کو بنایا جائے گا اور ہمیشہ کے لیے آپ کی نسل میں رہے گی۔ اسی پر جھگڑا ہے۔ ایک مادہ پرست انسان جس کے سر میں حکومت کا نشہ ہے کہتا ہے یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ یہ طاقتور قومیں جو اس وقت اس سرزمین کی مالک ہیں نابود ہو جائیں اور تمہاری نسل سے ایک زبردست قوم پیدا ہو جائے۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں کہ وہ جو میرا رب ہے وہی قوموں کو زندہ کرتا ہے اور وہی مارتا ہے۔ یہ میری طاقت کی بات بے شک نہیں مگر اللہ تعالیٰ کا یہی قانون ہے کہ آج ایک قوم طاقتور ہے تو کل اس کو تباہ کر کے دوسری اس کی جگہ لے آتا ہے۔ اس کا جواب اس بادشاہ کی طرف سے یہ ہے کہ میں بھی تو بڑا صاحب اقتدار ہوں میں خود جس کو چاہوں زندہ رکھوں جس کو چاہوں ماروں، جس زمین کو چاہوں آباد کروں جس کو چاہوں ویران کر دوں۔ تو میری طاقت بھی خدا کے برابر ہوئی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر تمہاری طاقت خدا کے برابر ہے تو پھر خدا تو اپنے قانون کے مطابق سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تم مغرب سے نکال کر دکھاؤ۔ جس پر وہ کافر بادشاہ مبہوت رہ گیا اور کوئی بات نہ سوجھی۔ ویسے بھی عموماً بت پرست قوموں میں بادشاہ کو خدا کا اوتار سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام اس سے مطالبہ کرتے ہیں کہ اگر تم میں خدائی طاقتیں ہیں تو پھر خدا کے قانون کو ادل بدل کر کے دکھاؤ۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ جواب کیوں نہ دیا کہ تمہارا خدا اس کو مغرب سے نکال کر دکھائے تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تو یہ دعویٰ نہ تھا کہ وہ اپنے خدا سے جو چاہیں کرا سکتے ہیں بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کے اٹل قانونوں کی طرف ہی توجہ دلا رہے ہیں۔ انہی قانونوں میں سے ایک قانون قوموں کے گرنے اور بننے کا ہے جس کا ایک متکبر بادشاہ انکار کر رہا ہے۔

اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۵۹﴾

ہڈیوں کو بھی دیکھ۔ ہم انہیں کیونکر اٹھاتے ہیں پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں۔(334) پس جب اس کے لیے بات کھل گئی تو اس نے کہا میں جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔(334)

334- كَالَّذِيْ۔ کسائی اور فراء اور اکثر نحویوں نے اَلَّذِيْ کے پہلے كَ کو اسمیہ بمعنی مثل قرار دیا ہے۔ گویا عبارت یوں ہے:[أَوْ رَأَيْتَ مَثَلَ الَّذِيْ مَرَّ]۔(ر) کیا تو نے اس شخص کی مثال پر غور کیا۔

خَاوِيَةٌ۔ خَوَاءٌ اصل میں خالی ہونے کو کہتے ہیں۔(غ)[خَوَتِ الدَّارِ] کے معنی ہیں گھر میں کوئی رہنے والا نہ رہا۔(ل) بخاری میں ہے:[خَاوِيَةٌ لَآ أَنِيسَ فِيهَا] (صحيح البخاري، التفسير، باب: قوله تعالىٰ فإن خفتم ...الخ)۔

﴿عَلٰى عُرُوْشِهَا﴾ عُرُوْش۔ عَرْشٌ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں چھتی ہوئی چیز اور یہاں بخاری نے معنی کیے ہیں اَبْنِيَتُهَا یعنی اس کی عمارتیں۔ پس ﴿عَلٰى عُرُوْشِهَا﴾ سے مراد اس کی عمارتیں گری ہوئی تھیں۔

﴿فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ﴾ یعنی سو سال تک ایک حالت میں رکھا جس کو موت کی حالت سے تعبیر کیا ہے۔

يَتَسَنَّهْ۔ سَنَةَ سے ہے اور سَنَةٌ سال کو کہتے ہیں۔[سَنَهَتِ النَّخْلَةُ] یا تَسَنَّهَتْ کے معنی ہیں اس پر سال گزر گئے اور یہی معنی [سَنَهُ الطَّعَامِ وَتَسَنَّهَ] کے ہیں۔(ل) مگر چونکہ کھانے پینے پر ایک مدت گزر جانے سے وہ بُس جاتا ہے اس لیے طعام یا شراب پر جب تَسَنَّهَ بولا جاتا ہے تو اس کے معنی لیے جاتے ہیں اس میں تغیر واقع ہو گیا یا سڑ گیا۔ اور فراء نے لَمْ يَتَسَنَّهْ کے معنی کیے ہیں:[لَمْ يَتَغَيَّرْ بِمُرُوْرِ السِّنِيْنَ عَلَيْهِ.] یعنی سالوں کے گزرنے کی وجہ سے اس میں تغیر پیدا نہیں ہوا۔

نُنْشِزُ۔ نَشَزَ کے اصل معنی بلند زمین ہیں پھر بلند زمین کی طرف اٹھ کر جانے پر بھی استعمال ہوا ہے اس لیے محض اٹھنے پر بھی۔ ﴿وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا﴾[المجادلة: 11:58] ''اور جب کہا جائے اٹھ جاؤ تو اٹھ جایا کرو۔'' اور اسی سے نشوز ہے جو میاں بی بی کے جھگڑے پر بولا جاتا ہے اور اِنْشَازٌ کے معنی مردہ کا زندہ کرنا بھی ہیں۔

نَكْسُوْ۔ كِسَاءٌ سے ہے جس کے معنی لباس ہیں۔ كِسْوَةٌ بمعنی لباس قرآن شریف میں آیا ہے ﴿اَوْ كِسْوَتُهُمْ﴾[المآئدة: 89:5] ''یا ان کو لباس دینا''، ﴿فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا﴾[المؤمنون: 14:23] ''اور ہڈیوں پر گوشت چڑھایا'' میں انسان کی پیدائش کے ذکر میں یہی لفظ استعمال ہوا ہے۔

334(- یہ دوسری مثال احیائے موتی کی ہے جو مسلمانوں کو بطور تشفی دی گئی ہے۔ گویا سمجھایا ہے کہ اگر کبھی تم پر موت بھی آجائے تو اللہ

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰى ؕ قَالَ اَوَ لَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰى وَ لٰكِنْ لِّیَطْمَىٕنَّ قَلْبِیْ ؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً

اور جب ابراہیم نے کہا اے میرے رب! مجھے دکھا تو کس طرح مردوں کو زندہ کرتا ہے۔ کہا کیا تو نے نہیں مانا؟ کہا ہاں مگر اس لیے کہ میرے دل کو اطمینان حاصل ہو۔ کہا تو

تعالیٰ پھر تم کو زندہ کرے گا۔ كَالَّذِیْ سے صاف ثابت ہے کہ یہ مثالی واقعہ ہے گویا معنی یوں ہوئے کیا تو نے اس شخص کی مثال یعنی اس کی مثالی حالت پر غور نہیں کیا۔ پس یہاں کسی ایسے واقعہ کی طرف اشارہ ہے جو ایک شخص کو عالم مثال یا عالم رؤیا میں پیش آیا ہے۔ جب ہم واقعات کو دیکھتے ہیں جن کا ذکر الفاظ قرآنی میں پایا جاتا ہے تو اس کو بالکل حزقیل کی اس رؤیا کے مطابق پاتے ہیں جس میں ان کو بتایا گیا تھا کہ یروشلم سو سال کی تباہی کے بعد پھر آباد ہوگا۔ اور یہ بخت النصر کے یروشلم کو تباہ کرنے کے بعد کا واقعہ ہے۔ بائبل میں اس رؤیا کا ذکر حزقیل چھتیسویں باب کے آخر اور سینتیسویں باب میں الفاظ ذیل میں ہے:

''خداوند کا ہاتھ مجھ پر تھا اور اس نے مجھے خداوند کی روح میں اٹھالیا اور اس وادی میں جو ہڈیوں سے بھرپور تھی مجھے اتار دیا۔۔۔۔ اس نے مجھے کہا اے آدم زاد کیا یہ ہڈیاں جی سکتی ہیں؟ میں نے جواب میں کہا اے خداوند یہوداہ تو ہی جانتا ہے۔ پھر اس نے مجھے کہا کہ تو ان ہڈیوں کے اوپر نبوت کر اور ان سے کہہ کہ اے سوکھی ہڈیو تم خداوند کا کلام سنو۔ خداوند یہوداہ ان ہڈیوں کو یوں فرماتا ہے کہ دیکھو تمہارے اندر میں روح داخل کروں گا اور تم جیو گے اور تم پر نسیں بٹھلاؤں گا اور گوشت چڑھاؤں گا اور تمہیں چمڑے سے مڑھوں گا اور تم میں روح ڈالوں گا اور تم جیو گے اور جانو گے کہ میں خداوند ہوں۔ سو میں نے حکم کے بموجب نبوت کی اور جب میں نبوت کرتا تھا تو ایک شور ہوا اور دیکھ ایک جنبش اور ہڈیاں آپس میں مل گئیں ہر ایک ہڈی اپنی ہڈی سے اور جو میں نے نگاہ کی تو دیکھ نسیں اور گوشت ان پر چڑھ آئے اور چمڑے کی ان پر پوشش ہوگئی پر ان میں روح نہ تھی۔۔۔ اور ان میں روح آئی اور وے جی اٹھے۔۔۔ تب اس نے مجھے کہا کہ اے آدم زاد! یہ ہڈیاں سارے اسرائیل ہیں۔ دیکھ یہ کہتے ہیں کہ ہماری ہڈیاں سوکھ گئیں اور ہماری امید جاتی رہی ہم تو بالکل فنا ہو گئے اس لیے تو نبوت کر اور ان سے کہو کہ خداوند یہوداہ یوں کہتا ہے کہ دیکھ اے میرے لوگ میں تمہاری قبروں کو کھولوں گا اور تمہیں تمہاری قبروں سے باہر نکالوں گا اور اسرائیل کے سرزمین میں لاؤں گا۔''

حزقیل کے مکاشفہ کا ذکر قرآن کریم + میں:

اس سے ظاہر ہے کہ بائبل حضرت حزقیل کے ایک کشف کا ذکر کرتی ہے جس کی ابتدا یہ ہے کہ وہ ایک ہڈیوں سے بھری ہوئی وادی میں بحالت کشف گزرے گویا وہ ایک ویران بستی تھی جیسا کہ قرآن شریف نے فرمایا اور بائبل میں بھی سوال ہے اے آدم زاد کیا یہ ہڈیاں جی سکتی ہیں؟ قرآن شریف میں بھی ہے: ﴿اَنّٰى یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ اور کشف میں ان کو دکھایا گیا کہ کس طرح ہڈیوں کو اٹھایا جاتا اور ان پر گوشت چڑھایا جاتا ہے۔ جس کو قرآن شریف نے ﴿كَیْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا

مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ

کہا تو چار پرندلے پھر انہیں اپنے ساتھ ہلالے۔ پھر ان میں سے ایک ایک حصہ ہر ایک پہاڑ پر رکھ دے، پھر ان

لَحْمًا﴾ میں بیان فرمایا۔ اور بائبل میں ہے کہ یہ ہڈیاں بنی اسرائیل ہیں۔ قرآن شریف میں بھی ہے ﴿وَ لِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ﴾ اور الناس سے مراد یہاں انہی کی قوم بنی اسرائیل ہے۔ پس یہ مطابقت صاف بتاتی ہے کہ دونوں جگہ ایک ہی واقعہ کا ذکر ہے اور وہ واقعہ عالم مثال کا ہے جسے بائبل نے ان الفاظ میں ظاہر کیا کہ خداوند کی روح مجھ پر تھی۔ اور قرآن شریف نے ایک ''ك'' سے اس واقعہ کے مثالی ہونے کی طرف اشارہ کر دیا۔ ہاں قرآن شریف میں کچھ امر زائد ہے اور وہ ہے حالت موت کا سو سال رہنا۔ سو یہاں بائبل کی کمی کو بھی پورا کر دیا ہے۔

یروشلم کے لیے پیشگوئی: اور ایک پیشگوئی بھی کی ہے کیونکہ امر واقع یہ ہے کہ بنی اسرائیل پر وہ مردہ ہونے کی حالت ایک سو سال رہی تھی۔ گو بائبل میں اس کا ذکر نہیں۔ بخت النصر نے 613 قبل مسیح میں یروشلم پر چڑھائی کر کے اس کو فتح کیا اور 536 قبل مسیح میں بابلیوں کی تباہی کے بعد خورس شاہ ایران نے یہودیوں کو واپس آ کر آباد ہونے کی اجازت دی اور 520 قبل مسیح تک یہ دوبارہ آباد ہوتا رہا۔ گویا یہ 93 یا قریباً ایک سو سال کا زمانہ موت کا گزرا اور پیشگوئی یہ تھی کہ قریباً بالکل اسی قدر زمانہ یروشلم پر وہ گزرا جب عیسائیوں نے صلیبی جنگوں میں اسے مسلمانوں کے ہاتھ سے لے لیا تھا اور پھر دوبارہ مسلمانوں کے ہاتھ میں اس کا آنا اس کی زندگی تھی اور شاید انہی واقعات کا اب پھر اعادہ ہونے والا ہے۔ یا خدا چاہے تو مسلمانوں کو اب یروشلم پھر جلد دوبارہ دلا دے۔ قرآن شریف کا اس سو سال کے واقعہ کا ذکر کرنا اور بائبل میں اس کا ذکر نہ ہونا مگر تاریخی واقعات سے اس کا صحیح ثابت ہونا اور پھر پیشگوئی کے طور پر بھی اس کا ٹھیک صادق آنا ایسا باریک علم غیب ظاہر کرتا ہے جو عرب کے ایک امی کو تو کیا کسی انسان کو بھی حاصل نہ ہو سکتا تھا۔

قبل اس کے کہ میں کچھ اور الفاظ کی تشریح کروں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ تفاسیر کے مختلف اقوال میں جو اس آیت کے متعلق ہیں عکرمہ اور ربیع اور وہب نے کہا ہے کہ یہ بیت المقدس کا ذکر ہے جس کو بخت النصر نے برباد کر دیا تھا اور روح المعانی میں ہے کہ یہ قول سب سے زیادہ مشہور ہے۔ پس یوں سلف کی شہادت بھی اسی پر ہے۔

رؤیا میں سو سال کی موت کیوں دکھائی گئی:

قابل تشریح یہ امر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے پوچھا تو کتنا ٹھہرا تو جواب میں نبی کہتا ہے دن یا دن کا کچھ حصہ اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے بلکہ تو سو سال ہی ٹھہرا۔ سو بلحاظ رؤیا کے تو دن کا کچھ حصہ ہی گزرا تھا اور اللہ تعالیٰ نے جو فرمایا کہ سو سال تو ٹھہرا ہے تو یہ اس حقیقت کے اظہار کے لیے تھا کہ اصل غرض تم کو یہ سو سال کی موت کا رؤیا دکھانے کی یہی ہے کہ تمہاری قوم پر موت سو سال تک رہے گی۔ سو چونکہ تم اپنی قوم کے قائم مقام ہو اس لیے حالت بعثت یا حالت موت فی الحقیقت سو سال ہی ہے۔ ہاں تم کو ہم نے یہ نقشہ ایک رؤیا میں دکھایا ہے۔ سو دیکھ لو تمہارا کھانا پینا سب اسی طرح موجود ہے اور تمہارا گدھا بھی اسی طرح زندہ موجود ہے

يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا ؕ وَ اعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۶۰﴾ ع 35 3 3

کو بلاؤ تیرے پاس دوڑتے ہوئے آجائیں گے، اور جان لے کہ اللہ غالب حکمت والا ہے۔ (335)

(قرآن کریم نے کہیں نہیں فرمایا کہ گدھا مردہ تھا اس کی ہڈیوں پر گوشت چڑھایا تھا۔ بلکہ صاف فرمایا کہ اپنے کھانے پینے کو دیکھ لو اور اپنے گدھے کو دیکھ لو۔) اس میں یہ اشارہ تھا کہ جس طرح تمہارے یہ کھانے پینے کے سامان اور تمہاری سواری کا سامان اصلی موجود ہے۔ اسی طرح پر تمہاری قوم پھر اصلی حالت پر آجائے گی اور اپنے اصل وطن میں آباد ہو جائے گی۔ اور سو سال کو ایک دن میں گزار دینا اس میں یہ اشارہ تھا کہ وعدہ ابراہیمی کے اس کو خلاف نہ سمجھا جائے کہ یروشلم تمہارے ہاتھ میں نہیں۔ سو سال خدا کے ہاں ایک دن کی طرح ہے۔

335- صُرَّ۔ باب صَارَ یَصُوْرُ مادہ صَوْرٌ سے ہے جس کے معنی اَلْمَیْلُ یعنی مائل ہونا ہیں۔ (غ۔ل) خود اس آیت میں فَصُرْهُنَّ کی تفسیر وَجِّهْهُنَّ سے کی ہے۔ (ل) یعنی ان کو اپنی طرف متوجہ کر۔ اور زجاج کا قول نقل کیا ہے کہ اہل لغت کے نزدیک فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ کے معنی [أَمِلْهُنَّ وَ أَجْمِعْهُنَّ اِلَيْكَ] ہیں (ل) ان کو مائل کر اور اپنی طرف اکٹھا کر اور یہ جو معنی منقول ہیں کہ [صِرْتُ الشَّيْءَ، قَطَعْتُهُ فَصَلْتُهُ] یعنی میں نے اس کو قطع کر دیا اور اس کا فیصلہ کر دیا۔ جس کی سند میں شعر پیش کیا ہے [صِرْنَا بِهِ الْحُكْمَ] تو اس قطع کرنے سے مراد قیمہ کرنا نہیں بلکہ فیصلہ کے طور پر کسی بات کا قطع کرنا ہے اور دوسرے صُرْ کا صلہ جب اِلیٰ ہو جیسے یہاں قرآن شریف میں ہے تو اس کے معنی قطع نہ موزوں ہیں اور نہ ہی لغت میں آئے ہیں۔ بلکہ اس صلہ کے ساتھ معنی صرف مائل کرنا ہی ہیں۔ مگر مفسرین کے خیال میں چونکہ یہ سمایا ہوا ہے کہ یہاں مراد قیمہ کرنا ہی ہے اس لیے یا تو فَصُرْهُنَّ کے بعد فَقَطِّعْهُنَّ محذوف فرض کرتے ہیں گویا مطلب یہ ہوا کہ پہلے ان کو ہلا لے پھر ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے اور یہ آخری حصہ اپنی طرف سے فرض کیا ہے اور یا صلہ الیٰ کی تقدیم و تاخیر کر لی ہے۔ یعنی عبارت یوں بناتے ہیں: ﴿فَخُذْ اِلَيْكَ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ﴾ (ل) مگر یہ بالبداہت غلط ہے کیونکہ اس طرح ایک فعل کا صلہ دوسرے فعل کی طرف منتقل کرنے سے امن اٹھ جاتا ہے۔ راغب نے صُرْ کے ایک معنی صح بھی کیے ہیں یعنی ان کو آواز دو مگر اس سے مراد بھی وہی ہے۔ بیضاوی نے صرف یہی معنی قبول کیے ہیں۔ [فَاَمِلْهُنَّ وَاضْمُمْهُنَّ] یعنی ان کو مائل کر اور ان کو ہلا لے مگر پھر جَزِّئْهُنَّ محذوف مانا ہے یعنی ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر۔

جُزْءًا۔ جُزْءٌ کسی شے کا حصہ ہے۔ چار پرندوں کی جزو یہی نہیں کہ سب کو قیمہ کیا جائے اور پھر ملایا جائے اور پھر حصہ لیا جائے۔ بلکہ چاروں میں سے ہر ایک۔ چار کا جز ہے۔ قرآن شریف میں ہے: ﴿لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ﴾ [الحجر: 44:15] ''ہر ایک دروازے کے لیے ان میں سے ایک حصہ الگ کر دیا گیا ہے۔'' اس کے یہ معنی نہیں کہ سب لوگوں کو اکٹھا کر کے ان کا قیمہ کر کے پھر حصے بنائے جائیں گے۔ بلکہ کل لوگوں میں سے چند لوگ ان کا ایک جز ہیں۔

یہ تیسری آیت ہے جس میں احیائے موتیٰ کا ذکر ہے۔ پہلی آیت میں احیائے موتیٰ کا دعویٰ ہے۔ دوسری میں ایک نظیر احیائے

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَ اللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ

ان لوگوں کی مثال جو اپنے مالوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ایک دانہ کی مثال ہے جو سات بالیں اگائے۔ ہر ایک بال میں سو دانے ہوں، اور اللہ جس کے لیے چاہتا ہے کئی گنا کر کے دیتا ہے

موتی کی تاریخ بنی اسرائیل سے پیش کی ہے اور اب **تیسری میں کیفیت احیائے موتی** کا بیان کیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایمان تو اس وعدہ الٰہی پر تھا وہ اطمینان قلب کے لیے اس کی کیفیت کا سوال کرتے ہیں۔ یہاں شک کوئی نہیں کیونکہ شک ایمان کے منافی ہے۔ ایک کام کو ہم ہوتا ہوا دیکھتے ہیں اس کو صحیح مانتے ہیں۔ نطفہ سے انسان بنتا ہے۔ بیج سے درخت بنتا ہے۔ مگر کیفیت سے ناواقف ہیں کہ یہ کیونکر ہو جاتا ہے۔ پس واقعہ میں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو شک نہیں کہ احیائے موتی ہو جائے گا۔ وہ مانتے ہیں بلکہ ابھی ایک کافر بادشاہ سے بحث کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ احیائے موتی کیا کرتا ہے۔ اب صرف وہ کیفیت احیائے موتی کا سوال کرتے ہیں۔

مُردے کس طرح زندہ ہوتے ہیں:

اس کیفیت کو سمجھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک مثال دی ہے۔ چار جانوروں کو لو اور ان کو ہلا لو پھر چار مختلف سمتوں میں ان کو ایک ایک کر کے رکھ دو۔ پھر بلاؤ اور دیکھو کہ کس طرح تمہاری آواز پر بھاگے چلے آتے ہیں۔ اس مثال سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سمجھ میں آ گیا۔ یعنی کیفیت کا پتہ لگ گیا کہ باوجود یہ کہ ایک پرند انسان سے بہت دور رہنے والی اور بھاگنے والی چیز ہے لیکن انسان جب اسے ہلالے تو یہاں تک اسے اپنے حکم کے تابع کر سکتا ہے کہ اس کی آواز پر وہ اُڑا چلا آتا ہے۔ تو جب انسان میں اور اس کی ہلائی ہوئی چیز میں ایسا شدید تعلق محض ایک عارضی تدبیر سے پیدا ہو جاتا، تو اللہ تعالیٰ کا تصرف جو خالق و مالک ہے کیوں اس سے بڑھ کر نہ ہو۔ ایک مردہ قوم کس طرح زندہ ہو جاتی ہے۔ اس کی زندگی کے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ بھلائی کے کام جو ان کی فلاح کا موجب ہوں ان کو کرنے کی توفیق مل جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ جس قوم کو زندہ کرنا چاہتا ہے اس کی زندگی کے اسباب جمع کر دیتا ہے کیونکہ وہی خالق اسباب ہے اس کے تصرف میں سب چیزیں موجود ہیں۔ خود لفظ طَيْرٌ کے استعمال میں نیک و بد اعمال کی طرف اشارہ ہے کیونکہ لفظ طَائِرٌ نیک و بد اعمال پر استعمال ہوا ہے۔ ﴿وَ كُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓىِٕرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ﴾ [بني إسرائيل: 13:17] ''اور ہر انسان کے عملوں کو ہم نے اس کی گردن میں ڈالا ہے۔'' جہاں طَائِرٌ کے معنی ہی اعمال ہیں۔ اور چونکہ اس مثال سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اصل کیفیت معلوم ہو جاتی ہے اس لیے ان کو یہ ضرورت بھی پیش نہیں آتی کہ وہ ایسا کر کے بھی دیکھیں اور نہ ان کے قرآن شریف میں ایسا کرنے کا ذکر ہے۔ کیونکہ یہ ایک مثال برنگ دلیل تھی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام جانتے تھے کہ ایسا ہوتا رہتا ہے۔ اور اگر اس کو وہی واقعہ سمجھا جائے جو مفسرین بیان کرتے ہیں تو اس سے کئی وساوس پیدا ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس صورت میں یہ معلوم ہوگا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو واقعی شک تھا کہ اللہ

وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٦١﴾ اور اللہ کشائش والا جاننے والا ہے۔(336)

تعالیٰ مردوں کو بھی زندہ کرسکتا ہے۔ جب تک چار مردہ جانوروں کو زندہ ہوتے نہیں دیکھ لیا ان کو یہ یقین نہ آیا جو ایمان کے منافی ہے اور بایں ایک واقعہ کو ہوتا دیکھ کر اس کی کیفیت کا پتہ نہیں لگتا۔ ہم ہر روز درخت سے بیج اور نطفہ سے انسان بنتا دیکھتے ہیں مگر یہ نہیں جانتے کہ کس طرح ایسا ہوتا ہے؟ پس ﴿كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى﴾ کا یہ جواب کوئی نہیں کہ مردہ جانوروں کو پھر زندہ ہوتے دیکھ لیا۔ كَيْفَ کا جواب صرف وہی دلیل ہوسکتی ہے جو قلب کو مطمئن کر دیتی ہے کہ فی الواقع عالم میں ایسا ہی ہو رہا ہے۔ اور مزید برآں اس اطمینان قلب کی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حاصل ہو گیا کیا ہم کو ضرورت نہیں۔ اگر تو ان کو اطمینان یوں ہوا تھا کہ ان کے سامنے چار مردہ جانور زندہ ہو گئے تو ہم کو یہ اطمینان کبھی میسر آ سکتا ہی نہیں اور اگر وہ دلیل ان کے لیے موجب اطمینان ہوئی تھی تو ہمارے لیے بھی وہی دلیل کام دے سکتی ہے اور سکون و اطمینان کا موجب ہوسکتی ہے۔ **بخاری میں جو حدیث اس آیت کی تفسیر کے رنگ میں مروی ہے وہ اس بات کا فیصلہ کرتی ہے کہ یہ ایک دلیل ہے کوئی واقعہ نہیں۔** اس حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: [نَحْنُ أَحَقُّ بِالشَّكِّ مِنْ إِبْرَاهِيمَ إِذْ قَالَ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى] (صحيح البخاري، كتاب التفسير، باب (وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتَى): 4537) ''ہم ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ شک کے حق دار ہیں جب اس نے کہا اے میرے رب مجھے دکھا کہ تو کس طرح مردے زندہ کرتا ہے۔'' یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو شک پیدا ہوا ہوتا تو ہم کو اس سے بھی زیادہ ہونا چاہیے تھا۔ بالفاظ دیگر جس اطمینان قلب کی ضرورت حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تھی اس کی ہم کو بھی ہے۔ اس لیے جس راہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اطمینان ہو، ہمیں بھی ہونا چاہیے۔ لیکن ہم تو چار جانوروں کو قیمہ کر کے پھر بلائیں تو وہ کبھی اڑتے ہوئے نہیں آتے۔ نہ نبی کریم ﷺ کی موجودگی میں ایسا ہوا۔ پس وہ کون سا امر ہے جس سے ہمارا اطمینان قلب ہو۔ وہ یہی صورت ہے کہ ان الفاظ میں جو مثال ہے وہ ایک دلیل کے رنگ میں ہو تو دلیل ایک ایسی چیز ہے جو جس طرح آج سے ہزارہا سال پیشتر کسی کو مطمئن کرسکتی تھی اسی طرح آج کرسکتی ہے۔ مگر واقعہ جو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے وہ جب تک ہر شخص نہ دیکھے اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ رہا ایمان کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سامنے ایسا ہوا ہوگا۔ سو وہ تو پہلے بھی حاصل ہے کہ خدا ایسا کرسکتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سامنے ایسا ہونے سے اس میں کچھ زیادتی نہیں ہوسکتی۔ یہ دلیل نہ صرف دنیا میں احیائے موتی پر صادق آتی ہے بلکہ قیامت میں احیائے موتی پر بھی وہی کام دیتی ہے۔

336- ﴿سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ [دیکھو نمبر: 193]۔ اللہ کی راہ یا اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کی راہ اس کا دین ہے۔ پس انفاق فی سبیل اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کے دین کی حفاظت یا ترقی کے لیے اموال کا خرچ کرنا ہے۔ اور چونکہ جہاد بھی حقیقتاً دین کی ترقی اور حفاظت میں کوشاں ہونا ہے، اس لیے بعض نے کہا ہے کہ عرف قرآن میں فی سبیل اللہ جہاد سے مختص ہے۔ جہاد بالسیف ایک خاص اور وقتی ضرورت ہوتی ہے۔ جہاد کبیر وہ ہے جو ہر وقت ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا: ﴿وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا﴾ [الفرقان: 52:25] یعنی اس قرآن کے ذریعہ سے ان کے ساتھ جہاد کبیر کرو۔ پس انفاق فی سبیل اللہ کا اصل مفہوم ترقی دین اسلام پر خرچ کرنا ہے۔ گویا دیگر خیراتی کام بھی اس میں شامل ہو جاتے ہیں۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ — وہ لوگ جو اپنے مالوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں
ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّ لَآ اَذًى ۙ — پھر اُس کے پیچھے جو خرچ کیا نہ احسان جتاتے ہیں اور نہ دکھ
لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَ لَا خَوْفٌ — دیتے ہیں ان کے لیے ان کا اجر ان کے رب کے پاس

سُنْبُلَةٍ۔ اس کا اصل بھی سُنْبُلٌ ہے اور معنی خوشہ ہیں۔ جمع سَنَابِلُ۔

قوم کی زندگی کے اسباب کیا ہیں:

اس سے پہلے ضرورت انفاق کا مضمون چلا آتا ہے۔ اس رکوع میں یہ ذکر ہے کہ انفاق کا نتیجہ کیا ہے اور اس نتیجہ کو ضائع ہونے سے کیونکر بچایا جا سکتا ہے؟ اسی لیے اس میں اخلاص کی ضرورت اور ریا سے بچنے کا ذکر کیا ہے۔ پچھلے رکوع میں مسلمانوں کو زندگی کی بشارت دی ہے اور اس سے پچھلی آیت میں یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو زندہ کرنا چاہے تو اس کے اسباب اکٹھے کر دیتا ہے۔ اب انہی اسباب کا ذکر کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ افراد کی قربانیاں قوم کی زندگی کا موجب ہوتی ہیں اور مالی قربانیوں کی ضرورت ہر وقت ہر قوم کو پڑتی ہے اس لیے ان کی طرف خصوصیت سے توجہ دلائی۔

بیج کی مثال اور انجیل سے مقابلہ:

خدا کی راہ میں مال خرچ کرنے کو اس بیج کے بونے سے مشابہت دی ہے جس سے ایک دانہ سے سات سو دانہ بنتا ہے۔ بلکہ اس سے بھی دو چند اور کئی گنا ہوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ بغیر حساب رزق بھی اس کا نتیجہ ہے۔ جیسا موقعہ ہو، جس قدر اس میں اخلاص ہو، جس قدر اس کے لیے کوشش کی جائے اسی کے مطابق نتیجہ ہوگا۔ حضرت مسیح نے بھی انجیل میں ایک دانہ کے بڑھنے کی مثال دی ہے مگر تیس گنا۔ ساٹھ گنا حد سو گنا بڑھنے کا ذکر کیا ہے۔ [متی: 23:13]۔

قرآن کریم سات سو گنا سے شروع کر کے اسے چند در چند کرنے کا وعدہ دیتا ہے اور یہ نرا وعدہ ہی نہیں بلکہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی زندگیوں میں ہی اس وعدہ کا ثبوت بھی مل جاتا ہے۔ سینکڑوں دیئے تو لاکھوں اور کروڑوں پائے۔ عرب کی دولت کیا ہوگی اس کو خرچ کر کے قیصر و کسریٰ کے خزانوں کے مالک ہو گئے۔ بعض لوگوں کو ایک یہ غلطی لگتی ہے کہ وہ ایک پیسہ جیب سے دے کر یہ چاہتے ہیں کہ فوراً دس پیسے ان کی جیب میں غیب سے آ پڑیں۔ وہ درد نیا سنا ہوا ہے مگر نظر اتنی تنگ ہے کہ کبھی اس کے معنوں پر غور نہیں کرتے۔ وہ درد نیا تو ادنیٰ سے ادنیٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ تو سات سو گنا بلکہ اس سے بھی چند در چند کا وعدہ دیتا ہے مگر وہ آتا یوں ہے کہ قومی اور دینی مفاد پر جو اموال خرچ کیے جاتے ہیں وہ قوم کو خدا کے فضلوں کا وارث بنا دیتے ہیں اور جب قوم میں دولت آتی ہے تو بحصہ رسدی اس کے سب افراد اس میں حصہ دار ہو جاتے ہیں۔ قومی زندگی ہی اصل زندگی ہے۔ اسی کی طرف قرآن شریف بار بار توجہ دلاتا ہے۔ مگر تنگ دل انسان اپنا مال صرف اسی کو سمجھتا ہے جو اس کی جیب میں ہو۔

عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۶۲﴾ ہے اور انہیں کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔(337)

اسلام کی ترقی انفاق فی سبیل اللہ سے ہوگی:

اب بھی مسلمانوں پر سے ذلت وادبار کی حالت دور نہیں ہوسکتی جب تک کہ وہ خدا کی راہ میں اپنے مالوں کو خرچ کرنا نہ سیکھیں۔ اپنے شغلوں پر، شادیوں اور ماتموں کے موقعہ پر بے دریغ روپیہ خرچ کرتے ہیں مگر خدا کی راہ میں دینے کے وقت مفلس بن جاتے ہیں۔ دین اسلام کی ترقی انفاق فی سبیل اللہ سے وابستہ ہے۔ جب تک اس اصول قرآنی کو اپنی زندگیوں کا عملی رہنما نہ بنائیں کامیاب نہیں ہوسکتے۔ مسلمانوں میں مال ودولت کی کمی نہیں مگر وہ دل نہیں جو خدا کے وعدوں پر سچا ایمان رکھتا ہو، اس کی راہ میں مال ودولت کو لٹادے۔

337- مَنٌّ۔ مَنَّةٌ کے معنی بھاری نعمت ہیں (من مشہور وزن ہے چالیس سیر) اور من ایک تو فعل سے ہے جس کے معنی ہیں اس کو بھاری نعمت دی۔ اتنی بڑی نعمت جس کے بوجھ کے نیچے وہ دب گیا۔ جیسے فرمایا: ﴿مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ [آل عمران: 164:3] ''اللہ نے مومنوں پر احسان کیا''، ﴿فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ﴾ [النسآء: 94:4] ''پھر اللہ نے تم پر احسان کیا''، ﴿مَنَنَّا عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ﴾ [الصّٰفّٰت: 114:37] ''ہمیں نے موسیٰ اور ہارون پر احسان کیا''، ﴿نُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا﴾ [القصص: 5:28] ''ہم چاہتے تھے کہ ان لوگوں پر احسان کریں جو کمزور کیے گئے ہیں۔'' اور یہ حقیقتاً اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور دوسرا من قول سے ہے یعنی لفظوں میں جتانا کہ ہم نے یوں کیا اور یہ قبیح ہے۔ (غ) اسی من کا یہاں ذکر ہے۔ اسی کی مثل ہے ﴿يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا﴾ [الحجرات: 17:49] ''تجھ پر احسان جتاتے ہیں کہ وہ اسلام لائے۔'' اور مَنٌّ کے معنی قطع بھی آتے ہیں۔ گویا احسان جتانا اس نعمت کو قطع کردیتا ہے۔

انفاق کی پہلی غرض ترقی دین ہے:

یہاں بھی فی سبیل اللہ خرچ کرنے سے مراد اولاً ترقی دین کے لیے خرچ کرنا ہی ہے۔ جیسا کہ مفسرین نے اس کے ماتحت غزوۂ تبوک میں حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ کے آٹھ ہزار درہم میں سے جو ان کے پاس تھے چار ہزار درہم دینے کا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ایک ہزار اونٹ بمع سامان دینے کا ذکر کیا ہے۔ لکھا ہے کہ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے بار بار دعا کرتے رہے یہاں تک کہ صبح ہوگئی: [يَا رَبِّ اِنَّ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ رَضِيْتُ عَنْهُ فَارْضَ عَنْهُ.] (ابن عساکر، جلد39، صفحہ 54)۔ ''اے میرے رب عثمان بن عفان سے میں راضی ہوا تو بھی اس سے راضی ہوجا۔'' ان واقعات کو جن کا تعلق غزوہ تبوک سے ہے۔ اس آیت کے شان نزول میں بیان کرنا جو مدت پہلے کی نازل شدہ ہے بتاتا ہے کہ شان نزول سے مراد کسی واقعہ کا کسی آیت کے ماتحت آنا ہے نہ کچھ اور۔ ایسے چندوں کی صورت میں من یہ ہے کہ چندہ دے کر فخر کرے کہ میں نے اس قدر چندہ دیا ہے۔ جیسے دوسری جگہ ہے: ﴿يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا﴾ [الحجرات: 17:49] ''تجھ پر احسان جتاتے ہیں کہ وہ

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّ مَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ؕ وَ اللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴿۲۶۳﴾

نیک بات کہنا اور معاف کر دینا اُس صدقہ سے بہتر ہے جس کے پیچھے دکھ پہنچایا جائے اور اللہ بے نیاز بردبار ہے۔(338)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنی خیرات کو احسان جتا کر

اسلام لائے۔'' خدا کی راہ میں دے کر یہ سمجھنا چاہیے کہ ایک فرض تھا یا ایک امانت تھی جو ادا ہوگئی کیونکہ مومن کا مال تو خدا کا مال ہے جیسا ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ﴾ [التوبة: 111:9] ''اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال خرید لیے ہیں۔'' سے ظاہر ہے اور اَذًی یہ ہے کہ دوسروں کو یہ کہہ کر دکھ پہنچائے کہ فلاں نے تھوڑا دیا ہے یا فلاں نے نہیں دیا۔

بغیر انفاق خوف وحزن کی حالت دور نہ ہوگی:

انفاق فی سبیل اللہ کا نتیجہ نہ صرف اجر ہے جس کو بلحاظ اس کی عزت یا مکرمت کے یا تاکید کے طور پر عِنْدَ رَبِّهِمْ فرمایا۔ بلکہ ﴿لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ کی حالت بھی اسی کا نتیجہ ہے یعنی مالی قربانیوں سے قوم خوف وحزن کی حالت سے نکل کر کامیابی کی منزل مقصود پر پہنچ جاتی ہے۔ یعنی دشمن کا خوف باقی نہ رہے گا اور جس قربانی پر انسان کو کامیابی حاصل ہو اس پر وہ کبھی پچھتاتا نہیں۔ آج بھی مسلمان اگر خوف وحزن کی حالت سے نکلنا چاہتے ہیں تو یہی راہ ہے لیکن قربانی کے بغیر کچھ نہ بنے گا۔

338- غَنِيٌّ۔ اَلْغَنِيُّ جو اسمائے الٰہی میں سے ہے اس کے معنی ہیں وہ جو کسی کا محتاج نہیں اور ہر ایک شخص اس کا محتاج ہے۔ (ن) اور یہ غنائے مطلق ہے اور وہ اَلْمُغْنِيْ بھی ہے یعنی اپنے بندوں کو غنی کرتا ہے۔ مگر یہ غنائے مطلق نہیں جسے عدم حاجت سے تعبیر کیا جاتا ہے بلکہ حاجات کا کم کر دینا ہے۔ جیسا کہ فرمایا: ﴿وَ وَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى﴾ [الضحیٰ: 8:93] ''اور تجھے تنگدست پایا تو غنی کر دیا۔'' یا جیسا حدیث میں ہے: [الغِنٰى غِنَى النَّفْسِ] (صحيح البخارى، كتاب الرقاق، باب الْغِنَى غِنَى النَّفْسِ: 6446) (غ) اور محض مال کی زیادتی پر بھی بولا جاتا ہے جیسے: ﴿مَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ﴾ [النسآء: 6:4] ''جو آسودہ ہے چاہئے کہ وہ بچا رہے۔''

بھلی بات بتانا بھی صدقہ ہے:

قول معروف سے مفسرین نے سائل کو اچھی بات کہہ کر رد کر دینا اور مغفرۃ سے سائل کی پردہ پوشی یا خدا کی حفاظت مراد لی ہے۔ مگر چونکہ یہاں ذکر مال کے دینی ترقیات میں خرچ کرنے کا ہے اس لیے قول معروف سے مراد لوگوں کو بھلائی کی باتیں بتانا ہوسکتا ہے اور مغفرۃ سے یہ کہ ایسا شخص خود دوسروں کو معاف کرے یا اللہ تعالیٰ کی مغفرت حاصل کرے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر

بِالْمَنِّ وَ الْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶۴﴾

اور ستا کر باطل نہ کرو[339] اس شخص کی طرح جو اپنا مال لوگوں کے دکھانے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں لاتا۔ سو اُس کی مثال اس صاف چٹان کی سی ہے جس پر مٹی ہو، پھر اس پر زور کا مینہ برسے اور اسے بالکل صاف کر کے چھوڑ دے اس میں سے کچھ بھی نہ پا سکیں گے جو کمایا تھا اور اللہ کافر لوگوں کو راہ نہیں دکھاتا۔[340]

کچھ دے نہیں سکتے تو پھر قول معروف اور دوسروں کی پردہ پوشی سے ہی کام لو۔ یہ بھی ایک خدمت دینی بلکہ ایک صدقہ ہے۔

339- تُبْطِلُوْا۔ بَاطِلٌ۔ نقیض حق ہے یعنی وہ چیز جس کو ثبات نہ ہو اور ابطال یہ ہے کہ کسی چیز کو فاسد کر دیا جائے یا اسے بالکل نیست و نابود کر دیا جائے خواہ فی نفسہٖ وہ چیز حق ہو یا باطل۔ (غ)

صدقات کا باطل ہونا یہ ہے کہ وہ عظیم الشان نتائج جو ان پر مترتب ہوئے تھے ان سے انسان محروم ہو جائے۔ صدقہ مثل ایک بیج کے ہے جو پھل لاتا ہے مَنّ اور اَذًی ایسی آفات ہیں جو اس پھل کو تباہ کر دیتی ہے جیسا کہ اس رکوع کی آخری تمثیل میں بتایا۔

340- رِئَآءٌ۔ رَاٰی کے معنی دیکھا اور رِئَآءٌ دوسروں کو دکھانا اور شائع کرنا۔ (غ)

صَفْوَانٌ اور صَفَا کے ایک ہی معنی ہیں صاف پتھر [نمبر: 197]۔ واحد صَفْوَانَةٌ ہے۔

وَابِلٌ۔ اس بارش کو کہتے ہیں جو وزنی قطروں والی ہو یعنی زور کی بارش۔ اور اصل مادہ میں ثقل یا بوجھ کے معنی ہیں اسی لحاظ سے ہی وبال ایک امر کے ضرر دینے والے نتیجہ کو کہا جاتا ہے۔ ﴿ذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ﴾ [الحشر: 15:59] ''اپنے کام کی سزا چکھ چکے ہیں۔'' اور وبیل وہ ہے جس کے وبال کا خوف ہو ﴿فَاَخَذْنٰهُ اَخْذًا وَّبِيْلًا﴾ [المزمل: 16:73] ''سو ہم نے اسے سخت وبال میں پکڑا۔'' (غ)

صَلْدٌ وہ سخت پتھر جس پر کوئی چیز نہیں اگتی اس لیے [رَأْسٌ صَلْدٌ] اس سر کو کہا جاتا ہے جس پر بال نہ اگیں۔ (غ)

ریا سے مال خرچ کرنے کی مثال اس پتھر سے دی ہے جس پر کچھ مٹی پڑی ہے اور بیج جو ڈالا جائے اگتا نظر آتا ہے مگر جڑ نیچے نہیں جاتی اور زور کی بارش جو زمین کی روئیدگی کو ترقی دیتی ہے اس پتھر کی اوپر کی مٹی کو بیج سمیت بہا لے جاتی ہے۔

<u>اس آیت میں اصل مقصود تو مسلمانوں کو ریا سے روکنا ہے</u>۔ مگر اس کا پیرایہ یہ اختیار کیا کہ تم ریا سے خرچ کرنے والوں کی طرح نہ ہو جانا۔ کیونکہ ریا سے خرچ کرنے والے وہ لوگ ہوتے ہیں جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں لاتے۔ یعنی یہ تو کافروں کا کام

وَ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَ تَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۶۵﴾

اوران لوگوں کی مثال جو اپنے مالوں کو اللہ کی رضا چاہتے ہوئے اور اپنے آپ کو مضبوط رکھنے کے لیے خرچ کرتے ہیں، اس باغ کی مثال کی طرح ہے جو اعلیٰ درجہ کی زمین پر ہو، پھر اس پر زور کا مینہ پڑے تو وہ اپنا پھل دو چند دے اور اگر اس پر زور کا مینہ نہ پڑے تو ہلکا مینہ ہی (کافی ہے) اور اللہ جو تم کرتے ہو دیکھتا ہے۔ (341)

ہے مومن کا کام ہی نہیں۔ یوں اس فعل کو حد سے زیادہ قبیح بنا کر دکھایا ہے۔ انجیل میں بھی ریا سے روکا ہے مگر قرآن شریف نے بلاغت کو کمال تک پہنچایا ہے۔ **رسوم ورواجات پر جو روپیہ خرچ ہوتا ہے وہ سب ریا سے ہے** کیونکہ اس میں مدنظر صرف یہ ہوتا ہے کہ لوگ ایسا کہیں اور ایسا نہ کہیں۔ اگر خرچ نہ کریں تو لوگوں میں ناک کٹتی ہے۔ یہی ریا کی شناخت ہے۔ افسوس ہے کہ جس فعل کو ایسا قبیح بنا کر دکھایا گیا تھا کہ یہ مسلمان کا کام ہی نہیں ہوسکتا۔ اس میں آج اس کثرت سے مسلمان ملوث ہیں کہ شاذ و نادر ہی کوئی بچا ہوگا۔ رسم ورواج پر قرضے لیتے اور مکانات اور جائدادیں بیچ دیتے ہیں۔ لیکن خدا کی راہ میں دینے کے لیے پاس موجود ہو تو بھی حیلے تلاش کرتے ہیں۔ مومن کہلا کر کام کافروں سے بدتر ہیں پھر نتیجہ کیا ملے۔ کیوں ان کے علماء اور مشائخ ان کاموں سے ان کو نہیں روکتے۔

﴿لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا﴾ میں صاف پیشگوئی ہے کہ کفار جو کچھ خرچ کر رہے ہیں وہ محض ریا کاری ہے۔ جب خدا کی رحمت کی بارش آئے گی تو ان کا سب کیا کرایا اس طرح تباہ ہوجائے گا جس طرح صاف پتھر پر سے مٹی۔ اور ہر ایک ریا سے خرچ کرنے والے کا یہی انجام ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ چاہتا ہے وہ بھی حاصل نہیں ہوتا۔

341- ﴿مِّنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ میں من بعضیہ ہے یعنی کسی قدر اپنے نفسوں کو ایمان پر مضبوط کرنے کے لیے۔ انفاق مال سے کچھ مضبوطی ایمان کی حاصل ہوتی ہے اور اپنے سارے قویٰ کو خدا کی راہ میں لگا دینے سے پوری قوت ایمانی حاصل ہوتی ہے۔

رَبْوَةٌ۔ رَبَا کے معنی میں بڑھا اور بلند ہوا۔ اور ربوۃ اعلیٰ درجہ کی زمین کو کہتے ہیں۔ (غ)

اُكُلٌ۔ جو چیز کھائی جائے۔ اس لیے پھل کو بھی کہتے ہیں۔

طَلٌّ۔ نہایت کمزور بارش جس کا اثر بہت ہی کم ہو۔ (غ)

یہ دوسری مثال ان لوگوں کی ہے جو اللہ کی رضا کے لیے مال خرچ کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی بڑھایا ہے کہ اپنے نفسوں کے ثبات کے لیے۔ یہ انفاق مال کا فلسفہ بیان کیا ہے۔ یعنی خدا کی رضا کے لیے مال خرچ کرنے سے ایمان پر ثابت قدمی

اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ اَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَ اَصَابَهُ الْكِبَرُ وَ لَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۪ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۶۶﴾ ع 36 6 4

کیا تم میں سے کوئی چاہتا ہے کہ اس کا ایک باغ کھجوروں اور انگوروں کا ہو اس کے نیچے نہریں بہتی ہوں اس کے لیے اس میں ہر قسم کے پھل ہوں اور اسے بڑھاپے نے آلیا ہو اور اس کی اولاد چھوٹی چھوٹی ہو، پھر اسے ایک بگولا پہنچے جس میں آگ ہو، پس وہ جل جائے؟ اسی طرح اللہ تمہارے لیے باتیں کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم فکر کرو۔ (342)

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَ مِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۪ وَ لَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو ان اچھی چیزوں سے خرچ کرو جو تم کماتے ہو اور اس سے جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالا ہے، اور ردّی چیز (دینے)

بڑھتی ہے کیونکہ مال انسان کی محبوب چیز ہے اور جس چیز پر وہ اپنا مال خرچ کرے گا اسی سے اسے محبت پیدا ہوگی۔ پس خدا کی رضا کے لیے مال خرچ کرنے سے خدا کی راہ میں ثابت قدمی اور وفاداری بڑھتی ہے۔

342- نَخِيْلٌ۔ نَخْلٌ کی جمع ہے۔ کھجور۔

اَعْنَابٌ۔ عِنَبٌ کی جمع ہے۔ انگور کی بیل اور انگور کے پھل دونوں پر بولا جاتا ہے۔

ثَمَرَاتٌ۔ یا تو یہ مراد ہے کہ کھجور انگور کے سوائے اور بھی سب پھل ہیں اور یا یہ کہ اس میں ہر قسم کے منافع ہیں۔ کیونکہ ثمر سے مراد بعض وقت مال بھی ہوتا ہے جس سے انسان فائدہ اٹھاتا ہے۔ (غ)

اِعْصَارٌ۔ عَصَرَ کے معنی نچوڑنا ہیں جیسے: ﴿فِيْهِ يَعْصِرُوْنَ﴾ [یوسف: 49:12] ''اس میں وہ (انگور) نچوڑیں گے۔'' اور اعصار وہ ہوا ہے جو زمین سے اٹھتی ہے اور غبار کو اٹھاتی ہے پھر ستون کی طرح آسمان کی طرف بلند ہو جاتی ہے۔ یعنی بگولا۔ (ل)

من واذیٰ کا اثر صدقہ پر:

یہ تیسری مثال مَنًّ وَّ اَذًی کے اثر کی ہے اصل مضمون من واذیٰ کا ہی تھا۔ اس سے روکتے ہوئے ریا کا ذکر کیا پھر رضائے الٰہی کے لیے خرچ کرنے کا اور رکوع کے آخر پر پھر اصل مضمون کی طرف رجوع کیا اور سمجھایا کہ ابتدا میں انسان رضائے الٰہی کے لیے خرچ کرتا ہے۔ اس لیے وہ جڑ پکڑتا اور باغ بن جاتا ہے لیکن مَنًّ وَّ اَذًی کا اثر اس پر ایک بگولے کی طرح ہوتا ہے جو ہری بھری

تُنْفِقُوْنَ وَ لَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّاۤ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۲۶۷﴾

کا قصد نہ کرو اس میں سے تم خرچ کرو گے حالانکہ تم خود اس کو لینے والے نہیں سوائے اس کے کہ اس کی قیمت کم کراؤ اور جان لو کہ اللہ بے نیاز تعریف کیا گیا ہے۔ (343)

کھیتیوں کو جلا دیتا ہے۔ گویا اس رکوع میں رضائے الٰہی کے لیے اور دین حق پھیلانے کے لیے خرچ کرنے کی ترغیب دی ہے۔ مَنّ وَاَذیٰ اور رِئَا سے روکا ہے اور تینوں باتوں کی وضاحت تین مثالوں سے کر دی ہے۔

343- كَسَبْتُمْ۔ كَسَبٌ وہ ہے جس میں انسان اپنے آپ کو لگاتا ہے جس میں نفع اٹھانے اور فائدہ حاصل کرنے کی غرض ہو۔ لفظ كَسَبٌ کے مقابل پر ﴿مِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ﴾ فرمایا۔ گویا پہلے میں تجارت صنعت وغیرہ ہے اور دوسرے میں پھل، کھیتیاں، معدنیات۔

تَيَمَّمُوْا۔ تَيَمَّمٌ کے معنی قصد کرنا ہیں (اصطلاح شریعت میں خاص معنی ہیں) اور اس کا اصل اَمَّ ہے جس کے معنی ہیں قصد کیا۔ (ل)

اَلْخَبِيْثَ۔ وہ چیز جس سے کراہت کی جائے بوجہ اس کے ردی ہونے یا اس کے خسیس ہونے کے خواہ محسوس ہو یا معقول اور اس میں باطل اعتقاد اور جھوٹ باتیں اور برے فعل سب شامل ہو جاتے ہیں۔ ﴿يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ﴾ [الأعراف: 157:7] ''ان پر ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے۔''، ﴿وَّ نَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ﴾ [الأنبیآء: 74:21] ''اور اسے اس بستی سے نجات دی جو ناپاک کام کرتی تھی۔''، ﴿الْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ﴾ [النور: 26:24] ''پلید چیزیں پلید لوگوں کے لیے ہیں۔'' (غ) یہاں مراد ردی چیز ہے۔

تُغْمِضُوْا۔ غَمْضٌ اور اِغْمَاضٌ کے اصل معنی نیند ہیں۔ (غ۔ل) اور بطور استعارہ تغافل اور تساہل پر استعمال ہوتا ہے اور [اِغْمَاضٌ فِي الْبَيْعِ] کے معنی ہیں۔ جب فروخت والی چیز کو زیادہ مانگے اور قیمت کو کم کر دے۔ (ن) یا اس کے ردی ہونے کی وجہ سے اس کی قیمت میں کمی کا مطالبہ کرے۔

اس سے پہلے رکوع میں بتایا تھا کہ انفاق کس طرح پھل لاتا ہے؟ کس طرح بیج کے ضائع ہونے سے بچایا جا سکتا ہے؟ کس طرح آفات سے محفوظ رہ سکتا ہے؟ اس رکوع میں بتایا ہے کہ کون سا مال خرچ کرنا چاہیے؟ کس طرح پر یعنی علانیہ یا چھپ کر خرچ کرنا چاہیے؟ اور کس پر خرچ کرنا چاہیے؟ یوں انفاق کی تمام اصولی تفصیلات کو ان دو رکوعوں میں بیان کر دیا ہے۔

کون سا مال ہو جو خدا کی راہ میں دیا جائے؟: اول شرط یہ ہے کہ مال طیب ہو۔ یعنی جائز طور پر کمایا ہوا ہو اور اچھا ہو۔ دوسری یہ کہ ردی مال نہ ہو جس کی تمہارے نزدیک بھی کوئی وقعت نہیں۔ ردی چیز کو دے کر اعلیٰ درجہ کے نتائج حاصل نہیں ہو سکتے۔ آج کل کی بڑی اسلامی ہمدردی یہ ہے کہ کاروبار سے فارغ ہو کر دل بہلانے کے لیے چار باتیں اسلامی ہمدردی کی بھی کر دیں۔ یہ بھی وہی

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَ يَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَ اللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَ فَضْلًا ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۸﴾

شیطان تم کو تنگدستی سے ڈراتا ہے اور تمہیں بخل کا حکم دیتا ہے اور اللہ تمہیں اپنی طرف سے مغفرت اور فضل کا وعدہ دیتا ہے، اور اللہ کشایش والا جاننے والا ہے۔[344]

يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَ مَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ وَ مَا يَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۶۹﴾

وہ جسے چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے اور جس کو حکمت دی جائے تو اسے بہت بھلائی دی گئی۔ اور نصیحت قبول نہیں کرتے مگر (وہی جو) عقل والے (ہیں)۔[345]

ردی متاع ہے اور خدا کی راہ میں مال خرچ کرنے کا تو نام بھی مسلمانوں کو بھولا ہوا ہے۔ حالانکہ انفاق کو اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے لیے کیسا محبوب بناتا ہے کہ کوئی ناقص چیز بھی خدا کی راہ میں دینے کو پسند نہیں کرتا بلکہ یہی چاہتا ہے کہ جب کوئی دے اعلیٰ درجہ کی چیز دے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی عظمت وشان کے لیے پاس ادب بھی سکھایا ہے۔ کیونکہ جب خدا کا نام درمیان میں آ گیا تو پھر چیز خواہ کسی کو دی جائے اعلیٰ اور افضل دینی چاہیے اسی کے مطابق آیت کا خاتمہ ﴿غَنِيٌّ حَمِيْدٌ﴾ پر کیا ہے۔

344- يَعِدُ۔ وَعَدَ کا لفظ خیر وشر دونوں پر بولا جاتا ہے یعنی اچھی چیز کے وعدہ دینے پر اور برے انجام سے ڈرانے پر اور وعید کا لفظ شر سے خاص ہے۔

اَلْفَحْشَاءُ۔ اصل میں ہر ایک قبیح فعل یا قول پر بولا جاتا ہے لیکن عرب کے لوگ بخیل کو بھی فاحش کہتے تھے۔ (ل) اس لیے بلحاظ قرینہ یہاں بخل معنی کیے گئے ہیں۔

اس آیت میں یہ بتایا کہ جو خیالات بعض وقت اللہ کی راہ میں دینے میں مانع ہوتے ہیں۔ **وہ حقیقت میں شیطانی خیال ہیں کہ خدا کی راہ میں دے کر ہم غریب ہو جائیں گے**۔ ایک حدیث میں آتا ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا تین باتوں پر قسم کھاتا ہوں جن میں سے ایک یہ ہے کہ خدا کی راہ میں دینے سے مال کم نہیں ہوتا اور حق بھی یہی ہے کہ آج تک کوئی شخص خدا کی راہ میں دینے سے فقر وفاقہ میں مبتلا نہیں ہوا۔ گو سارا مال بھی خدا کی راہ میں دے دے۔ البتہ رسم ورواج کی پابندیوں سے بہتیرے تباہ ہو گئے ہیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس آیت کی تفسیر میں مروی ہے کہ انسان کے لیے ایک **لمہ شیطانی** اور ایک **لمہ ملکی** ہوتا ہے۔ شیطانی تحریک برے کاموں کے لیے اور حق کی تکذیب کے لیے ہوتی ہے۔ اور ملک کی تحریک بھلائی کے لیے اور حق کی تصدیق کے لیے ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں ایسے معاملات میں اندازہ قومی حالت سے لگانا چاہیے نہ افراد کی حالت سے۔ جب افراد قومی اپنے اموال کو قومی یا دینی ترقی کے لیے خرچ کرتے ہیں۔ تو قوم غریب نہیں ہوتی بلکہ خدا کا فضل زیادہ سے زیادہ اس کے شامل حال ہوتا ہے۔

345- اَلْبَابُ۔ لُبٌّ کی جمع ہے اور لُبٌّ کسی چیز کے خلاصہ یا مغز کو کہتے ہیں اور انسان میں لُبٌّ اس عقل خالص کو کہتے ہیں جو ہر قسم کے

وَ مَاۤ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۲۷۰﴾

اور جو کچھ خرچ کرنے کی چیز تم خرچ کرو یا کوئی منت مان لو تو اللہ اسے جانتا ہے اور ظالموں کے لیے کوئی مددگار نہیں۔ (346)

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَ اِنْ تُخْفُوْهَا وَ تُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ

اگر تم خیرات کھلے طور پر دو تو کیا ہی اچھی بات ہے اور اگر تم اسے چھپاؤ اور محتاجوں کو دو تو وہ تمہارے لیے اچھا ہے اور

شائبوں سے پاک ہو یعنی نہایت خالص عقل۔ پس ہر لُبٌّ عقل ہے اور ہر عقل لُبٌّ نہیں۔ (غ)

جب یہ بتایا کہ انفاق سے تنگدستی کا پیدا ہونا محض شیطانی ڈراوا ہے تو اب بتاتا ہے کہ مال خیر نہیں بلکہ **اصول حقہ کو سمجھ لینا خیر کثیر ہے**۔ اور یہ اصول حقہ یا اصول دین کی سمجھ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔ گویا اس اصول کو سمجھ لینا کہ خدا کی راہ میں مال دینے سے انسان تنگدست نہیں ہوتا اصول دین میں سے ایک اصل ہے اور اس کو سمجھ کر انسان خیر کثیر کا مالک ہو جاتا ہے اس کا بگڑنا کیا ہے۔ **اس حکمت کو صحابہ رضی اللہ عنہم نے سمجھا** اور باوجود یکہ وہ غریب تھے اپنے مالوں کو انہوں نے اللہ کی راہ میں خرچ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا میں بھی خیر کثیر کے مالک ہو گئے اس لیے کہ ایک زندہ اور کامیاب قوم بن گئی۔ آج مسلمان ان سے بہت زیادہ مالدار اور تعداد میں ہزار ہا گنے زیادہ ہیں۔ مگر اسی حکمت کی بات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ان کا مال ان کے ہاتھوں سے نکل کر دوسرے کے ہاتھوں میں جا رہا ہے اور پھر بھی وہ قرآن کریم کی اس حکمت کی بات پر عمل پیرا نہیں ہوتے۔

346- نَذْرٍ۔ امام راغب نے نذر کے یہ معنی کیے ہیں کہ کسی امر کے حدوث کی وجہ سے تم اپنے نفس پر کسی ایسی بات کو واجب کر لو جو واجب نہیں۔ مگر قرآن کریم میں جہاں جہاں لفظ نذر آیا ہے کوئی شرط ساتھ نہیں۔ مثلاً: ﴿اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا﴾ [مریم: 26:19] ''میں نے رحمٰن کے لیے (اپنے اوپر) روزہ واجب کیا ہے۔''، ﴿اِنِّيْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِيْ بَطْنِيْ مُحَرَّرًا﴾ [آل عمران: 35:3] ''میرے رب جو کچھ میرے پیٹ میں ہے میں نے آزاد کر کے تیری نذر کیا۔'' نہایہ میں ابن اثیر نے نذر کے معنی صرف اس قدر لکھے ہیں کہ جب تم اپنے نفس پر عبادت یا صدقہ وغیرہ سے کوئی چیز بطور نفل واجب کر لو تو وہ نذر ہے۔ اور پھر لکھا ہے کہ احادیث میں اس سے روکنے کا مکرر ذکر آیا ہے اور اس کا منشا یہ ہے کہ یہ ایسا امر ہے جو نہ کوئی نفع کھینچ لاتا ہے نہ کسی نقصان کو دور کرتا ہے نہ کسی قضا و قدر کو رد کر دیتا ہے۔ پس اگر اس اعتقاد کے ساتھ انسان کسی امر کو اپنے اوپر واجب کر لے تو اس کا پورا کرنا ﴿يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ﴾ [الدھر: 7:76] ''نذر کو پورا کرتے ہیں۔'' کے ماتحت ضروری ہے اور گو مفسرین لکھتے ہیں کہ نذر شرط کے ساتھ یا بلا شرط ہو سکتی ہے مگر قرآن شریف میں یا حدیث میں شرط کا ذکر نہیں۔

یہاں ظالم ان لوگوں کو کہا ہے جو خدا کی راہ میں اپنے مالوں کو خرچ نہیں کرتے یا معصیت میں اور رسم و رواج کی پابندی میں خرچ

لَّكُمْ ؕ وَ يُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۷۱﴾

وہ بعض تمہاری برائیاں تم سے دور کر دے گا اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے خبر دار ہے۔ (347)

کرتے ہیں۔

347- نِعِمَّا۔ نِعْمَ اور مَا سے مرکب ہے اور نَعْمَ فعل مدح ہے۔ پس نِعِمَّا کے معنی ہوئے کیا اچھی چیز ہے۔

يَكْفُرُ۔ كَفَرَ کے اصل معنی ڈھانکنا ہیں (اور ابن اثیر نے بڑھایا ہے ایسا ڈھانکنا جو اسے ہلاک کر دے یعنی ایک چیز کی ترقی کو روک دے۔) اور تکفیر کے معنی ہیں ایک چیز کا ڈھانک دینا اور اس کا دبا دینا یہاں تک کہ وہ بمنزلہ اس چیز کے ہو جائے جو کی نہیں گئی اور اسی سے کفارہ ہے جس کے معنی ہیں وہ چیز جو گناہ کو ڈھانک دے۔ (غ)

﴿مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ﴾ من بعضیہ ہے۔ صدقات سے ساری برائیاں دور نہیں ہوتیں۔ بعض قسم کی برائیاں دور ہو جاتی ہیں۔ اسلام نے جو کفارہ بتایا ہے وہ یہی ہے کہ بعض قسم کی نیکیوں سے بعض قسم کی بدیاں دور ہو جاتی ہیں اور دب جاتی ہیں یعنی ظاہر نہیں ہوتیں۔

علانیہ صدقات انجیل کی ناقص تعلیم:

اس آیت میں انفاق کا طریق بتایا۔ قرآن کریم ہر ایک مسئلہ انسانی ضروریات کے سارے پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر بحث کرتا ہے۔ انجیل کی مشہور پہاڑی تعلیم میں صدقات کا مضمون اتنی ہی بات پر ختم ہو جاتا ہے کہ تم دکھاوے کے لیے خیرات نہ کرو۔ بلکہ تمہارا دایاں ہاتھ دے تو بائیں کو خبر نہ ہو۔ مگر یہ بھی ایک غلطی ہے کہ جو صدقات علانیہ طور پر دیئے جائیں ان کو دکھاوے کے لیے سمجھ لیا جائے اور نہ ہی ضروریات انسانی کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ ممکن ہے کہ انسان جب صدقہ کرے تو ایسے ہی طور پر کرے کہ دایاں ہاتھ دے تو بائیں کو خبر نہ ہو۔ بڑے بڑے **قومی چندے** جن سے ضروریات قومی پوری ہوتی ہیں وہ کبھی اس طریق نہیں دیئے جا سکتے اور جس کتاب نے اپنی تعلیم کو یہیں تک ختم کر دیا وہ یقیناً ناقص ہے۔ قرآن شریف جس نے تعلیم کو کمال تک پہنچانا تھا وہ یوں تعلیم دیتا ہے کہ علانیہ طور پر بھی مال خدا کی راہ میں دینا بہت اچھا ہے بلکہ اسے پہلے بیان کیا۔ اس میں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ دوسروں کو نیکی کی تحریک ہوتی ہے اور درحقیقت بڑے بڑے قومی کام علانیہ چندوں سے ہی سرانجام پا سکتے ہیں۔ آج عیسائی لوگ ان قومی چندوں میں علانیہ حصہ لے کر اپنے عمل سے انجیل کی تعلیم کو جھٹلا رہے اور قرآن کریم کی تعلیم کو سچا قرار دے رہے ہیں۔ ہاں جہاں اس قسم کی ضروریات کی عظمت اور وقعت کے لحاظ سے انہیں مقدم کیا، ساتھ ہی دوسرے پہلو کا بھی ذکر کر دیا کہ غربا کی کچھ مدد کرو تو وہ چھپا کر دو۔ وہ بھی ایک ضرورت قومی ہے اور بہت لوگ مستحق امداد ہوتے ہیں جن کو علانیہ دینا موزوں نہیں اور نہ وہ علانیہ لینا پسند کرتے ہیں۔ خصوصیت سے ایسے لوگ کون ہیں ان کا ذکر اگلی سے اگلی آیت میں ہے۔

مخفی صدقات:

قرآن شریف نے صرف ایک لفظ اخفا ہی ایسے صدقات کے متعلق استعمال فرمایا ہے۔ مگر احادیث میں ایسے صدقات کا ذکر بہت

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۲﴾

ان کی ہدایت تیرے ذمے نہیں، لیکن اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے اور جو کچھ مال تم خرچ کرو گے وہ تمہارے اپنے ہی لیے ہے۔ اور تم خرچ نہیں کرتے سوائے اس کے کہ اللہ کی رضا چاہو۔ اور جو کچھ مال تم خرچ کرو گے وہ تمہیں پورا دیا جائے گا اور تمہیں نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ (348)

پایا جاتا ہے۔ صحیحین میں ہے کہ سات آدمیوں کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے سایہ میں لے گا۔ امام عادل، جوانی میں عبادت الٰہی کرنے والا، دو شخص جو اللہ کے لیے محبت کرنے والے ہوں، وہ شخص جو مسجد سے نکلتا ہے تو اس کا دل مسجد میں معلق ہوتا ہے، وہ جسے حسین مال دار عورت بلائے تو صرف خدا کے خوف سے بچے۔ اور وہ شخص جو صدقہ کرتا ہے تو اسے اتنا چھپاتا ہے کہ اس کا بایاں ہاتھ نہیں جانتا جو اس کا دایاں ہاتھ خرچ کرتا ہے۔ اور ایک حدیث میں آتا ہے کہ مخفی صدقہ رب کے غضب کو دور کرتا ہے۔ مگر ظاہر صدقہ بسا اوقات مقدم ہوتا ہے۔ خود زکوٰۃ جو ظاہر صدقہ ہے بوجہ فرضیت نفلی صدقات پر مقدم ہے۔

348- ﴿لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ﴾ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ پہلے پہلے مسلمان (بوجہ ان سختیوں کے جو کفار سے پہنچی تھیں) فی سبیل اللہ اپنے مشترک رشتہ داروں کی امداد ناپسند نہیں کرتے تھے تو یہ آیت نازل ہوئی۔ یعنی قرآن شریف نے **غیر مسلموں کی امداد** بھی فقر اور تنگی کی حالت میں ضروری قرار دی ہے اور انسانی ہمدردی کے دائرہ کو تنگ نہیں کیا اور فرمایا کہ ہدایت امر دیگر ہے۔ مگر احتیاج کے وقت انسان کی دستگیری ایک فرض انسانی ہے۔ یہ ذکر محتاجوں کو دینے کے ذکر کے ساتھ ہی کیا تا اس مضمون کی تکمیل ہو جائے۔

صدقہ سے فائدہ اپنے آپ کو اور قوم کو ہوتا ہے:

اور یہ جو فرمایا: ﴿فَلِاَنْفُسِكُمْ﴾ تو مراد یہ ہے کہ اس کا فائدہ خود تم کو یا تمہارے لوگوں کو ہی پہنچتا ہے۔ کیونکہ اَنْفُسِكُمْ میں دونوں مفہوم داخل ہیں انسان کا اپنا نفس بھی اور اس کے بھائی بند بھی۔ اپنے نفس کو یہ فائدہ پہنچتا ہے کہ اس کے اندر نیکی کی قوت نشوونما پاتی ہے، ہمدردئ انسانی جو انسان کا سب سے بڑا جوہر ہے ترقی کرتی ہے۔ قوت ایمانی بڑھتی ہے اور اپنے بھائی بند کو یہ فائدہ ہے کہ قومی بہبودی کے کاموں سے ساری قوم کو فائدہ پہنچتا ہے ﴿وَ مَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ﴾ میں یا تو یہ بتایا ہے کہ مسلمانوں کا جو انفاق ہوگا وہ رضائے الٰہی کے لیے ہی ہوگا۔ اور **یا یہ کہ تم اس بات کا فکر مت کرو کہ جس کو دیا ہے وہ کون ہے؟** تم نے تو خرچ محض رضائے الٰہی کے لیے کیا تھا سو وہ مل جائے گی۔ پس صدقہ دینے کے وقت لوگوں کے اعمال کی فکر نہ کرو۔ صحیحین کی ایک حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص نے کہا میں آج رات صدقہ کروں گا تو وہ صدقہ ایک زانیہ کے ہاتھ میں چلا گیا۔ دوسری رات صدقہ کیا تو وہ ایک غنی کے ہاتھ چلا گیا۔ تیسری رات کیا تو وہ ایک چور کے ہاتھ چلا گیا۔ تو اسے کہا گیا

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ز يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ج تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ج لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ط وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۷۳﴾ ع

اُن محتاجوں کے لیے جو اللہ کی راہ میں روکے گئے ہیں۔ زمین میں چلنے پھرنے کی طاقت نہیں رکھتے (سوال سے) بچنے کے باعث ناواقف اُن کو دولت مند سمجھتا ہے تو انہیں ان کی نشانیوں سے پہچان لے گا۔ وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے، اور جو کچھ مال تم خرچ کرو اللہ اسے یقینا جانتا ہے۔ (349)

تمہارا صدقہ قبول ہوگیا ہے۔ رہے وہ لوگ جن کے ہاتھ میں گیا ہے سو شاید زانیہ زنا سے بچ جائے، غنی صدقہ دینے کی توفیق پائے، چور چوری سے رک جائے۔ ماحصل اس تعلیم کا یہ ہے کہ **ادنیٰ عذروں پر انسان صدقہ کو نہ روک رکھے**۔ ایک سرسری نظر سے دیکھ لے جو مستحق نظر آئے یا جہاں نیکی کا کام ہو رہا ہو وہاں اعانت میں شامل ہو جائے۔ اسی کی طرف آیت کے آخری الفاظ میں اشارہ کیا کہ تمہارا انفاق ضائع نہیں جائے گا بلکہ اس کا اجر تم کو پورا پورا ملے گا اور اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

349- اَلتَّعَفُّفُ۔ عَفَّ سے ہے اور عِفَّةٌ کے اصل معنی ہیں تھوڑی چیز پا کر صبر کر لینا۔ (غ) اور پھر اس کے معنی ہو گئے ہیں اس چیز سے رکنا جو حلال نہیں یا اچھی نہیں۔ (ل) اِسْتِعْفَافٌ اور تَعَفُّفٌ کے ایک ہی معنی ہیں یعنی حرام سے اور لوگوں سے سوال کرنے سے بچنا۔ (ل)

سِيْمَا۔ سَوْمٌ کے اصل معنی ہیں کسی چیز کی تلاش میں جانا۔ (غ) اس سے سِيْمَا اور سِيْمِيَاءُ کے معنی علامت ہو گئے ہیں۔

اِلْحَافًا۔ اَلْحَافٌ۔ سوال کرنے میں سخت الحاح کو کہتے ہیں۔ (ل) اور یہ لحاف سے ہے کیونکہ اس سے انسان اپنے آپ کو سارا ڈھانک لیتا ہے۔ پچھلی سے پچھلی آیت میں جب محتاجوں کو دینے کا ذکر فرمایا تو یہ بیان کر کے کہ محتاج مسلم ہو یا غیر مسلم دے دو۔ اب یہ بتایا ہے کہ **خصوصیت سے کون سے محتاج مستحق ہیں**۔ وہ وہ فقراء ہیں جو اللہ کی راہ میں رک گئے ہوں یعنی اپنے کاروبار نہ کر سکتے ہوں اور **یہ تین قسم کے لوگ ہیں:**

① وہ مجاہدین یا خدا کی راہ میں کوشش کرنے والے جو اس لیے کہ ساری قوت اسی کام پر لگاتے ہیں، اپنا ذریعہ معاش نہ رکھتے ہوں۔ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں اصحاب الصفہ کا گروہ اسی ذیل میں شامل تھا۔ اب بھی جو لوگ تعلیم دین پاتے ہوں یا خدمت دین کے لیے اپنے آپ کو وقف کر چکے ہوں اس ذیل میں آتے ہیں۔

② وہ لوگ جو کفار کے ظلم کی وجہ سے یا امن اٹھ جانے کی وجہ سے اپنا کاروبار نہ کر سکتے ہو۔

③ وہ لوگ جو دینی جنگوں میں زخمی ہو گئے ہوں یا خدمت دینی ادا کرتے ہوئے کام کے ناقابل ہو گئے ہوں۔ ﴿لا

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَ النَّهَارِ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ

جولوگ رات اور دن چھپ کر اور ظاہر اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں تو ان کے لیے ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان کو کوئی ڈر نہیں

يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ﴾ میں بتادیا کہ وہ اللہ کی راہ میں ایسے روکے گئے ہیں کہ زمین میں چل پھر کر اپنی معاش پیدا نہیں کر سکتے اور ان کی نشانی یہ بتائی ہے کہ ایسے لوگ سوال نہیں کرتے مانگتے نہیں۔ یوں ان کے کام کرنے والوں کو بھی کیا اعلیٰ درجہ کی تعلیم دی ہے۔ ان واعظوں کے لیے جو وعظ کر کے مداری کی طرح دست سوال کرتے ہیں۔ اس میں سبق ہے اور فی سبیل اللہ دینے والوں کو بھی نصیحت ہے کہ وہ زیادہ تر اپنے اموال کن لوگوں پر صرف کریں۔

یہاں لفظ تَعَفُّفٌ کے استعمال سے اور مستحقین کے متعلق یہ بتا کر کہ وہ سوال نہیں کرتے یہ بھی بتادیا ہے کہ **سوال کرنا اچھی بات نہیں** کیونکہ تعفف بری بات سے بچنے کا نام ہے تو معلوم ہوا کہ **اللہ تعالیٰ کے نزدیک سوال کرنا مذموم امر ہے**۔ مگر آج جدھر دیکھو بھیک مانگنے والے مسلمان نظر آتے ہیں۔ بخاری کی حدیث میں جو ان الفاظ کی تفسیر ہے یہ لفظ آتے ہیں کہ مسکین وہ نہیں جس کو ایک یا دو کھجوریں یا ایک دو لقمے دے دیئے جاتے ہیں [إِنَّمَا الْمِسْكِينُ الَّذِي يَتَعَفَّفُ] (صحيح البخاري، كتاب التفسير، باب (لاَ يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا): 4539) مسکین یعنی لینے کا حق دار صرف وہی ہے جو سوال سے بچے۔ اور ایک اور حدیث میں یہ لفظ آتے ہیں کہ وہ مسکین نہیں جو در بدر گھومتا پھرے اور تم اسے لقمہ لقمہ دو۔ اور ایک حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے یہ خطبہ پڑھا کہ جو شخص اپنی حاجت غیروں کے پاس نہیں لے جاتا اللہ اسے غنی کر دیتا ہے اور جو سوال سے بچتا ہے اللہ اسے بچاتا ہے اور جو اپنے آپ کو روکتا ہے اللہ اس کے لیے کافی ہو جاتا ہے: [مَنِ اسْتَغْنَى أَغْنَاهُ اللهُ وَمَنِ اسْتَعَفَّ أَعَفَّهُ اللهُ وَمَنِ اسْتَكْفَ كَفَاهُ اللهُ] (سنن الدارقطني، جلد2، صفحہ 118) اور ایک حدیث میں آتا ہے کہ جو شخص سوال کرے اور اس کے پاس ایک اوقیہ کی قیمت کی قدر ہو تو وہ الحاف کرتا ہے۔ پس ان احادیث کی رو سے وہ بھیک مانگنے والے جو لقمہ لقمہ کے لیے در بدر پھرتے ہیں مستحق خیرات نہیں ہیں اور ایسا سوال کرنے کو اسلام نے بہت مذموم قرار دیا ہے۔ پس ایسے سائلین کے روکنے کا انتظام عین مطابق منشائے تعلیم اسلامی ہے۔

قرآن نے صدقات کی تعلیم کو کامل کیا:

قرآن کریم کا یہ دعویٰ کہ اس میں تعلیم کمال کو پہنچ گئی ہے۔ اس کی تعلیم کے ہر شعبہ سے ظاہر ہے کہ ان دو رکوع میں صدقات کے مضمون کا کوئی پہلو جس پر اصولی رنگ میں بحث ہو سکتی تھی نہیں چھوڑا۔ صدقات کی ضرورت بتائی، نتیجہ بتایا، نتیجہ کے ضائع ہونے سے بچنے کی راہ بتائی، ریا سے روکا۔ بتایا کہ کیسا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرے۔ پھر بتایا کہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے کوئی قوم غریب نہیں ہوتی۔ بلکہ خدا کے فضل کی زیادہ حق دار ہوتی ہے۔ پھر بتایا صدقات کس طرح دو، قومی کاموں میں علانیہ بھی دو۔ محتاجوں کو چھپا کر بھی دو۔ پھر مسلمان محتاجوں کو بھی دو غیر مسلموں کو بھی دو۔ پھر دو تو یہ فکر نہ کرو کہ کس کے ہاتھ میں

وقف منزل

وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۷﴾ اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ (350)

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ

جولوگ سود کھاتے ہیں وہ کھڑے نہیں ہوں گے مگر اس طرح جیسے وہ شخص کھڑا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر باؤلا بنادیا ہو۔ (351) یہ اس لیے ہے کہ وہ کہتے ہیں

گیا۔ پھر بتایا کہ بھیک مانگنا مذموم فعل ہے اور مستحق امداد وہ لوگ ہیں جو بھیک نہیں مانگتے اور اپنی معاش کی فکر اس لیے نہیں کرتے کہ کسی دینی کام میں مصروف ہیں۔ اب انجیل اس تعلیم کا کیا مقابلہ کرے گی جس کی ساری دوڑ اس ایک دل خوش کن فقرہ پر ختم ہوجاتی کہ دکھاوے کے لیے نہ دو۔ یہاں تمام ضروریات انسانی کو مدنظر رکھ کر تمام پہلوؤں پر بحث ہے۔

350- **صدقات اور سود کا تقابل:** اس رکوع کا اصل مضمون تو حرمت سود ہے مگر یہاں بطور خلاصہ صدقات کے مضمون کو پھر بیان کر دیا ہے کیونکہ صدقہ وہ چیز ہے جو اغنیا سے لے کر غربا کو دی جاتی ہے اور سود وہ چیز ہے جو غربا سے چھین کر اغنیاء کو دی جاتی ہے تو اس تعلق کے لحاظ سے سود کے ذکر سے پہلے پھر صدقات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ وہی اصل الاصول ہے جس پر دنیا کی خوش حالی کا انحصار ہے۔ کیونکہ مال کی تقسیم میں جب تک مساوات کے پہلو کو مدنظر نہ رکھا جائے۔ کبھی دنیا میں خوش حالی نہیں رہ سکتی۔ صدقات کا دینا اور سود کا نہ لینا اسی مساوات کے دو پہلو ہیں۔

351- يَاْكُلُوْنَ۔ اَكَلَ ابتداءً کھانے کے معنی میں آتا ہے۔ پھر ہر قسم کے انفاق مال پر بولا جاتا ہے کیونکہ کھانا سب سے بڑا امر ہے۔ جس کے لیے انسان مال کا محتاج ہوتا ہے ﴿وَ لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ﴾ [البقرة: 188:2] ''اور اپنے مالوں کو آپس میں ناجائز طور پر نہ کھاؤ''، ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا﴾ [النسآء: 10:4] ''جو یتیموں کا مال ظلم سے کھاتے ہیں'' اور اَكَلَ الْمَالَ بِالْبَاطِلِ سے مراد اس کا ایسے طور پر خرچ کرنا ہے جو حق کے منافی ہو اور ﴿يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا﴾ [النسآء: 10:4] ''اپنے پیٹوں میں آگ ہی کھاتے ہیں'' میں آگ کا کھانے کی طرح پیٹ میں ڈالنا مراد ہے۔

اَلرِّبٰوا۔ رَبَا الشَّيْءُ کے معنی ہیں ایک چیز بڑھ گئی اور اس نے ترقی کی۔ (غ) قرآن شریف میں سبزی کے بڑھنے پر آتا ہے: ﴿رَبَتْ﴾ [الحج: 5:22] ''ابھرتی ہے'' اور ایسا ہی مال کے بڑھنے پر ہے ﴿لِّيَرْبُوَا۟ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ﴾ [الروم: 39:30] ''لوگوں کے مال میں جا کر بڑھتا رہے، تو وہ اللہ کے ہاں نہیں بڑھتا'' اور رِبوٰ راس المال پر بڑھوتی کا نام ہے لیکن شریعت میں خاص قسم کی بڑھوتی پر یہ لفظ بولا گیا ہے۔ (غ) ابواسحاق کا قول ہے کہ جو رِبوٰ حرام ہے اس کی صورت اس قرض کی ہے جس کے ذریعہ سے جتنا دیا تھا اس سے زیادہ لیا جائے یا جس کے ذریعہ کوئی اور فائدہ اٹھایا جائے اور جو حرام نہیں وہ یہ ہے کہ انسان بطور ہبہ یا تحفہ کوئی چیز دے یہ چاہتا ہوا کہ اس سے بڑھ کر اس کو ملے۔

ابن جریر نے مجاہد سے روایت کی ہے کہ **جاہلیت میں یہ رواج تھا** کہ ایک شخص کا دوسرے پر قرضہ ہوتا تو وہ کہتا کہ تم اس قدر

مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَ حَرَّمَ — خرید وفروخت بھی سود ہی کی طرح ہے۔ حالانکہ اللہ نے
الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ — خرید وفروخت کو حلال کیا اور سود کو حرام کیا ہے سو جس کے

اصل میں بڑھالو اور ادائیگی میں مہلت دے دو اور قتادہ کہتے ہیں کہ ربائے جاہلیت یہ تھا کہ ایک شخص دوسرے سے ایک وقت مقرر کے لیے خرید وفروخت کا معاملہ کرتا، جب وہ وقت آجاتا اور رقم ادا نہ ہوتی تو رقم بڑھا دی جاتی اور مہلت دے دی جاتی۔

يَتَخَبَّطُ۔ خَبْطٌ سے ہے جس کے معنی سخت مارنا۔(ل) ہیں جیسے درخت پر پتے جھاڑنے کے لیے سونٹا مارا جاتا ہے۔ اور حدیث میں [أَنْ يَّتَخَبَّطَنِي الشَّيْطَانُ] (سنن أبي داود، كتاب8، باب32، حديث: 1554) آتا ہے اس کے معنی کیے ہیں: [يُصْرِعُنِيْ وَيَلْعَبُ بِيْ]۔(ن) یعنی مجھے پچھاڑ دے اور مجھے کھیل بنائے۔

مَسّ کے اصل معنی چھونا ہیں پھر ہر ایک ضرر جو انسان کو پہنچے بولا جاتا ہے ﴿مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ﴾ اور کنایۃً جنون پر بھی بولا جاتا ہے۔(غ) اور یہی معنی یہاں مراد ہیں جیسا اکثر تفاسیر میں ہے۔

صدقات اور ربا کے مضمون میں جو تعلق ہے وہ پچھلے نوٹ میں بیان ہو چکا ہے اور گو صدقات اور ربا کی آیات کا نزول مختلف زمانوں کا ہے مگر ترتیب میں ان کو ایک جگہ رکھنا صاف بتاتا ہے کہ ترتیب آیات آنحضرت ﷺ کے ارشاد سے ہوتی تھی۔ مگر بخاری میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کے جو یہ لفظ ہیں کہ [آخِرُ آيَةٍ نَزَلَتْ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ آيَةُ الرِّبَا] (صحيح البخاري، كتاب التفسير، باب (وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللهِ): 4544) **یعنی آخری آیت جو نبی ﷺ پر نازل ہوئی آیت ربا ہے۔ یہ اس معنی میں درست نہیں** کہ ربا کی حرمت کا حکم نزول قرآن کریم میں آخری آیت ہے۔ حجۃ الوداع میں آنحضرت ﷺ کا ربا سے منع کرنا صاف ثابت ہے۔ سو یہ آیت اس سے پہلے کی ہے اور حجۃ الوداع میں ﴿اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾ [المآئدة: 3:5] ''آج میں نے تمہارا دین تمہارے لیے کامل کر دیا۔'' کا نزول ثابت ہے۔ اس لیے اس کے بعد کوئی حکم کی آیت نازل نہیں ہو سکتی۔ اس لیے ربا سے روکنے کا حکم بھی [آخِرُ آيَةٍ نَزَلَتْ] نہیں ہو سکتا سوائے اس کہ اسے سورۂ بقرہ میں بلحاظ نزول آخری آیت مانا جائے۔ مگر اس سے بہتر توجیہ اس حدیث کی وہ ہے جو نمبر 358 میں کی گئی ہے۔ یعنی آیت ربا سے مراد اس رکوع کی آخری آیت ہے اور سورۂ آل عمران میں بھی ﴿لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً﴾ [آل عمران: 130:3] ''بڑھا بڑھا کر سود نہ کھاؤ۔'' آتا ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ حرمت سود کا حکم دیر سے نازل ہوا ہو اور حرمت شراب کی طرح حرمت سود بھی تدریجاً ہوئی ہو اور سورۂ آل عمران میں صرف سود در سود سے روکا ہو۔

اور **یہ جو روایات میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ربا کی تفسیر نہیں کی** جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول جو مسند احمد میں مروی ہے اور اسی قسم کے اور بھی اقوال ہیں حالانکہ ربا جاہلیت میں ایک مشہور و معروف امر تھا تو اس میں مراد صرف اس قدر ہے کہ وہ امور جو ربا سے ملتے جلتے ہیں ان کا ذکر نہیں کیا جیسا کہ ان اقوال میں ربا کے ستر یا تہتر دروازوں کا ذکر آتا ہے اور جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ان الفاظ سے ظاہر ہے: [فَدَعُوا الرِّبَا وَالرِّيبَةَ] (سنن ابن ماجه، كتاب التجارات، باب التَّغْلِيظِ فِي الرِّبَا: 2276)

فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَ اَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ پاس اپنے رب سے نصیحت آگئی پھر وہ رک گیا تو اس کے

''سود یا اور شک کو چھوڑ دو۔'' یعنی ان امور کو جن کے متعلق شک ہو کہ وہ ربا سے ملتے جلتے ہیں ان میں سے بعض ملتی جلتی صورتوں کا ذکر احادیث میں آ بھی گیا ہے۔ جیسے یہ کہ مُخَابِرَۃٌ سے روکا یعنی معین حصہ پر زمین کاشت کرنے سے یا مُزَابَنَۃٌ سے یعنی خشک کھجور سے تازہ کھجوریں خریدی جائیں جو خوشے میں ہوں۔ یا مُحَاقِلَۃٌ سے یعنی اس دانہ کے خریدنے سے جو ابھی خوشوں میں ہو۔

سود کی ممانعت عام ہے:

بعض لوگوں نے کہا کہ صرف سود در سود منع ہے نہ کہ سود۔ حالانکہ ربا کے معنی میں سود صاف آتا ہے بعض نے کہا کہ یہ حکم صرف دارالاسلام کے لیے ہے لیکن اس طرح قرآن کریم کے کل احکام سے امن اٹھ جائے گا جو مدینہ میں نازل ہوئے کہ وہ صرف دارالاسلام سے مخصوص ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ سود کے حکم کی علت غربا سے ہمدردی ہے۔ جیسا کہ صدقات اور ربا کے مضمون کو ایک جگہ کرنے سے ظاہر ہے، مگر علت گو کچھ ہو حرمت تو عام ہے۔ جیسے شراب کی حرمت کی علت تو یہ ہے کہ اس سے نشہ ہو جاتا ہے نقصان پہنچتا ہے مگر ایک قطرہ بھی جائز نہیں، گو اس سے نشہ نہ ہو۔ کیونکہ حکم عام ہے۔ البتہ سود دینے والے کے لیے بعض صورتیں اضطرار کی پیدا ہو سکتی ہیں کہ اس کے بغیر اس کی زندگی قائم نہ رہ سکے۔

بینکوں کا سود:

ایک سوال یہ ہے کہ بنکوں میں جو روپیہ حفاظت کے لیے رکھا جائے اور اس پر حسب قواعد بنک سود ملے اس کا لینا جائز ہے یا نہیں؟ اس میں شک نہیں کہ ربا میں یہ لازم بات ہے کہ روپیہ کسی کو قرض دیا گیا ہو۔ جتنی ربائے جاہلیت کی صورتیں بیان کی گئی ہیں ان میں یہ ضروری ہے اور بنک میں ایک شخص روپیہ قرض نہیں دیتا بلکہ بطور امانت رکھتا ہے۔ تو گو یہ صورت کسی قدر مختلف ہے۔ مگر پھر بھی صورت ربا سے مشابہ ہے اس لیے محتاط طریق یہی ہے کہ وہ روپیہ سود کا مخالفین اسلام کے مقابل پر اشاعت اسلام یا جہاد میں خرچ کیا جائے اور اپنے مصرف میں نہ لایا جائے جیسا کہ نوٹ نمبر 356 میں ہے۔ اور **زمیندارہ بینکوں کی صورت** بھی کسی قدر عام صورت ربا سے اختلاف رکھتی ہے کیونکہ وہاں وہی لوگ قرض لے سکتے ہیں جو خود حصہ دار ہوں اور یوں ایک رنگ میں نفع نقصان دونوں کے مالک ہو جاتے ہیں۔ مگر وہاں بھی احتیاط کا طریق یہی ہے جو بنک کے سود کے متعلق لکھا گیا۔ **ہاں یہ جائز ہے کہ ایک شخص قرضہ لے اور واپس کرتے وقت اصل رقم سے کچھ بڑھ کر محض ﴿هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ﴾** [الرحمن: 60:55] ''نیکی کا بدلہ سوائے نیکی کے کچھ نہیں۔'' **کے طور پر دے دے**۔ یہ سود نہیں کیونکہ قرض دینے والے کو اس کا لینا مدنظر نہ تھا۔

ربا کی حرمت میں کئی ایک احادیث ہیں، ایک حدیث میں ربا کے کھانے اور کھلانے کو گواہ اور کاتب سب پر لعنت کی ہے۔ کیونکہ وہ سب سود کو مروج کرتے ہیں اور ایک اور حدیث میں ہے جو ابوداؤد نے روایت کی ہے کہ ایک زمانہ آئے گا کہ لوگ سود

وَ مَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ لیے ہے جو گزر چکا اور اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے اور جو

کھائیں گے۔عرض کیا گیا سب لوگ؟ فرمایا:[مَنْ لَّمْ يَأْكُلْهُ مِنْهُمْ، نَالَهُ مِنْ غُبَارِهِ] (مسند الإمام أحمد، جلد16، صفحہ 258؛ طبع مؤسسة الرسالة) جو ان میں سے سود نہیں کھائے گا اس کا غبار اس کو پہنچ رہے گا۔آج یہ الفاظ مخبر صادق کے کیسے سچے نظر آتے ہیں۔

سود کی ممانعت کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟: اس کی دو بڑی وجوہ اللہ تعالیٰ نے یہاں بیان فرمائی ہیں۔ جن میں سے پہلی وجہ ان الفاظ میں ہے ﴿يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ﴾ سود خوار کی حالت ایسی ہو جاتی ہے جیسے ایک شخص کو شیطان نے مجنون بنا کر گرا دیا ہو۔ گویا وہ مال و دولت کی محبت میں مجنوں ہو جاتا ہے اور پھر وہ گر جاتا ہے یعنی شرف انسانیت کھو دیتا ہے۔ یہ الفاظ نہایت سچے ہیں جب ایک انسان یا ایک قوم سود خوری میں ترقی کرتی ہے تو آخر مال و دولت کو اپنا معبود بنا لیتی ہے اور ہمدری انسانی کی اعلیٰ صفات سے محروم ہو جاتی ہے۔ یہود یوں نے سود خوری میں ترقی کی، ہمارے ملک کے بنیے بھی اسی کی مثال ہیں۔ ان کے مال و دولت کی محبت اس حد تک ترقی کر گئی ہے کہ اپنے آرام اور آسائش پر اپنی اولاد پر بھی صرف کرنا ان کو دشوار نظر آتا ہے۔ وہ مہذب قومیں جنہوں نے آج سود خوری میں ترقی کی ہے ان کا معبود صرف ایک مال رہ گیا ہے اسی کی وہ پوجا کرتے ہیں۔اس پر دین، ایمان، عزت، عفت سب کچھ بیچنے کو تیار ہیں۔

شراب اور سود کے بدنتائج بہت باریک ہیں۔آنحضرت ﷺ کی تعلیم اور کامل قوت قدسی:

جس طرح اسلام سے پہلے کسی مذہب نے شراب کو حرام نہیں کیا اسی طرح سود کو بھی حرام نہیں کیا۔ بات یہ ہے کہ ان دونوں کے خطرناک نتائج اس قدر باریک ہیں اور ان کا دور کرنا اس قدر مشکل ہے کہ اس کام کا اہل وہی انسان تھا جس نے سب نبیوں اور رسولوں کا سرتاج ہو کر آنا تھا۔اس کی وحی کو یہ کمال عطا کیا گیا کہ باریک سے باریک بدنتائج جو مدتوں بعد ظاہر ہوتے ہیں اسے دکھا دیئے جائیں اور اسی کو یہ قوت قدسی عطا کی گئی کہ خطرناک سے خطرناک بدیاں جو انسانوں کی طبائع کے اندر اس قدر دخل پا گئی ہیں کہ بظاہر جزو فطرت بنی ہوئی نظر آتی ہیں دنیا سے دور کرے۔جس طرح شراب کے بدنتائج اگر انسان یوں دیکھنا چاہے کہ ایک شخص حد اعتدال تک شراب پیتا ہے یا دو چار گھونٹ پیتا ہے تو اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا تو نہیں دیکھ سکتا۔ اسی طرح پر بظاہر اس میں کسی کا نقصان نظر نہیں آتا کہ زید بکر کو دس روپے قرض دے اور اس پر سال بھر میں دو روپے یا چار روپے سود لے لے اور بکر ان دس روپوں کو تجارت میں لگا کر ان سے فائدہ اٹھائے اتنے عظیم الشان مسائل میں ایک وسیع پیمانہ پر اور لمبے زمانہ میں نتائج کو پھیلا کر دیکھنا ضروری ہوتا ہے۔ یوں تو بدی اور نیکی چیزیں ہی ایسی ہیں کہ ان کے نتائج فوری اور بدیہی نہیں ہوتے بلکہ کھلا نتیجہ ان کا اس وقت نظر آتا ہے جب ان کا بار بار کثرت سے اعادہ ہو۔مگر جس قدر بدی باریک ہوگی اسی قدر اس کے نتائج اور لمبے زمانہ پر پھیلانے سے نظر آئیں گے۔خود زنا کی بدی ایسی ہے کہ اس کے بھی فوری بدنتائج لوگوں کو نظر نہیں آتے۔اس لیے آج طرح طرح کے پیرایوں میں زنا کاری کو رواج دیا جاتا ہے۔پس سود خوری کے نتائج کو جب لمبے زمانہ پر

هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷۵﴾ پھر لینے لگے تو وہی آگ والے ہیں وہ اس میں رہ پڑیں گے۔ (352)

پھیلا کر دیکھا جائے تو خود واقعات شہادت دے اٹھتے ہیں کہ وہ اخلاقِ انسانی اور عامہ آسائش انسانی کی ترقی میں بڑی بھاری روک ہے۔ سودخوری کے ساتھ جوں جوں مال کی محبت ترقی کرتی ہے اصول، اخلاق، ہمدردی انسانی کی وقعت کم ہوتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ آخرکار ایسا انسان یا ایسی قوم روپے کی محبت کے عوض تمام اعلیٰ اخلاق کو بیچ دیتی ہے۔ اخلاق فاضلہ کی اعلیٰ منزل پر پہنچانے کے لیے ایک چھوٹی سی مالی منفعت کو قربان کر کے اسلام نے بتا دیا کہ واقعی وہ دنیا کا آخری اور کامل مذہب ہے۔ سودخوری کے دوسرے عظیم الشان نقصان کی طرف اگلے الفاظ میں توجہ دلائی گئی ہے۔ دیکھو اگلا نوٹ۔

352- بَیْعٌ چیز کے دینے اور قیمت کے لینے یعنی فروخت کو کہتے ہیں اور شِرَاءٌ خرید کو۔ مگر دونوں لفظ ایک دوسرے کی جگہ اور معاملہ خرید وفروخت پر بھی استعمال ہوتے ہیں۔

سَلَفَ۔ متقدم یعنی پہلے آنے والے کو کہا جاتا ہے۔ ﴿فَلَهٗ مَا سَلَفَ﴾ سے یہاں مراد ہے کہ جو اس کا گناہ پہلے کر چکا اس پر گرفت نہیں کی جائے گی۔ (غ)

امر کے اصل معنی شان یعنی معاملہ یا حالت ہیں اور وہ ہر قسم کے اقوال وافعال کے لیے عام لفظ ہے۔ (غ) ﴿اَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ﴾ ایسا ہی محاورہ ہے جیسے ہم کہہ دیتے ہیں اس کا معاملہ سپرد خدا۔ یعنی تم انسان اس کے متعلق زبان مت کھولو کہ پہلے یوں کرتا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام یہ بھی تعلیم دیتا ہے کہ جب ایک شخص ایک برائی سے رک جائے تو اس کی **گزشتہ کمزوریوں کا ذکر کرنا قرآن شریف کی رو سے ایک نہایت قبیح امر ہے۔**

سود اور تجارت میں فرق:

یہاں بتایا کہ لوگ سود کے جواز کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ جیسا سود ویسی تجارت۔ حالانکہ لین دین خرید وفروخت کو اللہ تعالیٰ حلال قرار دیتا ہے اور سود کو حرام۔ پس معلوم ہوا کہ وہ دونوں یکساں نہیں۔ ظاہری مساوات جس کی طرف لوگوں کی نظر جاتی ہے وہ تو یہ ہے کہ جب انسان مال خرید کر اس سے منفعت حاصل کر سکتا ہے اسی طرح روپے سے بھی اسے منفعت حاصل کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ مگر خدا کے ہاں ان دونوں میں فرق ہے۔ ادنیٰ تامل سے کام لیا جائے تو وہ فرق یہ نظر آتا ہے کہ سود میں محنت نہیں، خرید وفروخت میں محنت کرنی پڑتی ہے۔ اسلام نے چونکہ محنت کو انسانی ترقی کا ضروری جزو قرار دیا ہے اس لیے ایک ایسے معاملہ کو جس میں محنت نہیں ناجائز ٹھہرایا ہے اور نہ صرف سودخوری محنت سے خالی ہے بلکہ اس سے **محنت کی بے وقری بھی ہوتی ہے** اور وہ اس طرح کہ سرمایہ دار جب سود پر روپیہ دیتا ہے تو وہ شخص جو اس سے تجارت کرتا ہے اور اس پر محنت کرتا ہے بعض وقت نفع اٹھاتا ہے بعض وقت نقصان۔ مگر سرمایہ دار ہمیشہ نفع لیتا ہے اور نقصان سے اسے کچھ واسطہ نہیں۔ اگر بالفرض تجارت میں سارے مال کا بھی نقصان ہو جائے تو بھی سرمایہ دار نہ صرف اپنے سرمایہ کا حقدار ہے بلکہ وہ اس پر نفع بھی لے گا۔

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَ يُرْبِي الصَّدَقٰتِ ؕ وَ اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے اور اللہ کسی

گویا محنت کی بمقابلہ سرمایہ یعنی روپیہ کے کچھ بھی قدر نہیں۔نقصان کا ذمہ دار وہ اور نفع سے فائدہ اٹھانے والا سرمایہ۔

شراکت کی افضلیت: اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جہاں ایک شخص دوسرے سے روپیہ قرض لے کر تجارت چلاتا ہے تو سرمایہ دار اور محنت کرنے والا دونوں نفع نقصان میں حصہ دار ہوں، یعنی بجائے قرض کے شراکت کا رنگ ہو۔ اسلام کا اصل الاصول معاملات دنیا میں محنت کے وقر کو بڑھانا ہے۔ اسی لیے اس نے ان امتیازات کو دور کر دیا ہے جو مال کی کمی یا زیادتی سے پیدا ہوتے ہیں۔

سودخواری میں سرمایہ کی عزت محنت سے بڑھ کر ہے، چنانچہ یورپ کی موجودہ سودخوار قوموں میں اس اصول کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ انسانوں کا وہ حصہ جن کا مدار زندگی محنت پر ہے غریب اور مفلس ہو گیا ہے اور ان کا افلاس روز بروز ترقی کر رہا ہے اور سرمایہ اور روپیہ چند سرمایہ داروں کے ہاتھ میں اکٹھا ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اکثر حالات میں یہ سرمایہ بھی محنت سے پیدا ہوا ہے مگر جب ایک دفعہ وہ پیدا ہو جاتا ہے تو پھر کوئی اصول ایسا نہیں کہ اس کو محنت کرنے والوں کی طرف واپس کرے بلکہ اصول سود خواری کی رو سے یہ سودخوار کے ہاتھ میں بلا محنت ترقی کرتا چلا جاتا ہے۔ اس غلط **اصول کا نتیجہ ہی پہلے سوشلزم کا اور اب بولشوزم کا پیدا ہونا ہے** جنہوں نے اس سرمایہ کے چند ہاتھوں میں اجتماع کو دیکھ کر اس کے خلاف یہ اصول قائم کیا کہ کوئی شخص اپنے کمائے ہوئے مال کا آپ مالک نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ سب مل کر کمائیں اور مل کر کھائیں گو اس میں محنت کی عزت نظر آتی ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ یہ دونوں افراط و تفریط کی راہیں ہیں اور اس میں بھی محنت کے بے وقری ہے؛ کیونکہ جب محنت کے نتیجہ کا انسان مالک نہ ہوگا تو ترقی کے لیے اور زیادہ محنت کرنے کے لیے کوئی تحریک باقی نہ رہے گی۔

اصول محنت و مساوات دولت میں توازن اسلام نے قائم کیا:

ان مشکلات کا حل اسلام نے کیا کہ ایک طرف تو محنت کو یہ عزت دی ہے کہ محنت سے کمائے ہوئے مال کو محنت کرنے والے کا حق قرار دیا تاکہ محنت کے لیے یہ موجب تحریک ہو اور دوسری طرف جب محنت سے سرمایہ ایک جگہ جمع ہونے لگے تو پھر اس کے واپس لوٹانے اور ایک حد تک دوسرے لوگوں میں تقسیم کرنے کا انتظام کیا۔ گویا اصول محنت مساوات دولت کے خلاف تھا۔ اور مساوات دولت اصول محنت کے خلاف، اسلام نے ان دونوں کو نہایت خوبی سے جمع کیا ہے۔ یعنی اصول محنت کو بطور بنیاد قائم رکھا کیونکہ اس کے بغیر چارہ نہ تھا اور مساوات دولت کے لیے کئی ایک قانون بنا دیئے۔ جیسے زکوٰۃ کا اصول کہ جمع شدہ دولت کا چالیسواں حصہ ہر سال لازماً غربا کو دیا جائے۔ یا جیسے تقسیم ورثہ کا اصول کہ روپیہ ایک جگہ جمع ہو کر ایک شخص کی موت کے ساتھ تقسیم ہوتا رہے۔ ایسا ہی یہ اصول سود کی حرمت کا ہے کہ اس کی رو سے اغنیاء سے غربا کو مدد ملتی رہتی ہے۔

بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تو آپ نے اسے پڑھ کر سنایا۔ **پھر شراب کی تجارت کو منع فرمایا۔** یہ اس لیے کہ ﴿اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ﴾ میں بے شک ہر قسم کی تجارت جائز ہے مگر وہ تجارت جائز نہیں

اللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۷۶﴾

ناشکرگزار گنہگار کو پسند نہیں کرتا۔(353)

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۷﴾

جولوگ ایمان لاتے اور اچھے کام کرتے ہیں اور نماز کو قائم کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں ان کے لیے ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان کو کوئی ڈر نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔(354)

جو کسی حکم الٰہی کی خلاف ورزی میں معاون ہو۔

353- يَمْحَقُ۔ مَحَقٌ نقصان کو کہتے ہیں اور مَحَقَهُ کے معنی ہیں ایک چیز کو گھٹا دیا اور اس کو بے برکت کر دیا۔

كُفَّارٌ۔ كَفَرَ سے كُفُوْرٌ اور كَفَّارٌ مبالغہ کے صیغے آئے ہیں اور كَافِرٌ کی جمع كُفَّارٌ ہے۔ كُفَّارٌ کفر پر اصرار کرنے والا ہے گویا وہ خدا کے حکم کے مقابلہ پر حلت ربا پر مصر ہے۔

اَثِيْمٌ۔ اَثِمَ سے مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی وہ باوجود عقیدہ حرمت کے گناہ میں پڑتا ہے۔

یہاں بیان فرمایا کہ سود سے بے برکتی پیدا ہوتی ہے اور صدقات سے برکت پیدا ہوتی ہے۔ مسند امام احمد میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: [إِنَّ الرِّبَا وَإِنْ كَثُرَ فَإِنَّ عَاقِبَتَهُ تَصِيْرُ إِلٰى قُلٍّ] (مسند احمد، جلد8، صفحہ354، حدیث: 3827) یعنی ''سود گو بہت ہو جائے مگر انجام اس کا کمی کی طرف ہوتا ہے۔'' اور صدقات کے متعلق بخاری میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

''جو شخص ایک کھجور کے برابر پاک کمائی سے صدقہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ پاک مال کے سوائے قبول نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ اس کو اپنے دائیں ہاتھ سے قبول کرتا ہے پھر اس کو اس کے دینے والے کے لیے بڑھاتا ہے جیسے تم میں سے کوئی اپنے بچھیرے کو پالتا ہے یہاں تک کہ وہ ایک پہاڑ کی مانند ہو جاتا ہے۔'' (كتاب الزكوٰة)

قوم کا مال کس طرح بڑھتا ہے:

ان باتوں کی صداقت پر واقعات عالم شاہد ہیں کسی قوم کی دولت یوں نہیں بڑھتی کہ اس میں سے چند لوگوں کے صندوقوں میں بے شمار روپیہ پڑا ہو بلکہ قومی دولت بڑھی ہوئی اس وقت سمجھی جائے گی جب ہر ایک شخص کو اس دولت سے فائدہ پہنچ رہا ہو۔ اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ سود خواری اس کے منافی اور صدقات اور صرف صدقات ہی اس کے معاون ہیں۔

354- جب ان لوگوں کا ذکر کیا جو احکام الٰہی کی اعتقاداً یا عملاً نافرمانی کرتے ہیں اور فرمایا کہ ایسے لوگ خدا کے محبوب نہیں ہو سکتے تو ساتھ ہی تقابل کے طور پر نیکیوں کا ذکر کیا اور اعمال صالحہ کے دو ارکان نماز اور زکوٰۃ کا خصوصیت سے ذکر کیا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷۸﴾

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ کا تقویٰ کرو، اور جو کچھ سود سے باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو، اگر تم مومن ہو۔ (355)

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ۚ وَ اِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۹﴾

پھر اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ لڑائی کے لیے خبردار ہو جاؤ اور اگر تم توبہ کر لو تو تمہارے لیے تمہارے اصل مال ہیں، نہ تم نقصان پہنچاؤ اور نہ تمہیں نقصان پہنچایا جائے۔ (356)

355- **بقایا سود کا ترک کرنا حجۃ الوداع کا خطبہ:** یہاں یہ حکم دیا ہے کہ جب حرمت سود کا حکم نازل ہوا یا جب کوئی شخص توبہ کر کے حکم الٰہی کی فرمانبرداری کی طرف رجوع کرتا ہے تو جو کچھ سود وغیرہ اس وقت باقی ہے اسے چھوڑ دے۔ حجۃ الوداع میں نبی کریم ﷺ نے جو خطبہ پڑھا تھا اس میں اور امور میں یہ بھی ذکر تھا کہ جس قدر جاہلیت کے سود کی رقمیں تھیں وہ سب موقوف کی جاتی ہیں یعنی اب قابل وصول نہ ہوں گی۔ اور فرمایا کہ پہلا ربا جو موقوف کیا جاتا ہے وہ عباس بن عبدالمطلب کا ہے یعنی آپ کے چچا کا۔ یہ تعلیم کیوں مؤثر نہ ہو جس میں اصلاح گھر سے شروع کی جائے۔

356- اَذَنُوا۔ اَذِنَ سے ہے اَذِنَ کے اصل معنی سنا ہیں (کیونکہ اُذن کان کو کہتے ہیں) اور پھر اس کا استعمال اس علم پر بھی ہوتا ہے جو سننے سے حاصل ہو اور بالآخر مطلق علم پر بھی کیونکہ اکثر علم سننے سے حاصل ہوتا ہے۔ (غ) ابن جریر نے اَذَنُوْا کے معنی کیے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ علم پالو اور ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اِسْتَيْقِنُوْا معنی کیے ہیں یعنی یقیناً جان لو۔ (ج)

یہاں سود لینے کو اللہ اور اس کے ساتھ جنگ کرنا قرار دیا ہے۔ **بعض لوگوں نے ظاہر الفاظ کا تتبع کر کے یہ خیال کر لیا ہے کہ سود لینے والے کو قتل کر دینا جائز ہے۔ مگر یہ درست نہیں** اور نہ حدود شرعی میں اس کا کہیں ذکر آتا ہے۔ یہ الفاظ صرف تنبیہ و تہدید کے لیے ہیں۔ مال کی محبت بعض وقت انسان کو اندھا کر دیتی ہے اس لیے اس سے سختی کے ساتھ روکا ہے۔

سود کا روپیہ اشاعت اسلام پر خرچ کرنا:

یہاں سود لینے کو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کرنا قرار دیا ہے تو اس سے بطور اشارہ لطیفہ یہ استنباط ہو سکتا ہے کہ اگر انسان کے پاس کوئی ایسا روپیہ سود کا آ جائے جو اس نے سود حاصل کرنے کی نیت سے نہیں لیا یا جس میں کچھ شائبہ سود کا ہو تو اگر ایسے روپے کو اللہ اور اس کے رسول کے دشمنوں کے مقابلہ پر خرچ کر دیا جائے تو جائز ہے۔ اسی طرح جو لوگ بینکوں میں یا ڈاک خانوں میں روپیہ محض پس انداز کرنے کے لیے یا حفاظت کے لیے رکھوا دیتے ہیں ان کے لیے جائز ہے کہ سود کے روپے

وَ اِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ؕ وَ اَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸۰﴾

اور اگر مقروض تنگ دست ہو تو فراخی تک مہلت دینی چاہیے اور اگر تم خیرات کر دو تو تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔ (357)

وَ اتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۫ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾ ع 38 8 6

اور اس دن سے اپنا بچاؤ کرلو جس میں تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے، پھر ہر شخص کو جو اس نے کمایا پورا دیا جائے گا، اور انہیں نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ (358)

کو وصول کر کے اشاعت اسلام کے کام پر لگا دیں مگر اپنے کسی مصرف میں نہ لائیں۔ اسی طرح **جن ملازمین کو بونس کا روپیہ ملتا ہے اگر اس میں کچھ حصہ سود کا ہو تو تقویٰ کا طریق یہ ہے کہ سود کے روپے کو تبلیغ دین پر لگا دیں** یا جہاد میں صرف کر دیں۔ ایسا ہی اگر کوئی شخص بینک میں روپیہ محض اس غرض سے جمع کراتا ہے کہ اس کے پسماندگان کے لیے کچھ اندوختہ رہ جائے تو یہ بھی اس شرط پر جائز ہو سکتا ہے کہ اصل رقم کے علاوہ جو روپیہ ہے وہ اشاعت اسلام کے کام پر لگا دیا جائے۔ اگر کسی شخص کے پاس ناجائز کمائی کا روپیہ ہے اور وہ آئندہ اس طریق سے توبہ کرتا ہے اور مال مشتبہ کا الگ کرنا یا اصل حق داروں کو پہنچانا مشکل امر ہے تو اس کا بھی خیراتی کاموں پر لگا دینا جائز ہے۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ناجائز طریق پر روپیہ کما کر خیرات میں دیا جا سکتا ہے بلکہ یہ محض ایک حالت مجبوری ہے کہ روپے کو دوسری صورت میں تباہ کرنا پڑتا ہے، تو اس صورت میں بہتر ہے کہ اسے اشاعت اسلام پر یا کسی خیراتی کام پر لگا دیا جائے۔

357- نَظِرَةٌ۔ نَظَرَ سے ہے ڈھیل یا مہلت دینا۔

مَيْسَرَةٌ۔ يُسْرٌ عُسْرٌ کی ضد ہے۔ اور مَيْسَرَةٌ سے مراد یہاں غنیٰ ہے۔

تَصَدَّقُوْا۔ تَصَدَّقَ کے اصل معنی ہیں صدقہ دیا۔ لیکن جب انسان کا ایک حق ہو اور اسے وہ چھوڑ دے تو اس پر بھی تصدق بولا جاتا ہے۔ (غ)

احادیث میں بھی قرض دار کو معاف کر دینے یا ڈھیل دینے کی بڑی فضیلت بیان ہوئی ہے۔ یہاں یا حکم ہے اور اس کی فرمانبرداری ضروری ہے یا سفارش ہے اور خدا کی سفارش سے بڑھ کر کیا چیز مومن کو محبوب ہونی چاہیے۔ یہ وہ ہمدردی ہے جو اسلام سکھاتا ہے۔ مقروض تنگ دست ہو تو یا مہلت دو یا معاف ہی کر دو۔ آج کل کے قوانین کی طرح جیل خانہ میں نہیں بھجواتا۔

358- **آخری آیت جو آنحضرت ﷺ پر نازل ہوئی۔ آیات کی ترتیب آنحضرت ﷺ کے حکم سے:** اس آیت کے متعلق متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آخری آیت ہے جو نبی کریم ﷺ پر نازل ہوئی اور اس کا نزول آپ کی وفات سے چند ہی

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ؕ وَ لْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۪ وَ لَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَ لْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَ لْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَ لَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جب تم آپس میں مقرر وقت کے لیے قرض کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لو۔[359] اور چاہیے کہ تمہارے درمیان لکھنے والا عدل کے ساتھ لکھے اور لکھنے والا لکھنے سے انکار نہ کرے، جیسا اللہ نے اسے سکھایا۔ اور ضرور لکھ دے اور چاہیے کہ وہ جس پر حق ہے لکھائے، اور وہ اللہ اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرے، اور اس سے کچھ کمی نہ کرے۔

یوم پیشتر تھا۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ نے فرمایا: [اِجْعَلُوْهَا بَيْنَ آيَةِ الرِّبَا وَآيَةِ الدَّيْنِ] (تفسیر المنار، جلد3، صفحہ 89) یعنی ''اس کو آیت ربا اور آیت دین کے درمیان رکھ دو'' (آیت دَین آگے آتی ہے) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ ہر ایک آیت کا مقام خود بتاتے تھے اور بخاری کی یہ روایت جو ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ہے کہ آخری آیت جو آنحضرت ﷺ پر نازل ہوئی آیت ربا تھی، اس کے خلاف نہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے جس باب کے نیچے اس حدیث کو بیان کیا ہے وہ ﴿وَ اتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ﴾ ہے چونکہ ربا کا مضمون اس آیت پر ختم ہوتا ہے اس لیے اسی کو آیت ربا کہہ دیا ہے۔ مضمون ربا کا خاتمہ اس آیت پر کرنا اس طرف اشارہ ہے کہ یہ مال و دولت جس کی محبت کے لیے تم اپنے اخلاق کو تباہ اور روحانیت کو برباد کرتے ہو یہ انجام کار تمہارے کچھ کام نہیں آئے گی۔

359- تَدَايَنْتُمْ۔ دَيْنٌ قرضہ کو کہتے ہیں اور مُدَايَنَةٌ اس سے مفاعلہ ہے ایک دوسرے سے قرض کا معاملہ کرنا۔

حفاظت مال کی تعلیم:

پچھلے تین رکوعوں میں ایک طرف انفاق فی سبیل اللہ پر زور دے کر اور دوسری طرف سود کو حرام قرار دے کر مال کی محبت کی جڑ کاٹی ہے۔ تو اب یہ بھی بتا دیا کہ مال کی حفاظت کی کس قدر ضرورت ہے؟ یہاں تک کہ مال کی حفاظت کو ایک دینی حکم قرار دیا بلکہ ان لوگوں کو جو اپنے مال کی حفاظت نہیں کر سکتے سَفِيْهٌ قرار دیا۔ یہی اسلام کی سب سے بڑی خوبی ہے کہ انسانی قویٰ کے نشوونما میں اعتدال کے پہلو کو کبھی نظر انداز نہیں کرتا۔ مال سے محبت نہ کرنا، اخلاق فاضلہ کے لیے ضروری ہے مگر یہ نہیں کہ حقوق کی حفاظت نہ کی جائے کیونکہ مال سے انسان کے کام چلتے ہیں۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا﴾ [النسآء: 5:4] ''جن کو اللہ نے تمہارے لیے سہارا بنایا ہے۔'' اور جو شخص مال کی حفاظت نہ کرے گا وہ دوسروں کا محتاج ہو جائے گا اور احتیاج بھی اخلاق فاضلہ سے محروم کرتی ہے۔

فَاِنْ كَانَ الَّذِیْ عَلَیْهِ الْحَقُّ سَفِیْهًا اَوْ ضَعِیْفًا اَوْ لَا یَسْتَطِیْعُ اَنْ یُّمِلَّ هُوَ فَلْیُمْلِلْ وَلِیُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ وَ اسْتَشْهِدُوْا شَهِیْدَیْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ یَكُوْنَا رَجُلَیْنِ فَرَجُلٌ وَّ امْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰی ؕ وَ لَا یَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ وَ لَا تَسْـَٔمُوْۤا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِیْرًا اَوْ كَبِیْرًا اِلٰۤی اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ اَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَ اَدْنٰۤی اَلَّا تَرْتَابُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ

پھر اگر وہ شخص جس پر حق ہے کم عقل یا ضعیف ہو یا لکھوانے کی قابلیت نہ رکھتا، ہو تو اس کا ولی انصاف کے ساتھ لکھوائے۔ اور دو گواہ اپنے مردوں میں سے گواہی کے لیے بلا لیا کرو۔ پھر اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ان گواہوں میں سے ہوں جن کو تم پسند کرو، تاکہ اگر ایک بھول جائے تو ایک ان دونوں میں سے دوسری کو یاد دلا دے۔ اور گواہ جب بلائے جائیں انکار نہ کریں۔ اور اس کے وقت تک اسے لکھنے میں کاہلی نہ کرو تھوڑا ہو یا بہت۔ یہ اللہ کے نزدیک بہت انصاف کی بات ہے، اور گواہی کو بہت مضبوط رکھنے والی ہے، اور اس سے بہت قریب ہے کہ تم شک میں نہ پڑو، لیکن

لین دین کے معاملات چار طرح پر ہو سکتے ہیں:

① بیع العین بالعین لینے دینے کی دونوں چیزیں موجود ہوں۔ اس کو تجارت حاضرہ کے نام سے موسوم کیا ہے۔ قیمت دی اور چیز لی، تحریر کی ضرورت نہیں۔

② بیع الدین بالدین یعنی لینے دینے کی دونوں چیزیں موجود نہ ہوں۔ یہ فرضی بیع ہے جیسا آج کل تجارت کے رنگ میں جوا کھیلا جاتا ہے جسے سٹہ کہتے ہیں۔ اسے اسلام نے منع کیا ہے۔

③،④ [بَیْعُ الْعَیْنِ بِالدَّیْنِ] یا [بَیْعُ الدَّیْنِ بِالْعَیْنِ] یعنی ایک چیز موجود نہ ہو اور دوسری ہو یہی مداینہ ہے۔ اس میں حکم ہے کہ ایسے معاملات کو لکھ لیا کرو اور گواہ بھی رکھ لیا کرو تا جھگڑے کم ہوں۔

عرب اُمّی قوم تھی۔ معاملات سادہ رنگ کے تھے ان میں لکھنے کا رواج نہ تھا۔ کاغذ بھی کمیاب تھا۔ **ایسی قوم کو تحریر معاملات کا اتنا مؤکد حکم بتاتا ہے کہ اس میں مسلمانوں کے ایک عظیم الشان متمدن قوم بننے کا اشارہ تھا۔** اس لیے اس قوم کی بنیاد ہی ایسی رکھی کہ آئندہ ضرورتوں کا سامان پہلے سے کر دیا۔

تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ؕ وَ اَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۪ وَ لَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّ لَا شَهِيْدٌ ؕ وَ اِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَ يُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۲﴾

اگر نقد سودا ہو جس کو تم آپس میں لیتے دیتے ہو تو پھر تم پر کوئی گناہ نہیں کہ اسے نہ لکھو۔ اور جب خرید و فروخت کرو تو گواہ رکھ لیا کرو، اور نہ لکھنے والے کو نقصان پہنچایا جائے اور نہ گواہ کو۔ اور اگر تم (ایسا) کرو گے تو یہ تمہاری طرف سے نافرمانی ہوگی اور اللہ کا تقویٰ کرو، اور اللہ تم کو سکھاتا ہے اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ (360)

360- ﴿كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ﴾ میں كَمَا کے معنی لِاَجْلِ کے بھی ہو سکتے ہیں یعنی اس لیے کہ اللہ نے اسے سکھایا اور ''ك'' بمعنی مثل بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی جس طرح اللہ نے اسے سکھایا۔ کاتب کے سیکھنے کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا۔ کیونکہ اسی نے انسان کو استعداد دی اور اسی نے سامان مہیا کیے۔

بِالْعَدْلِ۔ اس سے یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ کسی فریق کی طرف میلان نہ ہو اور یہ بھی کہ کتابت میں عدل ہو یعنی ایسی کتابت ہو جس پر وثوق کیا جا سکے۔ (ر) پس ہر شخص کتابت کا اہل نہیں۔ یوں **وثیقہ نویسی** کو ایک فن قرار دیا ہے۔

يُمْلِلِ۔ مَلَّ کے اصل معنی ملال ہونے کے ہیں۔ (ل) حدیث میں ہے: [فَإِنَّ اللهَ لَا يَمَلُّ حَتّٰى تَمَلُّوْا] (صحيح البخاري، كتاب التهجد، باب مَا يُكْرَهُ مِنَ التَّشْدِيدِ فِي الْعِبَادَةِ: 1151) (وہ عمل اختیار کرو جس کی طاقت رکھتے ہو کیونکہ) اللہ ملول نہیں ہوتا یہاں تک کہ تم ملول ہو جاتے ہو۔ ملول ہونا انسان کے لیے ہے خدا کے لیے نہیں۔ اور [اَمْلَلْتُ الْكِتَابَ] اور [اَمْلَيْتُ الْكِتَابَ] کے ایک ہی معنی ہیں اسے کاتب پر ڈالا (یعنی بول کر) تا کہ وہ اسے لکھ لے۔ (ل) قرآن شریف میں دوسری جگہ اِمْلَاءٌ آتا ہے ﴿فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا﴾ [الفرقان: 5:25] ''سو وہ اس پر صبح اور شام پڑھی جاتی ہیں۔'' اور لفظ مِلَّةٌ بمعنی مذہب بھی [مَلَلْتُ الْكِتَابَ] سے ہی اخذ کیا ہے ﴿الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ﴾ جس شخص پر حق قائم ہو رہا ہے وہ لکھوائے۔ اس سے بہت سے مظالم کا سد باب ہوتا ہے جو آج ساہوکاروں کی طرف سے غریب مدیونوں پر ہو رہے ہیں جو چاہتے ہیں خود بہیوں میں لکھ لیتے ہیں۔

يَبْخَسْ۔ بَخْسٌ۔ ظلم کے طور پر کسی چیز کا کم کرنا۔ (غ)

سَفِيْهًا۔ [دیکھو نمبر: 25] جو لوگ اپنے اموال کو ٹھیک طرح سے خرچ کرنا یا اپنے حقوق کی حفاظت کرنا نہیں جانتے ان کو سَفِيْهٌ کہا ہے۔

ضَعِيْفًا۔ لڑکا ہو یا بہت بوڑھا۔

وَ اِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّ لَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَ لْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَ لَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ

اور اگر تم سفر میں ہو اور لکھنے والا نہ پاؤ تو (کچھ) با قبضہ گرو رکھ لیا جائے، پھر اگر تم میں سے ایک دوسرے کا اعتبار کرے تو جس کا اعتبار کیا گیا ہے چاہیے کہ وہ امانت کو ادا کرے، اور اللہ اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرے۔ اور گواہی کو نہ چھپاؤ،

﴿لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ﴾ اِمْلَاء نہ کرا سکنے کی کئی وجوہ ہو سکتی ہیں۔ گونگا ہو، زبان سے ناواقف ہو، کوئی اور عارضہ ہو۔

﴿فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ﴾ دو گواہ مرد نہ ہوں۔ یعنی نہ ملیں یا نہ رکھنا چاہو۔

تَضِلَّ۔ طریق مستقیم سے عدول کا نام ضلال ہے عمداً ہو یا سہواً تھوڑا ہو یا بہت۔ (غ) چنانچہ محض نسیان یعنی بھول جانے پر بھی بولا جاتا ہے۔ (غ)

تُذَكِّرَ۔ اس کے معنی کیے ہیں۔ تُعِيْدُ ذِكْرَهُ (غ) یعنی اس کے ذکر کا اعادہ کر دے۔

حَاضِرَةٌ۔ موجود یعنی نقد تجارت۔

يُضَآرَّ۔ یہاں ضَرٌّ بمقابلہ نفع ہے۔ (غ) یعنی مالی نقصان نہ پہنچایا جائے جب شہادت میں بلایا جائے اس کو اس کی صنعت یا معاش کا عوضہ دیا جائے۔

باہم معاملات میں اصول قوانین:

اس ایک آیت میں ایک ترقی یافتہ قوم کی لین دین کی جملہ ضروریات کو مدنظر رکھا گیا ہے۔

اول: کاتبوں یا وثیقہ نویسوں کی ضرورت بتائی۔ وہ لکھنے سے انکار نہیں کر سکتے اور لکھانے والے کو معاوضہ دینا ضروری ہے۔

دوم: گواہ ہوں وہ گواہی دینے سے انکار نہیں کر سکتے۔ مگر جو ان کو بطور گواہ بلاتا ہے وہ ان کے کاروبار کے حرجہ کا معاوضہ دے۔

سوم: معاملہ کرنے والا بچہ ہو یا بوڑھا یا مال کی حفاظت نہ کر سکتا ہو یا کوئی اور امر مانع ہو تو اس کا ولی مقرر کیا جائے۔ غرض ایک ایک فقرہ میں ایک ایک قانون کی بنیاد قائم کر دی ہے آگے اس پر قانون بن سکتے ہیں۔

یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ **شہادت میں دو گواہوں کا ہونا بلحاظ حالات عامہ ہے**۔ عموماً دو گواہوں سے بات مضبوط ہو جاتی ہے۔ جھوٹ کی ملاوٹ کا احتمال کم ہو جاتا ہے۔ بیان کا جو حصہ ایک دوسرے کی تائید میں ہو وہ وزنی ہو جاتا ہے۔ یہ حکم نہیں کہ اگر ایک ہی گواہ ہو تو فیصلہ نہ کیا جائے یا قرائن کی شہادت پر فیصلہ نہ کیا جائے۔ بلکہ حضرت یوسف علیہ السلام کے معاملہ میں جہاں قمیص کے آگے یا پیچھے سے پھٹنے کا ذکر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بتا دیا کہ قرائن کی شہادت پر بھی فیصلہ ہو سکتا ہے۔

وَ مَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۳﴾ ع 39 2 7

اور جو شخص اسے چھپاتا ہے تو اس کا دل ضرور گنہگار ہوتا ہے، اور جو کچھ کرتے ہو اللہ اسے جانتا ہے۔ (361)

عورت کی گواہی:

اور ایک مرد کی جگہ جو دو عورتوں کی شہادت رکھی تو اس کی وجہ بھی خود ہی بتادی کہ عورتوں کو چونکہ معاملات لین دین سے واسطہ کم پڑتا ہے اس لیے ایسی باتوں کو شاید وہ اچھی طرح یاد نہ رکھ سکیں تو ایک کی کمی کو دوسری پورا کردے۔ اکیلی عورت کی شہادت نا قابل قبول ہونے کا ذکر کہیں نہیں۔ بلکہ لعان کے معاملہ میں جو وزن مرد کی چار مرتبہ شہادت کو دیا ہے۔ وہی وزن عورت کی چار مرتبہ شہادت کو دیا ہے گویا مرد اور عورت کی شہادت میں کوئی فرق نہیں کیا۔ ولادت، بکارت وغیرہ معاملات میں فقہاء نے بھی عورت کی شہادت کو پورا وزن دیا ہے۔

361- رِهَانٌ۔ رِهَنٌ کی جمع بھی ہے اور خود رِهَنٌ کی طرح مصدر بھی ہے اور وہ وہ چیز ہے جو بطور ضمانت قرض کے لیے رکھی جائے۔ (غ)

اَمَانَةٌ۔ اَمْنٌ اور اَمَانَةٌ اور اَمَانٌ اصل میں مصدر ہیں جن کے معنی نفس کی طمانیت اور خوف کا جاتے رہنا ہے اور اَمَانٌ اس حالت کا نام بھی ہے جس میں انسان ہو اور اس چیز کو بھی کہہ دیا جاتا ہے جس کے متعلق انسان کا اعتبار کیا جائے یا اسے امین سمجھا جائے۔ اسی معنی میں امانت ہے۔ (غ) اور یہاں جس چیز کے متعلق اعتماد کیا گیا ہے وہ قرضہ ہے پس اسی کو امانت کہہ دیا ہے۔

قرض کا معاملہ تحریر سے دو صورتوں میں مستثنیٰ کیا۔ **اول رہن با قبضہ کی صورت میں**۔ دوم اعتماد ہو۔

① رہن با قبضہ کا جواز تو یہاں صریح ہے۔ مگر آیا یہ مشروط سفر اور کاتب کے نہ ملنے سے ہے۔ یا جواز تو عام ہے اور یہاں صرف یہ توجہ دلائی ہے کہ اگر سفر وغیرہ میں کاتب نہ ملے تو تمہارے لیے ایک دوسری صورت بھی جائز ہے۔

② دوسری صورت کا صحیح ہونا جمہور کا مذہب ہے یعنی رہن با قبضہ بہر حال جائز ہے خواہ سفر میں ہو یا حضر میں، کاتب ملے یا نہ ملے۔ احادیث صحیحہ سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔

صحیحین میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے ہے: [اَنَّ رَسُولُ اللهِ ﷺ تُوُفِّيَ وَدِرْعُهُ مَرْهُونَةٌ عِنْدَ يَهُودِيٍّ بِثَلَاثِينَ صَاعًا مِّنْ شَعِيرٍ. رَهَنَهَا قُوْتًا لِأَهْلِه] (صحيح البخاري، كتاب الجهاد، باب مَا قِيلَ فِي دِرْعِ النَّبِيِّ ﷺ وَالْقَمِيصِ فِي الْحَرْبِ: 2916) یعنی رسول اللہ ﷺ فوت ہو گئے اور **آپ کی زرہ ایک یہودی کے پاس تیس وسق جو پر رہن تھی** جو آپ نے اپنے اہل کے گزارہ کے لیے لیے تھے۔ ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ نہ تو سفر میں تھے کیونکہ اہل کے گزارہ کا ذکر ہے اور نہ ہی کاتبوں کی آپ کے پاس کمی تھی۔ پس رہن با قبضہ کا جواز عام ہے۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کس طرح گزارہ کرتے تھے اور بیت المال سے کس قدر لیتے تھے؟ آپ وفات کے وقت عرب کے بادشاہ تھے۔ خراج کا لاکھ سے زیادہ درہم صرف بحرین سے آپ کے پاس آیا اور آپ نے مسجد کے

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ اِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ

اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، اور اگر تم ظاہر کرو جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے یا اسے چھپاؤ، اللہ اس کا تم سے حساب لے گا پھر وہ جس کو

صحن میں اسے رکھوادیا اور تب اٹھے جب تقسیم کر چکے۔ مال غنیمت سے ایک ایک کو سو سو اونٹ بھی دیئے۔ اپنی ذات کے لیے لیتے تو کون اعتراض کر سکتا تھا۔ مگر اپنی یہ حالت ہے کہ تھوڑے سے جو کے لیے اپنی زرہ گرو رکھی ہوئی ہے۔ جو لوگ آپ پر نفسانیت کا اعتراض کرتے ہیں کاش ان کے سینوں میں دل ہوتا۔

اس آیت سے اور احادیث سے جو اس بارہ میں مروی ہیں یہ بھی ثابت ہے کہ رہن با قبضہ ہی جائز ہے۔ **بلا قبضہ رہن جائز نہیں** اور وہ درحقیقت سود کی ایک صورت ہے۔ البتہ احادیث سے یہ ثابت ہے کہ رہن با قبضہ کی صورت میں مرہونہ چیز سے نفع اٹھانا جائز ہے۔ مثلاً گھوڑا رہن رکھا تو اس کو چارہ دیا جائے اور اس سے سواری کا کام لیا جائے۔ **جائداد غیر منقولہ کے رہن با قبضہ کا مسئلہ بھی** اس سے اخذ کیا جا سکتا ہے یعنی زمین یا مکان کا رہن با قبضہ جائز ہے۔ اور زمین کی پیداوار اور مکان کے کرایہ سے فائدہ اٹھانا بھی جائز ہے بشرطیکہ لگان یا اخراجات وغیرہ بھی ادا کیے جائیں۔ البتہ جو لوگ زمین یا مکان کو اپنے قبضہ میں نہیں لیتے اور مالک سے کچھ سالانہ منافع مقرر کر لیتے ہیں تو وہ صریح سود ہے۔

معاملہ دنیوی میں راستی کی اہمیت:

پہلے ذکر کیا تھا کہ گواہ انکار نہ کرے۔ اب یہ حکم دیا ہے کہ گواہی کو نہ چھپائے اور جو چھپائے اس کا دل گنہگار ہوتا ہے۔ دل گنہگار کہنے سے یہ منشا ہے کہ انسان ان لین دین کے معاملات کو معمولی نہ سمجھے جو شخص ان معاملات میں راستبازی سے کام نہیں لے سکتا وہ راستباز نہیں ہو سکتا۔ قلب چونکہ تمام نیکیوں کا مرکز ہے اس پر اثر پڑنے سے دوسری نیکیوں کی توفیق بھی چھن جاتی ہے۔ پس یہ سمجھا یا ہے کہ یہی چھوٹے چھوٹے معاملات ہی انسان کے قلب کو سفید یا سیاہ کر دیتے ہیں۔ جو شخص انسانوں کے باہم معاملات اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں صداقت کا طریق اختیار نہیں کرتا وہ نماز اور روزہ سے نیک نہیں بن سکتا۔

یہاں صرف **کتمان شہادت** کو اس قدر بُرا بتایا ہے یعنی سچی شہادت چھپانے کو۔ **تو جھوٹی شہادت کس قدر بڑا گناہ ہے؟** اگر سچی شہادت کا اخفا بھی انسان کے دل کو سیاہ کر دیتا ہے تو اس شخص کی کیا حالت ہوگی جو جھوٹی گواہی دیتا ہے اور ابھی وہ لوگ مسلمان کہلاتے ہیں جو آٹھ آٹھ آنے پر کچہریوں میں جا کر جھوٹی شہادتیں دیتے اور علاوہ اپنا قلب سیاہ کرنے کے اسلام کو بھی بدنام کرتے ہیں۔ یہی سیاہ دلی ان لوگوں کے حصہ میں بھی آئی ہے جو حکام کے سامنے جھوٹے واقعات بیان کرتے ہیں یا سچے واقعات کا اخفا کرتے ہیں محض اس لیے کہ حکام ان سے خوش ہو جائیں۔

وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۸۴﴾

چاہے بخش دے اور جس کو چاہے عذاب دے، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔[362]

362- یہ رکوع سورت کو ختم کرتا ہوا اس کے مضمون کا خلاصہ بیان کرتا ہے یعنی مذہب اسلام کی وسعت کہ سب رسولوں پر ایمان لاؤ اور کامیابی کی بشارت جو دعا کے رنگ میں ﴿فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ﴾ میں سکھائی۔ ابتدا میں فلاح کا وعدہ اور آخرت پر نصرت کی دعا ایک ہی بشارت دیتے ہیں۔

الفاظ ﴿اِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ﴾ **آیت کے آخر تک کو کئی مفسرین نے منسوخ قرار دیا ہے۔** ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بخاری میں دو روایتیں ان کی منسوخی کی ہے مگر ابن جریر کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما اس کی منسوخی کے قائل نہ تھے۔ چنانچہ ابن جریر میں ہے کہ سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اس آیت کو پڑھا تو بہت روئے۔ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس ذکر ہوا تو انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ ان پر رحم کرے اس کو پچھلی آیت نے منسوخ کر دیا۔ یہاں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کو منسوخی کا قائل قرار دیا گیا ہے۔ مگر ابن جریر کی دوسری روایت سے پایا جاتا ہے کہ سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما اس کی منسوخی کے قائل نہ تھے۔ اسی بنا پر خود ابن جریر نے اس کے منسوخ ہونے سے انکار کیا ہے۔

پھر سورہ آل عمران میں جو اس کے بعد ہے بعینہٖ ایسے الفاظ ہیں: ﴿قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ﴾ [آل عمران: 29:3] ''کہہ اگر جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے چھپاؤ یا اسے ظاہر کرو اللہ اسے جانتا ہے۔'' جہاں ﴿يَعْلَمْهُ اللّٰهُ﴾ سے وہی مراد ہے جو یہاں ﴿يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ﴾ سے ہے۔ اگر ان الفاظ کو ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ﴾ نے منسوخ کر دیا ہوتا تو دوبارہ اسی مضمون کے لفظ کیوں نازل ہوتے اور یہ روایت کہ اس آیت کے نزول پر صحابہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یہ ہماری طاقت سے باہر ہے تو آیت ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ﴾ نازل ہوئی۔ خود عدم نسخ کی مؤید ہے اس لیے کہ اس میں یہ لفظ کہیں نہیں آتے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہو کہ پہلی آیت منسوخ ہو گئی۔ ہاں یہ کہا جائے گا کہ دوسری آیت نے پہلی کے معنی واضح کر دیئے۔

نسخ کا استعمال صحابہ میں:

اور بتا دیا کہ وہ مراد نہیں جو بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے خیال کر لیا تھا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود فرما دیا کہ انسان کی وسعت سے بڑھ کر کوئی حکم نہیں دیا جاتا۔ معلوم ہوتا ہے اس قسم کی وضاحت معنی پر ہی صحابہ نسخ کا لفظ مجازاً استعمال کر لیتے تھے۔ جہاں سے ناسخ منسوخ کی غلط فہمی پیدا ہوئی۔ چنانچہ روح المعانی میں اسی کے مطابق خیال نقل کیا گیا ہے۔ [إِنَّ الْمُرَادَ مِنَ النَّسْخِ الْبَيَانُ وَإِيْضَاحُ الْمُرَادِ مَجَازاً] مسند احمد کی روایت اس معاملہ کو بالکل صاف کر دیتی ہے جس میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ جب یہ آیت ﴿اِنْ تُبْدُوْا...﴾ نازل ہوئی تو لوگوں کے دلوں میں ایک خیال گزرا جو پہلے کبھی نہ گزرا تھا (اور دوسری روایت میں ہے کہ وہ سخت مغموم ہوئے کہ ہم اس کی طاقت نہیں رکھتے۔) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: [قُولُوا:

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ

رسول اس پر ایمان لایا جو اس کے رب سے اس کی طرف اتارا گیا اور مومن (بھی)، سب اللہ اور اس کے فرشتوں اور

"سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَسَلَّمْنَا"، فَأَلْقَى اللهُ الْإِيمَانَ فِي قُلُوْبِهِمْ] (صحيح مسلم، كتاب الإيمان، باب قَوْلِهِ تَعَالَى (وَإِنْ تُبْدُوا مَا فِي أَنْفُسِكُمْ أَوْ تُخْفُوهُ): 345) یعنی ''کہو ہم نے سنا اور فرمانبرداری کی اور تسلیم کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ایمان ڈالا۔'' اور پھر ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ ...﴾ نازل ہوا جس سے معلوم ہوا کہ دوسری آیت کے نزول سے پہلے ہی وہ سمجھ چکے تھے اور ارشاد نبوی ﷺ [سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا] بتاتا ہے کہ یہ طاقت سے باہر کوئی چیز نہ تھی۔ پس یہ یاد رکھنا چاہیے کہ نسخ کا لفظ محض واضح کرنے کے معنی میں صحابہ رضی اللہ عنہم نے استعمال کیا ہے۔ گویا ایک غلط خیال جو کسی کے دل میں ان الفاظ سے پیدا ہوا وہ منسوخ ہوا۔ اصل الفاظ منسوخ ہونے کا منشا نہیں ہوتا۔

چھپی اور کھلی باتوں پر خدا کا محاسبہ:

اب معنی پر غور کرو تو اور بھی وضاحت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ منسوخ نہیں۔ ایک بات کو دل میں چھپاؤ یا اسے ظاہر کرو اللہ اس کے مطابق تم سے حساب لے گا۔ ظاہر ہے کہ دل میں وہ بات چھپائی جاتی ہے جس کا انسان عزم کر چکا ہو کہ میں ایسا کروں گا۔ پھر اس کو چھپاتا ہے کہ لوگوں پر ظاہر نہ ہو اور جو کوئی وسوسہ دل میں گزرے اور نکل جائے اس پر دل میں چھپانا صادق نہیں آتا۔ جن کو غلطی لگی وہ یہی لگی کہ انہوں نے سمجھا کہ جو خیال دل میں گزرے اس پر محاسبہ ہوگا۔ حالانکہ یہ مراد نہ تھی جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے [قُولُوْا: "سَمْعًا وَّطَاعَةً] سے سمجھا دیا اور ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ﴾ نے اس کی مزید توضیح کر دی۔ اس کی تائید دوسرے مقامات سے ہوتی ہے جہاں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ گرفت اس پر کرتا ہے جو دل کر گزرے اور محض خیال یا وسوسہ پہلے سے مستثنیٰ ہے جیسا کہ سورۃ النجم میں ہے ﴿اِلَّا اللَّمَمَ﴾ [النجم: 32:53] ''سوائے اس کے کہ خیال دل میں گزرے۔'' اور دل کا کر گزرنا پختہ طور پر ٹھان لینا ہے۔ جیسا فرمایا ﴿بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ﴾ [البقرة: 225:2] ''جو تمہارے دلوں نے کمایا ہے۔'' اور ﴿مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ﴾ [الاحزاب: 5:33] ''جو تمہارے دل عمداً کریں۔'' اور پھر محاسبہ بھی ہر ایک فعل پر برابر نہیں ﴿فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ میں خود بتا دیا کہ بہتیری باتیں اللہ تعالیٰ معاف بھی کرتا رہتا ہے۔ اسی کے مطابق صحیحین میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''جب بندہ بدی کا قصد کرے تو اس کے خلاف نہ لکھو اگر وہ فعل کر دے تو اس کو ایک بدی لکھو۔ اور جب وہ نیکی کا قصد کرے تو وہ نیکی عمل میں نہ آئے تو اسے ایک نیکی لکھو اور اگر عمل میں آ جائے تو دس نیکیاں لکھو۔'' یہ وسعت رحمت ہے۔

آیت کے پہلے حصہ میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اور دوسرے میں علم کامل کا ذکر ہے اور یہی دو چیزیں ہیں جن سے جزا و سزا پر ایمان پیدا ہوتا ہے۔

كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ ۫ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۫ وَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا ۫ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸۵﴾

اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں ہم اس کے رسولوں میں سے کسی میں کچھ تفرقہ نہیں کرتے، اور کہتے ہیں ہم نے سنا اور ہم نے فرمانبرداری کی۔ اے ہمارے رب تیری حفاظت (چاہیے) اور تیری طرف ہی انجام کار پہنچنا ہے۔[363]

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ

اللہ کسی پر کچھ لازم نہیں کرتا مگر جس قدر اس کی طاقت ہو، اسی کے لیے ہے جو وہ (اچھی) کمائی کرے۔[364] اور

363- غُفْرَانَكَ۔ غُفْرَانٌ۔ غَفَرَ سے مصدر ہے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 258] نیز [نمبر: 365]۔ تقدیر یوں ہے: [نَسأَلُكَ غُفْرَانَكَ]۔

سب انبیاء پر ایمان:

اس سورت کے شروع میں وسعت اسلامی کی طرف توجہ دلائی ﴿يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾۔ درمیان میں بھی جہاں فرمایا کہ ہم صرف ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ علیہم السلام پر ہی ایمان نہیں لاتے بلکہ جو کچھ بھی دنیا میں کہیں نبیوں کو دیا گیا اس کو بھی مانتے ہیں ﴿وَ مَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ﴾ [136] اور اب پھر اور ﴿مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ کی تفسیر ﴿مَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ﴾ [البقرة: 136:2] ''جو نبیوں کو اپنے رب کی طرف سے دیا گیا'' سے کر دی یعنی ما انزل میں صرف وہی چیز ہے جو نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے دی گئی۔ کیونکہ وحی الٰہی غیر انبیاء کو بھی ہوتی ہے جیسا کہ قرآن شریف میں کئی جگہ ذکر ہے اور پھر دونوں کی تفسیر یہاں لفظ كُتُبِهٖ لا کر کر دی یعنی وہ ﴿مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ اور ﴿مَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ﴾ اللہ تعالیٰ کی کتابیں ہیں جو ان نبیوں کو دی گئیں اور اسی طرح ﴿كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ﴾ کی تفسیر ﴿مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ سے کر دی کہ وہ کتابیں اور رسول وہی ہیں جو تجھ سے پہلے دنیا میں ہو چکے بعد میں ہونے والا کوئی نہیں۔ **اگر آپ کے بعد بھی رسول آنے والے ہوتے تو ﴿مِنْ قَبْلِكَ﴾ کی حد بندی عائد نہ کی جاتی۔**

364- يُكَلِّفُ۔ كَلَّفَ سے ہے كَلَّفَهُ کے معنی ہیں اس کو ایسا حکم دیا جو اس پر مشقت ہے۔ (غ)

اِلَّا وُسْعَهَا۔ وُسْعٌ کے معنی فراخی بھی ہیں اور قدرت یا طاقت بھی جو مکلف کے اندازہ سے بڑھ کر ہو۔ (غ)

مشقت سے راحت پیدا ہوتی ہے:

صورت ثانی میں معنی یوں ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے پر اس سے کم مشقت ڈالتا ہے جس سے اس کی طاقت درماندہ

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ
اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَ لَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا
كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا
وَ لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ
عَنَّا ۟ وَ اغْفِرْ لَنَا ۟ وَ ارْحَمْنَا ۟ اَنْتَ

اسی پر ہے جو وہ (بری) کمائی کرے۔ اے ہمارے رب! ہم کو نہ پکڑ اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں۔ اے ہمارے رب! اور ہم پر بھاری بوجھ نہ ڈال جیسا تو نے ان پر ڈالا جو ہم سے پہلے تھے۔[365] اے ہمارے رب! اور ہم پر ایسا بوجھ نہ رکھ جس کی طاقت ہم میں نہیں اور ہمیں معاف فرما اور ہماری حفاظت فرما،[366] اور ہم پر رحم

ہوجائے۔ اور صورت اول میں یوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ پر جو مشقت ڈالتا ہے اس کا پھل وسعت ہوتا ہے یا جنت۔ (غ) یعنی جو باتیں تکلیف یا مشقت کی معلوم ہوتی ہے انہی سے فی الحقیقت انسان کے لیے وسعت پیدا ہوتی ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا﴾ [الإنشراح: 6:94] ''تو تنگی کے ساتھ آسانی ہے۔'' یا فرمایا: ﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَ لَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ [البقرة: 185:2] ''اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے اور تمہارے لیے تنگی نہیں چاہتا۔''

كَسَبَتْ۔ اِكْتَسَبَتْ۔ گو كَسَبَ اور اِكْتِسَابٌ دونوں بھلائی اور برائی پر استعمال ہوتے ہیں مگر یہاں كَسَبَ بھلائی کے لیے اور اِكْتِسَابٌ برائی کے لیے ہے جیسا لَهَا اور عَلَيْهَا سے ظاہر ہے۔ اصل فرق دونوں میں یہ ہے کہ كَسَبَ اپنے لیے بھی ہوسکتا ہے اور اپنے غیر کے لیے بھی اور اِكْتِسَابٌ صرف اپنے لیے ہوتا ہے۔ اس لیے بعض کے نزدیک كَسَبَتْ سے مراد وہ افعال ہیں جو فعل خیر سے انسان دوسرے کے لیے کرتا ہے اور اِكْتَسَبَتْ سے مراد وہ افعال ہیں جو اپنی ذات کے لیے کرتا ہے۔ گویا جو کچھ دوسرے کی بھلائی کو مدنظر رکھ کر کیا جائے وہ بہرحال لَهَا ہے یعنی بموجب نفع اور جو کچھ اپنے آپ کو مدنظر رکھ کر کرتا ہے وہ عَلَيْهَا ہے یعنی وبال کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

365- تُؤَاخِذْنَآ۔ گناہ کی سزا پر لفظ مُؤَاخَذَةٌ جو اَخَذَ سے مفاعلہ ہے اس لیے اختیار کیا گیا کہ اس میں مجازات اور مقابلہ کے معنی ہیں۔ کیونکہ انہوں نے نعمتوں کو اللہ تعالیٰ سے لیا پھر ان کے مقابلہ پر شکر نہ کیا۔

اِصْرٌ کے اصل معنی بوجھ اور مضبوط باندھ دینا پھر کسی عہد کا گناہ جب اس سے ضائع کر دیا جائے یعنی عہد شکنی کا گناہ۔ (ل) اور حدیث میں بادشاہ کے متعلق آتا ہے کہ وہ زمین پر ظل اللہ ہے جب اچھا کرے تو اس کے لیے اجر اور تم پر شکر ہے اور جب برا کرے تو اس پر اصر ہے۔ (ل) یعنی اس عہد کے توڑنے کا گناہ جو سلطان اور رعایا کے درمیان ہے۔

366- اغْفِرْ۔ یہاں اور قرآن شریف کے بہت سے موقعوں پر غَفَرَ کے معنی خصوصیت سے گناہ سے محفوظ کرنا ہیں [دیکھو نمبر: 258]۔ کیونکہ گناہ کی سزا سے بچانے کا ذکر ﴿وَاعْفُ عَنَّا﴾ میں موجود ہے۔ پہلا مرتبہ گناہوں کی سزا سے بچانے کا تھا اس کا ذکر عَفْوٌ میں ہے۔ دوسرا مرتبہ خود گناہ سے بچانے کا ہے اس کا ذکر غَفَرَ میں ہے اور اسی لیے عَفْوٌ کو پہلے مرتبہ پر اور غَفَرَ کو دوسرے پر

40 ع 3/8 مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۶﴾ فرما تو ہمارا مولیٰ ہے۔ پس ہمیں کافر قوم پر مدد دے۔ (367)

رکھا۔ اور جہاں کہیں **قرآن شریف میں عَفْوٌ اور غَفَرَ کا ذکر اکٹھا آیا ہے** عَفْوٌ کو پہلے رکھا ہے کیونکہ وہ ادنیٰ مرتبہ ہے اور غَفَرَ کو پیچھے۔ بلکہ جہاں جہاں اللہ تعالیٰ کی صفات عَفُوٌّ اور غَفُوْرٌ کو اکٹھا کیا ہے وہاں بھی عفو کو پہلے اور غَفُوْرٌ کو پیچھے رکھا ہے دیکھو [النسآء: 43:4, 99]، [الحج: 60:22]، [المجادلة: 2:58] وغیرہ مقامات اور یہ یقینی شہادت اس بات پر ہے کہ قرآن شریف نے لفظ غَفَرَ سے مراد عَفْوٌ سے بڑھ کر کچھ لیا ہے اور چونکہ عَفْوٌ گناہوں کو مٹانے کا نام ہے یعنی ان کی سزا سے درگزر کرنا اس لیے غَفَرَ سے ان موقعوں پر صرف گناہوں سے بچانا ہے جیسا کہ [نمبر: 258] میں لغت کی شہادت سے دکھایا گیا ہے۔ اس جگہ اول عَفْوٌ ہے دوم غَفَرَ سوم رَحِمٌ اور یہ تینوں لفظ تین پہلے جملوں کے مقابل پر ہیں۔ یعنی ﴿لَا تُؤَاخِذْنَآ﴾ یا مؤاخذہ سے بچنے کے مقابل پر عفو کی دعا ہے۔ گناہ یا عہد شکنی کے ارتکاب سے بچنے کے مقابل پر غَفَرَ یعنی گناہ سے حفاظت کی دعا ہے۔ اور بوجھوں سے بچنے کے مقابل پر رحم کی درخواست ہے۔ اسی طرح ﴿فَاعْفُ عَنْهُمْ وَ اسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ﴾ [آل عمران: 159:3] ''پس ان کو معاف کر اور ان کے لیے بخشش مانگ اور معاملات میں ان کا مشورہ لے۔'' میں ان لوگوں سے جو جنگ میں بھاگ گئے تھے پہلے عَفْوٌ کا حکم ہے پھر ان کے لیے استغفار کا حکم ہے یعنی آئندہ ایسے گناہوں سے بچے رہیں۔ پھر ان کو مشورہ میں شریک کرنے کا حکم ہے جو ان کی اور بھی زیادہ عزت افزائی پر دلالت کرتا ہے۔ پس عَفْوٌ اور غَفَرَ جہاں اکٹھے ہوں وہاں غَفَرَ سے مراد گناہ سے حفاظت ہے نہ کچھ اور۔

367- سورہ بقرہ کی آخری دو آیات کی احادیث میں بہت فضیلت آئی ہے۔ بخاری میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص سورہ بقرہ کی دو آخری آیات کو ایک رات میں پڑھے وہ اس کے لیے کافی ہو جاتی ہیں۔ مسند احمد میں ہے کہ خواتیم سورہ بقرہ آپ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دی گئیں۔ مسلم اور نسائی میں ہے کہ آپ کو بشارت دی گئی کہ فاتحہ اور خواتیم بقرہ دو ایسے نور ہیں کہ آپ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دیئے گئے۔ فاتحہ کی عظمت کا ذکر پہلے ہو چکا۔ ان دو آیتوں کو یہ عظمت حاصل ہے کہ اگر ایک میں مسلمان کے مذہب اور اس کے قلب کی وسعت بتائی گئی کہ وہ سب انبیاء پر ایمان لاتا اور کسی کو اپنا دشمن نہیں سمجھتا تو دوسری میں اسے یہ دعا سکھائی گئی کہ وہ کبھی کفر اور باطل پر راضی نہیں ہوتا بلکہ اس پر غالب آنے کے لیے ہمیشہ دعا کرتا رہتا ہے۔ آج بھی مسلمانوں کو ضرورت ہے کہ اس دعا سے کام لیں۔

خاص اس دعا میں تین باتیں ہیں:

① اول انسان کے عجز کا پہلو کہ **نسیان اور خطا** اس سے واقع ہو جاتا ہے تو دعا سکھائی کہ اس پر گرفت نہ ہو۔ ایسی دعا انسان کو متنبہ کرتی ہے کہ وہ غافل نہ ہو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ احکام الٰہی کو بھول جائے اور احکام الٰہی کی فرمانبراری میں بہت محتاط اور چست ہو تا کہ خطا سے بچا رہے اور جو نسیان و خطا باوجود کوشش کے واقع ہو جائے اس کے نتائج سے حفاظت سکھائی ہے۔

② دوسری دعا ہے کہ **عہد شکنی** کے بوجھ سے بچایا جائے یعنی اس قدر مخالفت احکام الٰہی کی نہ ہو کہ عہد کو توڑ ڈالے جس طرح پہلی قومیں توڑتی رہیں۔ اگر پہلی غفلت وعجز کے بدنتائج سے بچنے کی دعا ہے تو دوسری عمد کے بدنتائج سے۔

③ اور تیسری دعا یہ ہے کہ ہم پر وہ بوجھ مصائب **قضاوقدر** کا نہ ڈالا جائے جس کے اٹھانے کی ہم میں طاقت نہ ہو۔ تکالیف شرعی تو اللہ تعالیٰ وسعت سے بڑھ کر نہیں ڈالتا مگر مصائب قضاوقدر انسان پر بعض وقت ایسے آجاتے ہیں کہ ان کے بوجھ کے نیچے پس جاتا ہے۔ پس ان سے بچنے کی دعا سکھائی ہے۔ ان تینوں کے مقابل پر پھر **تین دعائیں** سکھائیں ہیں۔ **نسیان وخطا** کے بالمقابل عَفْوٌ کی درخواست یعنی یہ کہ نسیان وخطا انسان کی عاجزی سے واقع ہوتے رہتے ہیں ان کے بدنتائج سے بچایا جائے اور عہد شکنی کے بوجھ سے بچنے کے مقابل پر دعائے غفر (حفاظت) یعنی دیدہ دانستہ انسان سے کوئی گناہ سرزد نہ ہو اور قضاوقدر کے مصائب کے مقابلہ پر رحم کی درخواست اور ان سب کا آخری مقصد کیا ہے کہ کافر قوم کے خلاف اللہ تعالیٰ کی نصرت ملے۔

سورت کی غرض وغایت مسلمانوں کو ایک زندہ اور کامیاب قوم بنانا:

سورۃ کا خاتمہ اس پاک دعا پر کیا ہے جس میں سورۃ کی غرض وغایت بھی بتادی ہے جس طرح اس کی ابتدا میں۔ یعنی یہ کہ یہ سورت مسلمانوں کو کامیابی کی راہ بتاتی ہے۔ شروع میں وعدہ کامیابی دیا تھا۔ پھر کامیابی کے ذرائع اور وسائل بیان کیے کہ ان کو اختیار کرو اور آخر پر دعا کی طرف متوجہ کیا کہ جو راہیں بتائیں ہیں ان پر چلو، پھر خدا سے بھی دعائیں کرو۔ اس سورت کی غرض مسلمانوں کو ایک زندہ اور کامیاب قوم بنانا اس کے ایک ایک لفظ سے ظاہر ہوتی ہے۔

سورۃ آل عمران

نام:

اس سورت کا نام آل عمران ہے۔عمران حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے والد کا نام ہے اور چونکہ اس سورت میں نبوت کے سلسلہ موسویہ سے رخصت ہونے کا ذکر ہے اور اس سلسلہ کے آخری نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے پیروؤں کی غلطیوں کا بالتفصیل ذکر ہے، اس مناسبت کے لحاظ سے اس کا نام آل عمران رکھا گیا۔اس میں 20 رکوع اور 200 آیتیں ہیں۔

خلاصہ مضمون:

اس سورت میں عیسائی مذہب کے دعووں کی تردید ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ بتا کر کہ عالمگیر مذہب اسلام ہے جو ساری دنیا میں پھیلے گا۔ جنگ اُحد کا ذکر کیا ہے جس میں بظاہر مسلمانوں کی ناکامیابی نظر آتی تھی مگر اس کی تہ میں بھی ایک عظیم الشان کامیابی تھی۔غرض یہ ہے کہ اگر کفر کے مقابلہ میں اسلام کی حالت کسی وقت مصیبت اور درماندگی کی نظر آئے تو اس سے مایوس نہ ہونا چاہیے۔فی الواقع جو حالت جنگ اُحد میں مسلمانوں کی قریش کے مقابل پر ہوگئی تھی ویسی ہی حالت آج عیسائیت کے مقابلہ میں ہے یعنی بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کچلا گیا مگر اس بلا کے نیچے بھی ایک گنج کرم ہے۔

① پہلے رکوع میں عقیدہ الوہیت مسیح کی تردید کرتے ہوئے بتایا ہے کہ عیسائیوں کو ٹھوکر اس سے لگی کہ انہوں نے محکم اصول دین کو چھوڑ کر متشابہات کی پیروی کی اور یہ ذکر ایسے پیرایہ میں کیا ہے جس سے مسلمانوں کو بھی ساتھ ہی متنبہ کر دیا ہے کہ وہ قرآن کریم کے معنی کرنے میں اس غلط راہ پر قدم نہ ماریں۔ بلکہ فروع کو اصول دین کے ماتحت کریں جن کا ذکر محکم الفاظ میں ہے برخلاف فروع کے جن کا ذکر متشابہ الفاظ میں بھی آجاتا ہے۔

② دوسرے رکوع میں یہ بتاتے ہوئے کہ جنگ بدر میں قدرت خداوندی کا ایک نظارہ تھا کہ کس طرح باطل اپنی ساری طاقتوں کے ساتھ حق کے سامنے مغلوب ہوجاتا ہے۔توحید الٰہی کو جسے عیسائیوں نے چھوڑ دیا سب مذاہب کی اصل بنیاد قرار دیتے ہوئے ضمناً پیش گوئی کی ہے کہ آخر کار توحید ہی غالب رہے گی۔

③ تیسرے رکوع میں بیان فرمایا کہ نبوت بنی اسرائیل کی قوم سے سلب ہوتی ہے اور ایک دوسری قوم کو دی جاتی ہے جو اس کی اہل ہے۔

④ چوتھے رکوع میں سلسلہ موسوی کے آخری برگزیدہ افراد کا ذکر فرمایا یعنی زکریا علیہ السلام اور ان کے فرزند یحییٰ علیہ السلام کا اور مریم صدیقہ علیہا السلام کا۔

⑤،⑥ پانچویں اور چھٹے رکوع میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش، بچپن، بڑھاپے، نبوت، تعلیم، نشانات، وفات وغیرہ کا ذکر کر کے بتایا کہ وہ کسی بات میں انسان سے بڑھ کر نہیں اور دلائل کو پس پشت پھینکنے والوں کو مباہلہ کی طرف بلایا۔

⑦ ساتویں رکوع میں انہی عیسائیوں کو اصول مقابلہ مذاہب کی طرف بلایا یعنی سب مذاہب میں امر مشترک خالص توحید الٰہی ہے۔ پس اس کو قبول کرو۔ اس کے ساتھ ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کیا جن کا وجود عیسائیوں، یہودیوں، مشرکین عرب اور مسلمانوں میں بطور مشترک مسلم تھا۔

⑧ آٹھویں رکوع میں مثیل موسیٰ والی پیشگوئی کی طرف توجہ دلائی اور اہل کتاب کو ملزم کیا کہ تم دنیا کی امانتوں کی پروا نہیں کرتے اسی لیے خدا کی امانت کو بھی جو پیشگوئی کے رنگ میں تھی ضائع کر رہے ہو۔

⑨ نویں رکوع میں بتایا کہ موسیٰ علیہ السلام ہی نہیں کل انبیائے عالم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کی پیشگوئیاں کی تھیں، اسی لیے مذہب اسلام سب کا مصدق ہے۔

⑩ دسویں رکوع میں بتایا کہ یہ نبی ہی سب انبیاء کا موعود نہیں بلکہ خانہ کعبہ جو اس کا قبلہ ہے وہ دنیا میں خدا کی عبادت کا سب سے پہلا گھر ہے۔

⑪ گیارھویں رکوع میں بتایا کہ اس خیر وخوبی کے مذہب کو دنیا میں پھیلانے کے لیے مسلمان کس طرح کامیاب ہو سکتے ہیں؟ حقوق کی نگہداشت کریں، وحدت اسلامی کو قائم کریں، دعوت الی الاسلام کے کام کو ترک نہ کریں۔

⑫ بارھویں رکوع میں بتایا کہ دشمنان اسلام سے کیسے تعلقات ہوں۔

⑬ تیرھویں رکوع میں جنگ احد کی ابتدا اور نصرت الٰہی کے وعدہ کا ذکر کیا۔

⑭ چودھویں میں کامیابی کے موٹے موٹے اصول بتائے۔

⑮ پندرھویں میں بتایا کہ کوئی بھی مصیبت پیش آجائے مسلمان اسلام کو چھوڑ کر کفر کی طرف نہیں جا سکتا۔

⑯ سولہویں میں تکلیف وغم وہم کا ذکر کرتے ہوئے جو مسلمانوں کو پہنچا بتایا کہ اس کی وجہ نافرمانی تھی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا۔

⑰ سترھویں میں بتایا کہ اس جنگ نے مومنوں اور منافقوں میں تمیز کر دی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق فاضلہ کا ذکر کیا کہ کس وسعت قلبی سے آپ نے کام لیا۔

⑱ اٹھارھویں میں بتایا کہ سچے مومن دشمن کی طاقت یا اس کی کثرت سے گھبراتے نہیں۔

⑲ انیسویں میں اہل کتاب کے بیہودہ اعتراضات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ اہل کتاب اور مشرکین کی طرف سے مسلمانوں کو کچھ نہ کچھ دکھ پہنچتا ہی رہے گا اور اس پر صبر کی تلقین کی۔

⑳ آخری رکوع میں پھر دعا سکھا کر کامیابی کا وعدہ دیا اور فرمایا کہ کامیاب اسی صورت میں ہو سکتے ہو کہ دشمن کے مقابلہ پر پورے تیار رہو۔

اس سورت کا تعلق سورہ بقرہ سے اس قدر شدید ہے کہ صحیح مسلم کی ایک حدیث کے مطابق ان دونوں کو **الزھراوان کے نام سے پکارا گیا ہے**۔ جو زھرا کا تثنیہ ہے یعنی روشن وسفید۔ دونوں میں توحید الٰہی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اثبات ہے۔ پہلی

پیشگوئیوں سے بھی اور دوسرے ذرائع سے بھی۔ پس حدیث نے ان دونوں سورتوں کو بلحاظ ان کے شدید تعلق کے ایک کے حکم میں رکھا ہے۔ یہ تعلق مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ جو باتیں سورہ بقرہ میں اشارہ کے رنگ میں بیان کی گئی ہیں ان کو یہاں واضح کر دیا ہے اور جو وہاں واضح کر دی گئی ہیں ان کا ذکر یہاں اشارہ اور کنایہ کے رنگ میں ہے۔ سورہ بقرہ میں زیادہ تر خطاب یہودیوں سے اور تھوڑا سا عیسائیوں سے ہے، یہاں زیادہ عیسائیوں سے اور تھوڑا یہودیوں سے۔ سورہ بقرہ کو حضرت آدم علیہ السلام کے ذکر سے شروع کیا جو پہلے نبی ہیں تو اس سورت کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذکر سے شروع کیا جو قومی نبیوں میں سب سے پیچھے آئے۔ وہاں توحید کا ذکر بت پرستی کے مقابلہ میں ہے تو یہاں عیسیٰ پرستی کے مقابلہ میں۔ وہاں نظائر قدرت سے توحید پر دلائل دیئے ہیں تو یہاں فطرت اور مذاہب کی متفقہ شہادت سے۔ وہاں خانہ کعبہ کو قبلہ بنانے کا ذکر ہے تو یہاں اس کے اول بیت ہونے کا۔ وہاں جنگ کی ضرورت اصولی رنگ میں بیان کی تو یہاں ایک جنگ کے واقعات کا مفصل ذکر کیا۔ اس تفصیل کو جتنا چاہو بڑھا لو اور دونوں سورتوں کی ابتدا میں اور انتہا میں بھی تعلق ہے۔ سورہ بقرہ کی ابتدا میں اگر اصول فلاح بتائے تو آل عمران کا خاتمہ بھی تُفْلِحُوْنَ پر کیا۔ گویا دونوں کا ایک ہی مضمون تھا۔ اور دوسری طرف اگر سورہ بقرہ کا خاتمہ ﴿فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ﴾ [البقرة: 286:2] پر کیا یعنی کافر قوم کے خلاف ہماری نصرت فرما تو آل عمران کی ابتدا میں ہی اس قوم کا ذکر کیا جس کے ساتھ اسلام کا سب سے بڑھ کر مقابلہ ہونا تھا یعنی عیسائی قوم۔

زمانۂ نزول:

ترتیب نزول کے لحاظ سے اس سورت کا تعلق سورہ بقرہ سے وہی ہے جو ترتیب قرآنی کے لحاظ سے یعنی اس کا اکثر حصہ سورہ بقرہ کے اکثر حصہ کے بعد نازل ہوا ہے۔ سورہ بقرہ پہلے اور دوسرے سال ہجرت کی نازل شدہ ہے تو یہ تیسرے سال ہجرت کی۔ تیرھویں رکوع سے لے کر قریباً آخر تک اس سورت میں جنگ احد کے واقعات کا ذکر ہے جو 3 ہجری میں ہوئی اس لیے یہ حصہ یقیناً 3 ہجری کا نازل شدہ ہے۔ ابتدائی حصہ میں بالخصوص عیسائی مذہب کا ذکر ہے اسی میں آیت مباہلہ بھی ہے اور یہ مباہلہ وفد نجران سے تھا جو 9 ہجری میں آیا مگر سورت کا یہ حصہ 9 ہجری کا نازل شدہ یقیناً نہیں اور اندرونی شہادت سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہ ابتدائی زمانہ مدینہ کا نازل شدہ ہے اور وفد نجران کے مقابلہ پر انہی پہلے کے نازل شدہ امور کو ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا۔ علاوہ ازیں اس حصہ میں جو اصول مقابلہ مذاہب قائم کیا ہے: ﴿تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ﴾ [آل عمران: 64:3] ''اس بات کی طرف آؤ جو ہمارے درمیان اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔'' یہ آیت ان خطوط میں موجود ہے جو 6 ہجری کے آخر میں آپ نے قیصر وغیرہ کو لکھے۔ پس یہ حصہ یقیناً 6 ہجری سے پہلے کا نازل شدہ ہے اور قرین قیاس یہی ہے کہ 3 ہجری کا ہی ہے۔ ہاں ممکن ہے کہ صرف آیت مباہلہ کا نزول وفد نجران کے آنے پر ہوا ہو۔

اٰيَاتُهَا 200 (3) سُوْرَةُ اٰلِ عِمْرٰنَ مَدَنِيَّةٌ (89) رُكُوْعَاتُهَا 20

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

اللہ بے انتہا رحم کرنے والے کے نام سے

الٓمّٓ ①

میں اللہ کامل علم رکھنے والا ہوں۔

اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ②

اللہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہمیشہ زندہ خود قائم، قائم رکھنے والا ہے۔(368)

368- اس آیت کے الفاظ بعینہٖ وہی ہیں جو آیۃ الکرسی کے صدر کے الفاظ ہیں جس کے لیے [دیکھو نمبر: 329] و[دیکھو نمبر: 329 ج] ۔

چونکہ اس سورت کے ابتدائی حصہ میں عیسائیت کی تردید ہے اس لیے اس کی ابتدا میں **ان صفات الٰہی کا ذکر کیا** ہے جو **عیسائی مذہب کے بطلان پر دلالت کرتی ہیں**۔ چنانچہ اول توحید کا ذکر فرمایا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ پھر فرمایا وہ حی اور قیوم ہے۔ ابن جریر نے ربیع سے ایک روایت بیان کی ہے جس کی رو سے خود نبی کریم ﷺ نے ان صفات سے اور اگلی آیات کی مندرجہ صفات سے مسیح کی خدائی کے خلاف استدلال کیا ہے۔ میں اس روایت کا لفظی ترجمہ یہاں دیتا ہوں۔

آنحضرت ﷺ کی وفد نجران سے گفتگو:

نصاریٰ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عیسیٰ بن مریم کے متعلق آپ سے بحث کی اور آپ کو کہا کہ اس کا باپ کون ہے؟ اور اللہ پر جھوٹ اور بہتان کہا۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں جس نے نہ اپنی جورو بنائی اور نہ بیٹا۔ تو نبی ﷺ نے ان کو کہا کہ کیا تم نہیں جانتے کہ کوئی بیٹا نہیں ہوتا مگر وہ اپنے باپ سے مشابہ ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا ہاں۔ آپ نے فرمایا کیا تم نہیں جانتے کہ ہمارا رب ہمیشہ زندہ ہے کبھی نہیں مرے گا اور عیسیٰ پر فنا آئی۔ انہوں نے کہا ہاں۔ آپ نے فرمایا کیا تم نہیں جانتے کہ ہمارا رب ہر چیز کو قائم رکھنے والا، اس کی نگہبانی کرتا ہے اور حفاظت کرتا ہے اور اس کو رزق دیتا ہے۔ انہوں نے کہا ہاں۔ آپ نے فرمایا کہ عیسیٰ ان میں سے کسی چیز کا اختیار رکھتا ہے؟ انہوں نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ پر آسمان و زمین کی کوئی چیز مخفی نہیں؟ [آیت: 5] انہوں نے کہا ہاں۔ فرمایا کیا عیسیٰ کوئی بات جانتا تھا سوائے اس کے جس کا علم اسے دیا گیا؟ انہوں نے کہا نہیں۔ آپ نے فرمایا ہمارے رب نے عیسیٰ کی صورت جس طرح چاہا رحم میں بنائی [آیت: 6] اور آپ نے فرمایا کیا تم نہیں جانتے کہ ہمارا رب کھانا نہیں کھاتا اور نہ پانی پیتا ہے اور نہ قضائے حاجت کرتا ہے۔ انہوں نے کہا ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم نہیں جانتے کہ عیسیٰ کو ایک عورت نے حمل میں لیا جس طرح عورت حمل میں لیا کرتی ہے۔ پھر اس کو جنا جس طرح عورت اپنا بچہ جنا کرتی ہے پھر اس کو غذا دی گئی جس طرح بچوں کو غذا دی جاتی ہے۔ پھر وہ کھانا کھاتا تھا اور پانی پیتا تھا اور پاخانہ کرتا تھا انہوں نے کہا ہاں۔ آپ نے فرمایا پھر جو تم دعویٰ کرتے ہو وہ کیسے ہو سکتا ہے؟

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَ اَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ ۙ﴿۳﴾

اس نے تجھ پر حق کے ساتھ کتاب اتاری اس کی تصدیق کرتی ہوئی جو اس سے پہلے ہے،(369) اور توریت اور انجیل کو۔

اس گفتگو سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ جن خاص صفات الٰہی کا ذکر یہاں کیا ہے۔ ان کی خاص غرض حضرت عیسیٰ کی الوہیت کی نفی ہے۔ روایت میں جہاں حضرت عیسیٰ پر فنا آنے کا ذکر ہے وہاں اصل الفاظ ہیں [اِنَّ عِيْسٰى يَاْتِيْ عَلَيْهِ الْفَنَاءُ] یعنی عیسیٰ پر فنا آتی ہے یا آئے گی مگر مضارع کبھی ماضی کے معنی میں بھی آجاتا ہے اور ممکن ہے کہ الفاظ روایت میں ہی کمی بیشی ہوگئی ہو کیونکہ عیسائیوں کا عقیدہ یہ کبھی نہیں ہوا کہ عیسیٰ پر فنا اب تک نہیں آئی اور آئندہ آئے گی۔ بلکہ ان کا کھلا کھلا عقیدہ یہی ہے کہ عیسیٰ پر فنا آئی مگر آئندہ نہیں آئے گی۔ اس لیے اگر نبی کریم ﷺ یہ فرماتے کہ عیسیٰ پر فنا آئے گی تو ان کا جواب ان کی طرف سے ہاں کبھی نہ ہوتا وہ ہرگز اس بات کے قائل نہیں کہ عیسیٰ پر آئندہ کوئی فنا آئے گی۔ اس لیے یقیناً آپ نے الفاظ ایسے فرمائے ہوں گے جن کا ترجمہ یہ ہو کہ عیسیٰ پر فنا آئی۔ اس کا جواب عیسائی بلاشبہ اثبات میں دیں گے کیونکہ وہ مانتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام پر موت آئی مگر پھر وہ موت پر فتح پا گیا اور ہمیشہ کے لیے زندہ ہوگیا۔

369- حق کے اصل معنی [نمبر: 65] میں بیان ہو چکے ہیں۔ کسی چیز کو جو وجود میں آئے مقتضائے حکمت کے مطابق ہونے کی وجہ سے حق کہا جاتا ہے اور انہی معنوں میں یہاں قرآن کو بالحق نازل کرنے کا ذکر فرمایا یعنی وہ مقتضائے حکمت کے مطابق نازل ہوا ہے۔

پہلی وحی کے ہوتے ہوئے نزول قرآن کی ضرورت:

یہ اس بات کا جواب ہے کہ جب پہلے بھی کوئی وحی نازل ہوتی رہی تھی تو قرآن کے نازل کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اور عموماً عیسائیوں کی طرف سے یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ توریت وانجیل کے ہوتے ہوئے قرآن شریف کی کیا ضرورت تھی؟ اس سورت میں آگے زیادہ تفصیل کے ساتھ بھی اس کا جواب آئے گا۔ مگر یہاں بھی اس کی ایک وجہ بتادی ہے اور وہ وجہ یہ ہے کہ پہلی کتابوں میں جو رسول اللہ ﷺ کے متعلق پیشگوئیاں تھیں ان کی تصدیق کے لیے ضروری تھا کہ یہ کتاب نازل ہوتی گویا سابقہ وحی الٰہی بغیر نزول قرآن خود سچی نہ ٹھہرتی تھی۔ چنانچہ اس کو کھول کر [آیت 81] میں بیان فرمایا ہے۔ جہاں تصدیق کا صاف منشا بتایا ہے: ﴿وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَاۤ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ﴾ [آل عمران: 81:3] اللہ تعالیٰ نے نبیوں کے ذریعہ سے یہ عہد لیا تھا کہ جو کچھ تم کو کتاب وحکمت سے دیا جاتا ہے پھر تمہارے پاس ایک رسول تمہاری وحیوں کی تصدیق کرتا ہوا آئے تو اس پر ایمان لانا ہوگا۔ پس ان کی پیشگوئیوں کا پورا کرنا بھی درحقیقت ان کی تصدیق ہے۔ قرآن کریم کے نزول کی دوسری ضرورتوں کو بھی اس سورت میں آگے چل کر بیان فرمایا ہے۔

مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ اَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ؕ لوگوں کو راہ دکھانے کے لیے پہلے سے نازل کیا(370)

370- اَلتَّوْرٰةُ اصل لفظ کے عبرانی ہونے میں شبہ نہیں مگر عربی اور عبرانی زبانیں بہت ملتی جلتی ہیں۔ یہ لفظ بھی ان دونوں زبانوں میں ملتا جلتا ہے۔ اہل عرب کے نزدیک توریت وَرْیٌ سے ہے اور کوفیوں کے نزدیک اصل میں تفعلۃ کے وزن پر ہے اور بصریوں کے نزدیک فوعل کے وزن پر۔ جس کا اصل وَوْرَاۃٌ تھا اور و۔ت سے بدل گئی۔ (غ) اور وَرْیٌ کے معنی [وَرَی الزَّنْدِ] سے آگ نکالنا ہیں۔ جس سے قرآن شریف میں بھی آتا ہے: ﴿النَّارَ الَّتِیْ تُوْرُوْنَ﴾[الواقعة: 71:56] ''آگ کو جو تم روزشن کرتے ہو۔'' اور وَرَایْتُ کے معنی سَتَرْتُ ہیں یعنی ایک چیز کو چھپا دیا۔ جس سے ہے: ﴿لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِكُمْ﴾ [الأعراف: 26:7] ''لباس جو تمہارے عیبوں کو ڈھانکے۔''، ﴿حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ﴾[صٓ: 32:38] ''یہاں تک کہ وہ پردے میں چھپ گئے۔'' پس توریت کو توریت یا تو اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ پتھر سے آگ نکالنے کی مثال ہے۔ یعنی بڑی مشقت سے اس سے کچھ روشنی پیدا ہوتی ہے۔ جیسا ابتدائے تاریخ عالم میں پتھر سے آگ نکالی جاتی تھی۔ جس کے بالمقابل قرآن کریم کو ایسا نور بیان فرمایا ہے: ﴿یَّكَادُ زَیْتُهَا یُضِیْٓءُ وَ لَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ﴾[النور: 35:24] اس کا تیل خود بخود جل اٹھتا ہے، گو اسے آگ نہ چھوئے اور یا اس لیے کہ اس میں بعض مضامین مستتر یعنی مخفی حالت میں ہیں۔ جیسا جزا و سزا کا مسئلہ۔ ان مسائل پر پوری روشنی قرآن کریم نے ہی ڈالی ہے۔

توریت اس مجموعہ کتب کا نام ہے جو حضرت موسیٰؑ پر نازل ہوا۔ قرآن کریم نے ایک جگہ اس کے حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام دونوں کو دیئے جانے کا ذکر فرمایا ہے: ﴿وَ اٰتَیْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِیْنَ﴾[الصّٰفّٰت: 117:37] ''اور ہم نے دونوں کو واضح کتاب دی۔'' یہ جیسا کہ اب موجود ہیں کل پانچ کتابیں ہیں جو بائبل کی ابتدا میں ہیں اور ان کے نام حسب ذیل ہیں۔ پیدائش یا تکوین، خروج، احبار، اعداد یا گنتی، استثناء۔ پرانے عبرانی نسخوں میں پانچ کتابوں کی تقسیم بین نہیں ہے بلکہ پیدائش سے لے کر استثناء تک ایک ہی مجموعہ ہے جس کو کئی چھوٹے اور بڑے بابوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

اَلْاِنْجِیْلُ۔ سریانی زبان میں بھی اس سے ملتا جلتا لفظ استعمال ہوتا ہے جس کے معنی خوش خبری ہیں۔ اہل عرب نے اِنْجِیْلُ کا مادہ نَجْلٌ لیا ہے اور نَجْلٌ کے معنی نسل اور ولد بھی ہیں اور [اِنْتَجَلَ الْاَمْرُ] کے معنی ہیں اِسْتَبَانَ واضح ہو گیا اور [نَجَلْتُ الْاَرْضَ] کے معنی ہیں زراعت کے لیے اسے پھاڑا۔ (ل) انجیل کی جمع اناجیل ہے اور حدیث میں **صحابہ رضی اللہ عنہم کی صفت** میں آتا ہے: [صُدُوْرُهُمْ أَنَاجِیْلُهُمْ]۔ (ل) ان کے سینے ان کی انجیلیں ہیں اور یہ انجیل بمعنی بشارت سے ہی ماخوذ معلوم ہوتا ہے اور حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ان کے سینے بشارتوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ یا یہ کہ جو عظیم الشان بشارت انجیل لائی تھی وہ اب صحابہ کے سینوں میں ہے کیونکہ وہ بشارت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کی تھی۔

انجیل قرآن کریم کے نزدیک وہ کتاب ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی اور جس شکل وصورت میں وہ عیسائیوں کے پاس تھی اس کو انجیل ہی کہا گیا ہے۔ **گو وہ چار کتابیں ہیں** جو عیسائیوں کی اصطلاح میں **اناجیل کے نام سے موسوم ہیں**۔ ان میں سے کوئی

بھی حضرت عیسیٰ پر نازل شدہ انجیل نہیں بلکہ وہ چار الگ الگ اشخاص کی تصنیف ہیں۔ایک متی کی، ایک مرقس کی، ایک لوقا کی، ایک یوحنا کی۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بائبل صرف توریت وانا جیل کے مجموعہ کا نام نہیں۔ **یہودیوں کے نزدیک تو بائبل اس مجموعہ کا نام ہے جس کے شروع میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پانچ کتابیں ہیں** اوران کے علاوہ اور بہت سی کتابیں انبیاء کی وہ اس میں شامل کرتے ہیں۔ایوب، یونس، حزقیل، دانیال وغیرھم کی کتب کے علاوہ حضرت داؤد علیہ السلام کی زبور بھی اسی مجموعہ میں شامل ہے۔ اور بعض کتب کی شمولیت کے متعلق اختلاف بھی چلا آیا ہے۔یعنی عام مروج نسخہ میں 35 کتابیں شامل نہیں جو سپٹو ایجنٹ نسخہ میں ہیں۔اور عیسائی اس مجموعہ کا نام تو **پرانا عہدنامہ** رکھتے ہیں اور ہر چہار انا جیل اور اعمال حواریین اور پولوس اور دیگر رسولوں کے خطوط اور مکاشفات۔یوحنا کے مجموعہ کو **نئے عہدنامہ** کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور پھر پرانے اور نئے عہدنامہ کل کو بائبل کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔اس الہامی کتاب کی بھی عجیب کیفیت ہے کہ کتابوں کی کتابیں بعض نسخوں میں شامل ہیں اور بعض سے خارج کردی گئی ہیں۔

اناجیل کے مصنف:

اناجیل کے متعلق جیسا کہ ذکر ہوا عیسائیوں کے ہاتھ میں نہ صرف مسیح ہی کی کوئی انجیل نہیں بلکہ وہ چار اناجیل جو ان کے پاس ہیں وہ بھی ان لوگوں کی لکھی ہوئی ثابت نہیں ہوتیں جن کے ناموں پر وہ مشہور ہیں۔بلکہ ان کے لکھنے والے کوئی اور لوگ ہیں۔ متی کی انجیل کی تصنیف پر بحث کرتا ہوا پادری ڈلوا اپنی تفسیر میں لکھتا ہے:

''جو کچھ اوپر بیان ہوا ہے اس سے یہ ظاہر ہے کہ اس انجیل کا براہ راست متی کی تصنیف ہونا غیر اغلب ہے۔''[دیکھو صفحہ: 620]

اور آگے چل کر دکھایا ہے کہ متی نے کوئی کلمات وغیرہ مسیح کے جمع کیے ہوں گے جس کو اس مصنف نے استعمال کیا ہے اور اس کی تصنیف کا زمانہ جو خود پادری صاحبان بتاتے ہیں 70ء ہے۔مگر واقعات سے 150ء سے پیشتر مروجہ اناجیل اربعہ میں سے کسی انجیل کا کتاب کی صورت میں موجود ہونا ثابت نہیں ہوتا۔لوقا اور مرقس کی اناجیل کو عموماً ان مصنفوں کا سمجھا گیا ہے مگر نئی تحقیقات کی رو سے ان اناجیل کے ان کے مصنف ہونے پر شبہ کیا گیا ہے اور یہی حال یوحنا کی انجیل کا ہے جو پہلی صدی کے آخر کی لکھی ہوئی سمجھی جاتی ہے۔

محرف کتابوں کا نام بھی توریت وانجیل ہی ہے:

پس توریت وانجیل کا لفظ اپنی حقیقت کی رو سے تو انہی اصل کتابوں پر بولا جاسکتا ہے جو حضرت موسیٰ اور حضرت مسیح علیہما السلام پر نازل ہوئی تھیں۔مگر موجودہ محرف کتابیں جن میں ان کا کچھ بقیہ ہے ان کو بھی اسی نام سے موسوم کیا جائے گا اور یہاں اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ یہ کتابیں بھی ہم نے پہلے لوگوں کی ہدایت کے لیے نازل کی تھیں۔اور سچ تو یہ ہے کہ اب بھی ان میں ہدایت کچھ نہ کچھ موجود ہے۔اور سب سے بڑی ہدایت ان میں یہی موجود ہے کہ دونوں کتابیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی پیشگوئی کرتی ہیں اور

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ؕ وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝۴

اور حق و باطل میں فیصلہ اتارا۔[371] وہ لوگ جو اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے اور اللہ غالب سزا دینے والا ہے۔[372]

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَ لَا فِي السَّمَآءِ ۝۵

یقیناً اللہ پر نہ زمین میں کوئی چیز چھپی ہے اور نہ آسمان میں۔[373]

انجیل تو صاف طور پر کہتی ہے کہ کامل ہدایت کی راہیں سکھانے والا میرے (یعنی مسیح کے) بعد آنے والا ہے۔

371- فرقان کے اصل معنی تو جیسا نمبر 76 میں دکھایا جا چکا ہے حق و باطل میں فرق کرنے والا ہیں اور قرآن کریم کا بھی یہ ایک نام ہے۔ قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یہاں فرقان سے مراد قرآن کریم ہے۔ (ث) اور گو پہلے قرآن کریم کے نزول کا ذکر فرما چکا ہے مگر دوبارہ دوسرے لفظ کو لا کر بیان کرنے سے خاص مقصود ہے۔ وہاں فرمایا تھا کہ یہ کتاب مقتضائے حکمت کے مطابق نازل ہوئی یعنی ضرورت حقہ کو پورا کرنے والی ہے تو ایک دلیل اس کی تو وہاں دی تھی کہ یہ مصدق ہے، دوسری دلیل لفظ فرقان میں دی ہے۔ توریت و انجیل کے نزول کا ذکر کر کے ان کی تحریف کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے جس کو بالتفصیل سورہ بقرہ میں بیان کر دیا تھا۔ تو اس لیے جب تحریف ہوگئی تو حق و باطل میں امتیاز کرنے والی کوئی کتاب نہ رہی۔ پس اللہ تعالیٰ نے فرقان حمید کو نازل کیا کہ اس سے حق و باطل میں فرق کرے۔

372- اِنْتِقَامٌ۔ نَقَمَ سے ہے [نَقِمْتُ الشَّيْءَ وَنَقَمْتُهُ] کے معنی ہیں میں نے اس چیز کو ناپسند کیا۔ زبان سے ہو یا سزا دے کر۔ اس لیے نَقِمَةٌ کے معنی عقوبت ہیں۔ (غ) [اِنْتَقَمَ اللّٰهُ مِنْهُ] کے معنی ہیں عَاقِبَةٌ یعنی اسے سزا دی۔ (ل) اسی معنی سے اللہ تعالیٰ کے اسماء میں مُنْتَقِمٌ یا ذُو انْتِقَامٍ ہے یعنی سزا پہنچانے والا۔ (ل)

373- **حضرت مسیح کے اعتراف لاعلمی کی اناجیل سے مثال:** یہاں اللہ تعالیٰ کی وسعت علم کو مؤکد الفاظ میں بیان فرمایا ہے اور غرض جیسا کہ نوٹ [نمبر: 368] سے ظاہر ہے حضرت مسیح کے صفات باری سے عاری ہونے کا ذکر ہے۔ قرآن کریم ہمیشہ ایسے لطیف طریق پر بات کو بیان کرتا ہے کہ کسی دوسرے کو ناگوار نہ گزرے اور پھر ایک لفظ میں بہت سا مضمون بیان کر دیتا ہے۔ بجائے اس کے کہ یہ بیان فرماتا کہ مسیح کو کوئی علم نہ تھا۔ مگر جس قدر ایسے برگزیدہ انسانوں کو ہوتا ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے اس آیت سے استدلال کر کے بیان فرمایا اور اناجیل سے ان مثالوں کو پیش کرتا کہ کس طرح حضرت مسیح کا علم انسانی علم تک محدود تھا یوں فرمایا کہ وہ اللہ ہی ہے جس پر آسمان و زمین کی کوئی چیز مخفی نہیں۔ گویا یہ بتا دیا کہ مسیح پر بہتیری چیزیں مخفی تھیں۔ چنانچہ اس کی شہادت خود اناجیل سے ملتی ہے۔ مثلاً انجیر کے درخت کا واقعہ:

''دوسرے دن جب وہ بیت عنیاہ سے نکلے اس کو بھوک لگی اور دور سے انجیر کا ایک درخت جس میں پتے تھے دیکھ کر

هُوَ الَّذِیْ یُصَوِّرُكُمْ فِی الْاَرْحَامِ كَیْفَ یَشَآءُ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝۶

وہی ہے جو تمہاری تصویریں رحموں میں جس طرح چاہتا ہے بناتا ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں، غالب حکمت والا ہے۔ (374)

گیا کہ شاید اس میں کچھ پائے مگر جب اس کے پاس پہنچا تو پتوں کے سوا کچھ نہ پایا کیونکہ انجیر کا موسم نہ تھا۔'' [مرقس: 11:12، 13]

اس واقعہ میں یہ الفاظ کہ ''شاید اس میں کچھ پائے'' اور ''انجیر کا موسم نہ تھا'' قابل غور ہیں جو بتاتے ہیں کہ حضرت مسیح کو باوجود انجیر کا موسم نہ ہونے کے یہ خیال تھا کہ شاید وہاں کچھ انجیریں مل جائیں کس قدر علم کی عاجزی کا اظہار ہے۔ یہ تو عملی اعتراف عجز ہے دوسری جگہ لفظوں میں بھی اپنے علم کے ناقص ہونے کا اظہار کیا ہے۔ ''لیکن اس دن اور اس گھڑی کی بابت کوئی نہیں جانتا نہ آسمان کے فرشتے نہ بیٹا۔ مگر صرف باپ۔'' [متی: 24:36]

374- یُصَوِّرُ۔ تَصْوِیْرٌ صورت بنانے کا نام ہے۔ اور صُوْرَةٌ وہ ہے جس سے کسی چیز کے عین کا نقش ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے وہ دوسری اشیاء سے الگ ہوتی ہے، پھر یہ دو طرح پر ہے۔ ایک محسوس جسے خاص و عام بلکہ حیوان بھی پہچان سکتے ہیں اور دوسرے معقول جسے صرف خواص ہی پہچان سکتے ہیں۔ جیسے وہ صورت جس سے انسان مخصوص ہے یعنی عقل اور رویہ۔ اور وہ معانی جن سے ایک شے دوسری سے مخصوص ہوتی ہے اور جہاں اللہ تعالیٰ کے انسان کی صورت بنانے کا ذکر ہوتا ہے وہاں یہ دونوں صورتیں مراد ہوتی ہیں۔ (غ) جیسے: ﴿خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ﴾ [الأعراف: 7:11] ''ہم نے تم کو پیدا کیا، پھر ہم نے تمہاری صورت بنائی۔'' ﴿وَّ صَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ﴾ [المؤمن: 40:64] ''اور تمہاری صورتیں بنائیں تو خوب ہی تمہاری صورتیں بنائیں۔'' ﴿فِیْۤ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ﴾ [الانفطار: 82:8] ''جس صورت میں چاہا تجھے ترکیب دیا۔'' اور یہاں بھی۔ اور یہ جو حدیث میں آیا ہے: [فَإِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ آدَمَ عَلٰى صُورَتِهِ] (صحيح مسلم، كتاب البر والصلة والأدب، باب النَّهْيِ عَنْ ضَرْبِ الْوَجْهِ: 6821) تو امام راغب کہتے ہیں اس سے **وہ صورت مراد ہے جس سے انسان مخصوص ہے** یعنی وہ ہیئت جس کا ادراک آنکھ سے اور عقل سے ہوتا ہے جس سے انسان کو دوسری مخلوق پر فضیلت ہے اور صُوْرَتِهٖ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کے ساتھ تشبیہ کے لیے نہیں یا اس لیے نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی بھی کوئی صورت ہے بلکہ عَلٰى سَبِیْلِ الْمِلْكِ ہے یعنی اس کی ملک ہونے کے لحاظ سے اور عَلٰى سَبِیْلِ التَّشْرِیْفِ لَهٗ یعنی اس کی عزت کے لحاظ سے جیسے بَیْتُ اللّٰهِ، نَاقَةُ اللّٰهِ وغیرہ میں۔

روحی میں ضمیر: اور ایسا ہی ﴿نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ﴾ [الحجر: 15:29] ''اپنی روح اس میں پھونکوں۔'' یا رُوْحٌ مِّنْهُ میں بھی ملکیت اور عزت کے لحاظ سے اسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا ہے۔

حضرت مسیح کا معمولی بچوں کی طرح حمل میں لیا جانا اور پیدا ہونا:

اللہ تعالیٰ کی اس صفت کا ذکر کہ وہ انسان کی صورت رحم میں جس طرح چاہتا ہے بناتا ہے۔ اس کی کمال قدرت کے اظہار کے لیے ہے کہ کس طرح تاریکیوں پر تاریکی میں جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿فِیْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ﴾ [الزمر: 39:6] ''تین اندھیروں میں۔''

هُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌؕ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ

وہی ہے جس نے تجھ پر کتاب اتاری اس میں سے (کچھ) محکم آیتیں ہیں جو کتاب کی اصل ہیں، اور کچھ متشابہ ہیں۔[375] پھر جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ

انسان کی نہ صرف جسمانی بلکہ اس کی اخلاقی اور روحانی تصویر بناتا ہے۔ یہ بھی الوہیت مسیح کے بطلان کی دلیل کے طور پر ہے۔ جیسا کہ روایت منقولہ بالا سے ثابت ہے یعنی یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ جو حالات انسانوں پر گزرتے ہیں وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بھی گزرے، اور رحم میں اس پر وہ سب حالتیں یکے بعد دیگرے آئیں جیسا کہ عام انسانوں پر آتی ہیں اور ابن جریر میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے اس روایت کا اس آیت کی تفسیر میں ذکر کیا گیا ہے کہ پہلے نطفہ ہوتا ہے پھر چالیس دن کے بعد علقہ کی صورت اختیار کرتا ہے... الخ۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح پر نطفہ سے لے کر وہ تمام حالات انسانی آئے ہیں جو دوسرے انسانوں پر آتے ہیں۔ کوئی خصوصیت بر بنائے پیدائش ان کے حالات میں نہیں۔ اسی کی طرف دوسری جگہ اشارہ ہے جہاں فرمایا: ﴿فَحَمَلَتْهُ﴾ [مریم: 22:19] پھر مریم نے ان کو حمل میں لیا اور نمبر 368 میں جس روایت کا ترجمہ دیا گیا ہے اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ ہیں: [إِنَّ عِيْسٰى حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كَمَا تَحْمِلُ الْمَرْأَةُ ثُمَّ وَضَعَتْهُ كَمَا تَضَعُ الْمَرْأَةُ.] (روح المعانی: جلد3، صفحہ 75) یعنی عیسیٰ علیہ السلام کو ایک عورت نے حمل میں لیا جس طرح عورتوں کو حمل ہوتا ہے اور اس کو جنا جس طرح عورتیں جنتی ہیں۔ تعجب ہے کہ ایسی صراحت کے ہوتے ہوئے مفسرین نے بعض عجیب قصے بنا لیے ہیں اور بعض نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ ایک ہی گھڑی کے لیے حضرت مریم صدیقہ کو حمل ہوا تھا اور فوراً حضرت مسیح پیدا بھی ہو گئے۔

375- مُحْكَمٰتٌ۔ مُحْكَمٌ کی جمع ہے اور محکم وہ ہے جس میں لفظ اور معنی کی حیثیت سے کوئی شبہ وارد نہ ہو۔ (غ) حَكَمْتُ۔ اَحْكَمْتُ۔ حَكَّمْتُ کے اصل معنی مَنَعْتُ ہیں یعنی روک دیا۔ (ل) پس فساد یا خلل کو روکنے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جس طرح حاکم کو حاکم اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کو ظلم سے روکتا ہے اور یہ وجہ بھی محکم کی دی گئی ہے کیونکہ اس کا بیان خود اپنے آپ میں مضبوط ہوتا ہے اور دوسرے کا محتاج نہیں ہوتا۔ (ل) روح المعانی میں ہے: [وَاضِحَةَ الْمَعْنٰى ظَاهِرَةُ الدَّلَالَةِ مُحْكَمَةُ الْعِبَارَةِ] (روح المعانی: جلد3، صفحہ 80)

اُمُّ۔ ماں کو کہتے ہیں اور ہر اس چیز کو بھی ام کہا جاتا ہے جو کسی چیز کے وجود یا اس کی تربیت یا اس کی اصلاح یا اس کی ابتدا کے لیے بطور اصل ہو۔ (غ) پس ام درحقیقت وہ اصل ہے جس سے ایک چیز پیدا ہوتی ہے یا جس پر دوسری چیزیں متفرع ہوتی ہیں۔ پس ام الکتاب سے مراد اصول ہیں۔ سعید بن جبیر سے مروی ہے: [سَمَّاهُنَّ أُمَّ الْكِتَابِ لِأَنَّهُنَّ مَكْتُوبَاتٌ فِي جَمِيعِ الْكُتُبِ] (تفسیر ابن کثیر: جلد2، صفحہ 7)۔ (ث) وہ ام کتاب اس لیے ہیں کہ سب آسمانی کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں یعنی اصول دین ہیں۔

زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ وہ اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں جو اس میں سے متشابہ ہے

اُخَرُ۔ اُخْرٰی کی جمع ہے جو آخر کی تانیث ہے اور محذوف یعنی آیات کی صفت ہے۔ اصل اس کا تاخیر یعنی پیچھے رہنے کے لیے ہے۔ مگر محض ایک چیز کے غیر پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

مُتَشٰبِهٰتٌ۔ مُتَشَابَهٌ شَبْهٌ سے ہے اور کسی چیز کا شَبْهٌ وہ ہے جو بلحاظ کیفیت اس کی مثل ہو۔ (غ) اور قرآن میں متشابہ اسے کہا جاتا ہے جس کی تفسیر بوجہ اس کی غیر کے ساتھ مشابہت کے مشکل ہو۔ خواہ مشابہت لفظ کی حیثیت سے ہو یا معنی کی حیثیت سے۔ (غ)

محکم اور متشابہ آیات پر راغب کی بحث:

مفسرین میں اس بات کے متعلق کہ محکمات کون آیات ہیں اور متشابہات کون؟ مختلف آرائے ہیں۔ امام راغب نے مفردات میں اس پر بڑی لمبی اور جامع بحث کی ہے۔ اول وہ کل آیات کی تقسیم تین طرح پر کرتے ہیں۔ محکم مطلق اور متشابہ مطلق اور ایک وجہ سے محکم اور ایک وجہ سے متشابہ پھر متشابہ تین قسم ہے۔ لفظ کی حیثیت سے، معنی کی حیثیت سے اور لفظ اور معنی دونوں کی حیثیت سے۔ پھر لفظ کی حیثیت سے جو تشابہ ہے وہ دو قسم ہے ایک الفاظ مفردہ میں، دوسرا کلام مرکب میں۔ الفاظ مفردہ میں تشابہ یا تو بوجہ غرابت لفظ کے ہوتا ہے جیسے اَبّ۔ یَزِفُّوْنَ اور یا اشتراک لفظی کی وجہ سے جیسے یَدٌ۔ عَیْنٌ وغیرہ کے استعمال میں اور کلام مرکب میں اختصار سے تشابہ واقع ہوتا ہے جس کی مثال دی ہے: ﴿وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ﴾ [النسآء: 3:4] ''اور اگر تمہیں خوف ہو کہ یتیموں کے بارے میں انصاف نہ کرسکو گے تو (ایسی) عورتوں سے نکاح کرلو جو تمہیں پسند ہوں۔'' اور یا بسط سے جیسے: ﴿لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ﴾ [الشوری: 11:42] ''اس کی مثل کوئی چیز نہیں۔'' اور معنی کے لحاظ سے متشابہ میں اللہ تعالیٰ کے اوصاف اور ﴿یَوْمَ الْقِیٰمَةِ﴾ کے اوصاف داخل ہیں جس کی وجہ یہ دیتے ہیں کہ یہ صفات ہمارے تصور میں نہیں آسکتیں کیونکہ ہمارے ذہن میں وہی چیز آسکتی ہے جس کو ہم محسوس کرتے ہیں یا اس جنس کی چیز ہو جس جنس کی چیزوں کو ہم محسوس کرتے ہیں۔ پس جنت، دوزخ حساب کتاب وغیرہ کے متعلق جس قدر امور ہیں وہ متشابہات میں داخل ہیں اور جن میں تشابہ بحیثیت لفظ بھی ہو اور معنی بھی اس کو پانچ قسم بیان کیا ہے جن میں سے مَیں صرف یہاں اول دو قسم کو لیتا ہوں۔ کمیت کے لحاظ سے جیسے عموم وخصوص جس کی مثال ہے: ﴿فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِیْنَ﴾ [التوبة: 5:9] ''تو ان مشرکوں کو قتل کردو۔'' جہاں لفظ عام ہے مگر مراد خاص مشرک ہیں۔ وجوب وندب کے لحاظ سے جیسے: ﴿فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ﴾ [النسآء: 3:4] ''تو (ایسی) عورتوں سے نکاح کرلو جو تمہیں پسند ہوں۔'' اور آخر پر لکھا ہے کہ مفسرین نے جو جو تشریحات محکم ومتشابہ کی کی ہیں وہ سب اس تقسیم کے اندر داخل ہیں۔

ایک اور رنگ میں متشابہ کو تین قسم کیا ہے ایک وہ جس کی حقیقت پر انسان واقفیت حاصل نہیں کرسکتا جیسے امور متعلق قیامت وغیرہ۔ ایک وہ جن پر واقفیت حاصل کرسکتا ہے، جیسے الفاظ غریبہ اور مشکل احکام اور ایک ان دونوں کے درمیان جن سے

الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ ۚ وَ مَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ

فتنہ پیدا کرنے کے لیے اور یہ چاہتے ہوئے کہ اس کی (من مانی) تاویل کریں۔[376] اور اس کی تاویل کوئی نہیں جانتا سوائے اللہ کے اور ان کے جو علم میں پختہ

راسخ فی العلم واقفیت حاصل کر سکتے ہیں مگر ہر شخص نہیں۔

376- زَيْغٌ۔ استقامت سے ایک طرف جھک جانا زَيْغٌ ہے: ﴿فَلَمَّا زَاغُوْۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ﴾[الصف: 5:61] ''سو جب وہ ٹیڑھے چلے تو اللہ نے ان کے دل ٹیڑھے ہی رہنے دیئے۔'' ﴿مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَ مَا طَغٰى﴾ [النجم: 17:53] ''آنکھ پھری نہیں اور نہ حد سے بڑھی۔''

اِبْتِغَآءٌ۔ بَغٰی سے ہے جس کے معنی ہیں میانہ روی سے بڑھنے کو چاہنا اور [بَغَيْتُ الشَّيْءَ] اور اِبْتَغَيْتُهُ کے معنی ہیں قدر واجب سے بڑھ کر کسی چیز کو طلب کیا یا چاہا۔ (غ) فتنہ کے متعلق اس کا استعمال خاص طور پر ہوا ہے: ﴿لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ﴾[التوبة: 48:9] ''یقیناً انہوں نے پہلے بھی دکھ میں ڈالنا چاہا۔'' ﴿يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ﴾[التوبة: 47:9] ''تمہارے اندر دکھ چاہتے ہوئے۔''

اَلْفِتْنَةُ۔ فِتْنَةٌ کے اصل معنی [نمبر: 243] میں بیان ہو چکے ہیں۔ مگر یہاں وہ معنی مراد نہیں اور اس لفظ کے کئی اور معنی بھی آتے ہیں منجملہ ان کے حق سے پھیر دینا بھی اس کے معنی آتے ہیں۔ چنانچہ فِتْنَ الرَّجُلَ کے معنی ہیں: [أَزَالَهُ عَمَّا كَانَ عَلَيْهِ]۔ (ل) یعنی جس حالت پر وہ تھا اس سے اس کو ہٹا دیا۔ اور اسی لحاظ سے: ﴿وَ اِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ﴾[بني إسرائيل: 73:17] ''اور وہ تجھے اس سے ہٹانے ہی لگے تھے جو ہم نے تیری طرف وحی کی۔'' میں يَفْتِنُوْنَكَ کے معنی لکھے ہیں [يُمِيْلُوْنَكَ وَ يَزِيْلُوْنَكَ] یعنی تجھے مائل کر دیں اور ہٹا دیں۔ اور پھر لکھا ہے کہ لفظ فتنہ کے معنی کلام عرب میں حق سے ایک طرف جھکا دینا ہے اور فتنہ کے معنی اضلال بھی آتے ہیں۔ (ل) اور اس حدیث میں کہ [إِنِّي أَرَى الْفِتَنَ خِلَالَ بُيُوتِكُمْ] (مسند البزار: جلد1، صفحہ 395) ''میں فتنوں کو تمہارے گھروں کے اندر دیکھتا ہوں۔'' فتنہ سے مراد وہ اختلاف ہے جو مسلمانوں کے فرقوں میں ہوگا۔ (ل) اور ان تینوں معنوں میں سے یعنی حق سے پھیرنا۔ گمراہ کرنا۔ اختلاف کوئی سے معنی یہاں مراد ہو سکتے ہیں۔ پس ﴿ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ﴾ کے معنی ہوئے حق سے پھیرنے کو چاہتے ہوئے یا گمراہی چاہتے ہوئے یا اختلاف چاہتے ہوئے۔ گویا متشابہات کی پیروی سے ان کی غرض حق کی بجائے غلطی کا پیدا کرنا ہوتا ہے یا لوگوں کو دین حق سے گمراہ کرنا یا اختلاف ڈالنا۔ حضرت مجاہد سے یہاں فتنہ کے معنی شبہات مروی ہیں۔ (ج) یعنی لوگوں کے دلوں میں شبہات پیدا کرنے کے لیے جیسا کہ اکثر مفسرین نے اسے کھول کر لکھا ہے کہ مراد یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں شکوک اور شبہات پیدا کر کے دین سے پھیر دیں۔

تَاْوِيْل۔ اَوَّلَ سے ہے جس کے معنی ہیں ایک چیز کا اصل کی طرف رجوع کرنا اور تاویل کے معنی ہیں: [رَدُّ الشَّيْءِ إِلَى الْغَايَةِ

يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَ ہیں وہ کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے سب ہمارے رب کی طرف سے ہے(377) اور

اَلْمُرَادَةِ مِنْهُ عِلْمًا كَانَ أَوْ فِعْلًا] (مفردات راغب: 31) ایک شے کا اس غایت کی طرف لوٹانا جس کا اس سے ارادہ کیا گیا ہو علمی طور پر ہو یا فعلی طور پر یہاں تاویل بلحاظ علم مراد ہے اور ﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ﴾[الأعراف: 53:7] ''کیا وہ اس کے (بتائے ہوئے) انجام کا ہی انتظار کرتے ہیں۔جس دن اس کا (بتایا ہوا) انجام آئے گا۔'' میں اور ﴿ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا﴾[بني إسرائيل: 35:17] ''یہ بہتر اور انجام کار بہت خوبی کی بات ہے۔'' میں تاویل فعلی یعنی مآل یا انجام مراد ہے۔

اپنی خواہش کے مطابق تاویل:

﴿ابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ﴾ تَأْوِيْلٌ کی ضمیر کہا گیا ہے کہ عہد کے لیے ہے یعنی اس سے مراد مخصوص تاویل یا ایسی تاویل ہے جو محکمات کے خلاف ہو اور اپنی خواہش کے مطابق۔(ر) اس لیے مفسرین نے عموماً ﴿ابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ﴾ کے معنی کیے ہیں [طَلَبُ تَأْوِيْلِ الَّذِيْ يَشْتَهُوْنَهُ] یعنی اس تاویل کو چاہتے ہوئے جو ان کی اپنی خواہش ہوتی ہے اور یا یہ مراد ہے جیسے لفظ ابْتِغَآءَ کے معنی بھی اس پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ اس کی تاویل کی طلب میں حد سے تجاوز کرتے ہیں اور وہ حد سے تجاوز کرنا یہ ہے کہ اسے محکمات کی طرف نہیں پھیرتے۔متشابہ الفاظ کے معنی میں ابْتِغَآءَ یہی ہے کہ انسان ایسا ان الفاظ کے پیچھے پڑے کہ دوسرے الفاظ یا اصول کی طرف توجہ نہ کرے۔اور اکثر متشابہ کی پیروی کرنے والوں کو یہی غلطی لگتی ہے کہ وہ ان الفاظ کے ایسا پیچھے پڑتے ہیں کہ باقی بڑی بڑی اور روشن اور واضح باتوں کی پرواتک نہیں کرتے اور اس میں بھی شک نہیں کہ یہ محض اپنی خواہش کی پیروی کی وجہ سے ہوتا ہے۔پہلے انسان اپنے دل میں ایک خیال بٹھالیتا ہے۔پھر متشابہ الفاظ کو لے کر اور الفاظ کو توڑ مروڑ کر اپنا مطلب نکالنا چاہتا ہے۔

377- رَاسِخُوْنَ۔رَسُوْخٌ کے معنی ہیں کسی چیز کا نہایت ہی مضبوطی کے ساتھ قائم ہوجانا اور راسخ فی العلم علم میں متحقق کو کہتے ہیں۔(غ)

یہاں اللہ اور ﴿الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ﴾ دونوں جگہ پر وقف ہے۔اس لیے ﴿وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ﴾ دونوں طرف ملتا ہے۔یعنی اس کی تاویل کوئی نہیں جانتا سوائے اللہ کے اور ﴿الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ﴾ کے۔اور یہ بتانے کو وہ **راسخ فی العلم کس طرح اس تاویل کو جانتے ہیں**۔یہ الفاظ بڑھا دیئے ہیں: ﴿يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا﴾ یعنی ہم **متشابہات اور محکمات دونوں کو خدا کی طرف سے مانتے ہیں**۔گویا **ان کا اصول یہ ہے کہ متشابہات کو محکمات پر عرض کرتے ہیں**۔چنانچہ بخاری میں اسی طرح پر ان الفاظ کے معنی کیے ہیں: [(وَالرّٰسِخُوْنَ) يَعْلَمُوْنَ (يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ)] (صحيح البخاري، التفسير، باب قوله: منه آيات محكمت) یعنی راسخ بھی ان معنوں کو جانتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لائے اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مجاہد کی وساطت سے یہ قول مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: [أَنَا مِنَ الرَّاسِخِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ تَأْوِيْلَهُ] (تفسير ابن كثير:

مَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝ عقل والوں کے سوائے کوئی نصیحت قبول نہیں کرتا۔(378)

جلد2، صفحہ 11) (ث) میں ان راسخوں میں سے ہوں جو اس کی تاویل کو جانتے ہیں اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے متعلق صحیح حدیث میں آتا ہے: [اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ وَعَلِّمْهُ التَّأْوِيلَ] (مسند أحمد: جلد4، صفحہ 225؛ مؤسسة الرسالة) ''اے اللہ اس کو دین کی سمجھ دے اور اس کو تاویل سکھا'' اور محکمات کے معنی تو واضح ہوتے ہیں اس لیے یہ دعا متشابہات کی تاویل کے متعلق ہی ہوسکتی ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر متشابہات کے معنی راسخین فی العلم کو بھی معلوم نہیں ہو سکتے تو ان کا انسانوں کی ہدایت کے لیے نازل کرنا بے معنی ہے۔ باقی رہیں بعض اشیاء جیسے جنت و نار وغیرہ کی حقیقت تو اس کے معلوم کرنے کی ہمیں یہاں کوئی ضرورت بھی نہیں۔ ہاں جب اس عالم سے کوچ کر کے دوسرے عالم میں منتقل ہو جائیں گے تو ان کی حقیقت بھی کھل جائے گی۔

378- اس آیت کریمہ میں قرآن شریف نے محکم اور متشابہ کا ایک اصول بیان فرمایا ہے۔ اس میں عیسائیت کے بطلان کی طرف اشارہ کیا ہے کیونکہ **عیسائیوں نے محکمات اور متشابہات میں فرق نہ کرنے کی وجہ سے ہی غلطی کھائی ہے**۔ عیسائی مذہب کی بنیاد صرف متشابہات پر ہے۔ سب سے بڑی دلیل حضرت مسیح کی خدائی کی یہ دی جاتی ہے کہ پیشگوئیوں میں آپ کو خدا کہا گیا تھا اور آپ کی آمد کو خدا کی آمد قرار دیا گیا ہے۔ مگر یہ کس قدر بودی بنیاد ہے۔ پیشگوئی تو خود متشابہات میں سے ہوتی ہے اور **پیشگوئیوں کی زبان میں استعارہ اور مجاز کا استعمال بکثرت ہوتا ہے**۔ چنانچہ خود مسیح علیہ السلام کی آمد کے جو نشانات ہیں ان کو ہی دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ کس قدر مجاز اور استعارہ ان کے اندر ہے اور حق تو یہ ہے کہ **جن پیشگوئیوں میں خدا کا لفظ آیا ہے وہ حضرت مسیح کے لیے نہیں بلکہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے متعلق ہیں** اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ خود حضرت مسیح نے بھی خدا کے آنے کی پیشگوئی کو بیان کیا ہے۔ دیکھو[متی: 21:33-40] جہاں انگورستان کے مالک کی تمثیل میں بیٹے کے آنے کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ پھر انگورستان کا مالک خود آئے گا اور آگے آیت 43 میں صفائی سے بتا دیا ہے کہ ''خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی اور ایک اور قوم کو جو اس کے میوہ لاوے دی جائے گی۔'' پس وہ خدا جس کے آنے کی پیشگوئیاں بائبل میں ہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں مگر باوجود ان پیشگوئیوں کے وہ خدائی کا دعویٰ نہیں کرتے۔

لیکن اس بات کو چھوڑ کر بائبل میں **لفظ خدا کا استعمال بطور مجاز نیک لوگوں کے حق میں موجود ہے**۔ ''میں نے تو کہا کہ تم الٰہ ہو اور تم سب حق تعالیٰ کے فرزند ہو۔'' [زبور: 6:82]۔[یوحنا: 34:10] میں حضرت مسیح اسی قول کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''جبکہ اس نے انہیں جن کے پاس خدا کا کلام آیا خدا کہا۔'' پس اول پیشگوئی خود ایک استعارہ ہے اس لیے اس میں خدا کی آمد کا ذکر ایک استعارہ سے بڑھ کر نہیں۔ پھر وہ پیشگوئیاں بھی مسیح کے لیے نہیں بلکہ حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہیں۔ پھر بغیر پیشگوئیوں کے بھی اسی بائبل میں لفظ خدا بطور مجاز نیک لوگوں کے حق میں استعمال ہوا۔ اس لیے اس کے معنی دوسری جگہ بھی

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَ هَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ

اے ہمارے رب! ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ ہونے دے، اس کے بعد کہ تو نے ہمیں ہدایت کی اور اپنے پاس سے ہمیں رحمت عطا فرما،

یہی مراد ہوں گے۔ پس ایک متشابہ امر کی بنیاد پر تمام محکمات کو رد کرنا یہ عیسائی مذہب کی خطرناک غلطی ہے اور **خود حضرت مسیح نے بھی ان کو بتا دیا تھا کہ وہ جو لفظ خدا کا بیٹا اپنے لیے استعمال کرتے ہیں تو اسی مجازی معنی کی رو سے**، جس مفہوم کو مدنظر رکھ کر سارے راستبازوں کو خدا اور خدا کا فرزند قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ جب یہودیوں نے حضرت مسیح کو سنگسار کرنے کی دھمکی دی تو حضرت مسیح نے ان سے دریافت کیا کہ میں نے خدا کی طرف سے بہت سے نیک کام کیے ہیں میرے کس نیک کام کے عوض مجھے سنگسار کرتے ہو؟ تو انہوں نے جواب میں کہا کہ اچھے کام کے لیے ہم تم کو سنگسار نہیں کرتے بلکہ اس لیے کہ تو کفر کہتا ہے ''اور انسان ہو کے اپنے تئیں خدا بناتا ہے۔'' [یوحنا: 33:1] تو حضرت مسیح نے اس کا جواب یہ دیا:

''کیا تمہاری شریعت میں یہ نہیں لکھا کہ میں نے کہا تم خدا ہو۔ جبکہ اس نے انہیں جن کے پاس خدا کا کلام آیا خدا کہا ۔۔۔۔تم اسے جسے خدا نے مخصوص کیا اور جہان میں بھیجا کہتے ہو کہ تو کفر بکتا ہے کہ میں نے کہا کہ میں خدا کا بیٹا ہوں۔'' [یوحنا: 10:34-36]

اب اس سوال و جواب پر غور کر لو اگر حضرت مسیح کا دعویٰ واقعی خدائی کا ہوتا تو جب آپ پر یہ الزام لگایا گیا کہ تم انسان ہو کر اپنے آپ کو خدا کہتے ہو تو اس کا جواب یوں دیتے کہ میں تو خدا ہی ہوں اور تمہاری پیشگوئیوں میں خدا کا آنا لکھا ہے۔ مگر بجائے اس کے آپ یہ جواب دیتے ہیں کہ تمہارے بزرگوں کو بھی خدا کے کلام میں خدا کہا گیا ہے اگر ان کا خدا کہلانا کفر نہیں تو میرا خدا کا بیٹا کہلانا کیوں کفر ہو گیا۔ بالفاظ دیگر جن معنوں میں وہ خدا کہلائے انہی معنوں میں مَیں خدا کا بیٹا ہوں۔ نہ وہ حقیقت میں خدا تھے نہ میں حقیقت میں خدا کا بیٹا ہوں۔ مگر مجازی طور پر ان کو بھی خدا کہا گیا۔ مجازی طور پر میں بھی خدا کا بیٹا ہوں۔ اس قدر صفائی کے ہوتے ہوئے عیسائیوں نے متشابہات کو لیا اور محکمات کو چھوڑ دیا۔ اس لیے ان کے عقیدہ کے بطلان میں اس مسئلہ کی توضیح کرنی ضروری تھی۔ پس اس بحث کی ابتدا میں اصولی طور پر یہ بیان کر کے خدا کی صفات مسیح میں نہ پائی جاتی تھیں۔ اب بتاتا ہے کہ ان کو ٹھوکر متشابہات سے لگی ہے اور یہ ان کے دلوں کی کجی کا نتیجہ ہے کہ محکمات کو چھوڑ کر متشابہات کی پیروی کرتے ہیں اور اسی اثناء میں مسلمانوں کو بھی متنبہ فرماتا ہے کہ تم ایسی غلطی میں نہ پڑنا۔

حضرت مرزا صاحب کی طرف دعویٰ نبوت منسوب کرنا متشابہات کی پیروی ہے:

مگر افسوس کہ آج بعینہٖ یہی غلطی وہ لوگ کرتے ہیں جو حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کی طرف دعویٰ نبوت منسوب کرتے ہیں اور ان کے ہاتھ میں بھی دلیل صرف یہی ہے کہ پیشگوئی میں آنے والے مسیح کے لیے لفظ نبی کا آ گیا ہے۔ حالانکہ اول تو

پیشگوئی میں استعارہ ہونا ایک مسلم امر ہے۔ دوسرے خود وہ پیشگوئی جس میں لفظ نبی ہے ساری کی ساری استعارات سے بھری ہوئی ہے۔ بعینہٖ اسی طرح جب اس مسیح ثانی پر یہ اعتراض ہوا کہ تم نے اپنے تحریروں میں لفظ نبی استعمال کیا ہے تو آپ نے جواب دیا کہ کیا پہلے کسی بزرگ نے نہیں کہا ''اُو نبی وقت باشد اے مرید'' یعنی مرشد نبی وقت کا حکم رکھتا ہے۔ جس میں صاف بتادیا کہ میری تحریر میں لفظ نبی اصطلاح شرعی میں نہیں بلکہ لغوی معنی میں ہے اور مجازی رنگ میں۔ جس طرح پہلے بزرگوں نے بھی مجازی رنگ میں اسے استعمال کرلیا ہے اور اسی پر بس نہیں کی بلکہ آخر تک صاف لفظوں میں لکھ دیا: [سُمِّيْتُ نَبِيًّا مِنَ اللّٰهِ عَلٰى طَرِيْقِ الْمَجَازِ لَا عَلٰى وَجْهِ الْحَقِيْقَةِ] (حقیقۃ الوحی) میرا نام خدا کی طرف سے مجاز کے طور پر نبی رکھا گیا نہ حقیقت کے طور پر۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ قرآن کریم نے محکمات اور متشابہات کی تفسیر میں اصول کیا بیان فرمایا ہے۔ کیونکہ یہاں آکر ایک دوسری دقت پیش آتی ہے کہ ایک ایک لفظ کے کئی کئی معنی ہوتے ہیں۔ خودغرض لوگ اپنے حسب منشا جس کو چاہتے ہیں متشابہ بنا کر اسے کسی دوسری آیت کے ماتحت کردیتے ہیں یا اس کی تاویل اپنے حسب منشا کرلیتے ہیں۔ ایک شخص اسی کو محکم کہتا ہے دوسرا اسی کو متشابہ کہتا ہے۔ تو پس اس کا بھی کوئی علاج قرآن کریم نے بتایا ہے یا نہیں؟ اگر الفاظ قرآنی پر غور کیا جائے تو ایک ایسی پکی بات بتادی ہے کہ تمام جھگڑے اٹھ جاتے ہیں اور وہ بات یہ ہے کہ **محکمات کے متعلق فرمادیا ہے** کہ اس سے کیا مراد ہے۔ ﴿هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ﴾ وہ کتاب کی اصل یا جڑ ہیں۔ اب ام یا جڑ اس چیز کو کہتے ہیں جو بطور اصل ہو۔ تو پس قرآن کریم ہمیں یہ ہدایت دیتا ہے کہ **محکمات سے مراد اصولی امور ہیں**۔ اور طرز تاویل یہ ہوگی کہ فروعات اور مخصوصات کو جو بطور شاخوں یا ولد کے ہیں، جڑ اور ام کی طرف لوٹانا پڑے گا۔ یعنی اصول کے ماتحت کرنا پڑے گا کیونکہ حق یہی ہے کہ **جب تک مخصوصات اور فروعات کو اصول کے ماتحت نہ لایا جائے اس وقت تک حق بات انسان معلوم نہیں کرسکتا**۔ مخصوصات کو اگر اصول اور قانون سے الگ کیا جائے تو اس کا نتیجہ وہی ہے جو قرآن کریم نے بیان فرمایا: ﴿اِبْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَ اِبْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ﴾ ایک مخصوص امر کی تاویل کے پیچھے پڑ کر ایک فتنہ پیدا ہوجاتا ہے کہ بعض کا مفہوم بعض کے خلاف ہوجاتا ہے۔ پس ضروری ہوا کہ کسی امر مخصوص کے صحیح معنی سمجھنے کے لیے پہلے ایک اصول قائم کیا جائے اور اس اصول کے ماتحت اس کی تاویل کی جائے۔ یہی وہ راہ ہے جو قرآن کریم نے سکھائی ہے اور اس راہ پر چل کر نہ صرف بیرونی تفرقوں کا علاج ہی ہوسکتا ہے بلکہ مسلمانوں کے جس قدر اندرونی اختلافات ہیں ان کا بھی ایک حد تک فیصلہ ہوجاتا ہے اور جو اختلافات باقی رہ جائیں گے وہ اصولی اختلافات نہ ہوں گے کیونکہ قرآن کریم کا یہ دعویٰ ہے کہ اس نے تمام امور ضروریہ کی تکمیل کردی ہے۔ اب فروعات تو اس قدر وسیع دائرہ رکھتی ہیں کہ تا قیامت بھی ان کو ایک دفتر میں اکٹھا نہیں کیا جاسکتا۔ روز نئی نئی فروعات پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ پس یہ ماننا پڑے گا کہ سب اصول کو قرآن کریم نے واضح کرکے بیان کردیا ہے اور فروع میں سے حسب ضرورت کچھ لے لیا ہے۔ اس لیے بھی فروع کو اصول کے ماتحت کرسکتے ہیں نہ اصول کو فروع کے ماتحت۔ اسی بات کی طرف عدم توجہی نے مذاہب میں غلطیاں پیدا کیں اور اسی اصول کو مدنظر نہ رکھنے کی وجہ سے مختلف اسلامی فرقوں نے ایک دوسرے کے خلاف قرآن سے ہی نتائج اخذ کیے۔ اگر سب لوگ اس بات پر کاربند ہوں کہ اصول کو تو چونکہ محکم کرنے کا ذکر خود قرآن کریم میں ہے پس ہر ایک فرع کو قرآن کریم کے قائم کردہ اصول پر

اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝٨

بے شک تو ہی بہت عطا کرنے والا ہے۔(379)

رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝٩ ع ۱ ۹ ۹

اے ہمارے رب! ضرور تو لوگوں کو اس دن کے لیے اکٹھا کرنے والا ہے جس میں کچھ شک نہیں بے شک اللہ وعدہ کا خلاف نہیں کرتا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْھُمْ اَمْوَالُھُمْ وَلَآ اَوْلَادُھُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ ھُمْ وَقُوْدُ النَّارِ ۝١٠

جنہوں نے انکار کیا، ان کے مال اور ان کی اولاد اللہ (کے عذاب) کے سامنے ان کے کسی کام نہ آئے گی اور وہی آگ کا ایندھن ہیں۔(380)

پیش کیا جائے تو بہت سے جھگڑے اٹھ جاتے ہیں

379- اَلْوَهَّابُ۔ اسمائے الٰہی میں سے ہے۔ هِبَةٌ کے معنی ہیں اپنی ملک بلاعوض غیر کو دے دینا۔ (غ) اور اَلْوَهَّابُ اس امر کو ظاہر کرنے کے لیے ہے: [أَنَّهُ يُعْطِيْ كُلًّا عَلٰى قَدَرِ اسْتِحْقَاقِهِ] (غ) یعنی ہر ایک کو بقدر استحقاق دیتا ہے۔

اس دعا کی اس مقام پر تعلیم صاف اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ **متشابہات کی پیروی** میں لگ کر دین میں فتنہ پیدا کرنے والے وہی لوگ ہوتے ہیں جو پہلے ہدایت پا چکتے ہیں کیونکہ ان کے متعلق فرمایا تھا کہ ان کے دلوں میں زیغ یعنی کجی ہوتی ہے۔ اس لیے اب **مومنوں کو اسی زیغ سے بچنے کی دعا سکھاتا ہے**۔ نبی کریم ﷺ کے دل میں اپنی امت کے لیے اس قدر رحمت جوش مارتی تھی کہ ان کی تعلیم کے لیے آپ اس دعا کو بہت کثرت سے پڑھا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے: [اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَقُولُ: "يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوبِ ثَبِّتْ قَلْبِي عَلَى دِينِكَ"، ثُمَّ قَرَأَ: ﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ﴾] (ابن كثير: جلد2، صفحه 13) یعنی نبی کریم ﷺ یوں دعا کیا کرتے تھے اے دلوں کے پھیرنے والے میرے دل کو اپنے دین پر مضبوط رکھیو۔ پھر آپ یہ آیت ﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا﴾ پڑھا کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی نسبت بھی روایت ہے کہ آپ سورہ فاتحہ کے بعد یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔ اس میں مومن کو سکھایا ہے کہ اپنے نفس پر بھروسہ نہ کرے۔ بلکہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی مدد کا طالب ہو۔

380- ﴿لَنْ تُغْنِيَ عَنْھُمْ﴾ اَغْنٰى عَنْهُ كَذَا کے معنی ہیں كَفَاهُ۔ (غ) یعنی وہ شے اس کے لیے کافی ہوگئی اور یہی معنی اَغْنَاهُ کے ہیں۔ جیسا کہ ﴿لِكُلِّ امْرِیٍٔ مِّنْھُمْ يَوْمَىِٕذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ﴾ [عبس: 37:80] ''ہر انسان کے لیے اس دن ایک کام ہوگا جو اسے کافی ہوگا۔'' اور اَغْنٰى عَنْهُ کا زیادہ استعمال ہے۔ ﴿مَآ اَغْنٰى عَنِّيْ مَالِيَهْ﴾ [الحآقة: 28:69] ''میرے مال نے مجھے کام نہ دیا۔''

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ⑪

(ان کا حال) فرعون کے لوگوں اور ان کے حال کی طرح ہے، جو ان سے پہلے تھے انہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا، پس اللہ نے ان کو ان کے گناہوں کے سبب پکڑا اور اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔ (381)

﴿مَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يُمَتَّعُوْنَ﴾ [الشعرآء: 207:26] ''تو جس سامان سے فائدہ اٹھاتے رہے ان کے کسی کام نہ آئے گا۔'' ﴿لَّا تُغْنِ عَنِّيْ شَفَاعَتُهُمْ﴾ [یٰسٓ: 23:36] ''تو ان کی سفارش میرے کسی کام نہ آئے گی۔'' ﴿وَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ﴾ [المرسلٰت: 31:77] ''اور نہ شعلے سے بچاتا ہے۔'' ﴿اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا﴾ [الجاثیة: 19:45] ''وہ اللہ کے سامنے تیرے کچھ بھی کام نہ آئیں گے۔''

﴿مِنَ اللّٰهِ﴾ مِنْ ابتدائے غایت کے لیے ہے اور مراد ہے ﴿مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ﴾ اور اس پر دلیل یہ ہے کہ اگلی آیت میں جو مثال دی ہے اس میں اللہ کے عذاب کا ہی ذکر ہے۔ بعض نے مِنْ کو یہاں بدل کے معنی میں لیا ہے۔ (مغنی) یعنی اللہ کی طاعت یا اس کی رحمت کے بدل میں یہ چیزیں کچھ کام نہ آئیں گی۔

کفار کی مغلوبیت کی پیشگوئی:

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے خاص خطاب اس سورت کے صدر میں عیسائیوں سے ہے۔ چنانچہ بعض نے یہاں مراد وفد نجران لیا ہے۔ (ر) یعنی وہ وفد جو عیسویت کا قائم مقام ہو کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے مالوں اور جتھے پر جس قدر فخر عیسائی اقوام کو ہے شاید ہی کسی قوم کو ہوا ہو۔ مگر چونکہ الفاظ عام ہیں اس لیے ہر قسم کے کافر اس کے اندر شامل ہیں جو اسلام کو نابود کرنا چاہیں۔

381- دَاْبٌ۔ دَاْبٌ کے معنی ہیں کوشش کی اور تھک گیا۔ پس دَاْبٌ اور دَأْبٌ دونوں کے معنی عادت اور شان یعنی حالت آتے ہیں۔ (ل) مگر ازہری نے کہا ہے کہ دَاْبٌ سے مراد ان کا کفر میں سخت زور لگانا [اِجْتِهَادُهُمْ فِي الْكُفْرِ] اور نبی ﷺ کی مخالفت پر ایک دوسرے کے مددگار بننا ہے جیسا کہ فرعون کے لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف ایک دوسرے کے مددگار ہوئے۔ (ل)

ذُنُوْبٌ۔ ذَنْبٌ کی جمع ہے [وَالذَّنْبُ فِي الْأَصْلِ اَلْأَخْذُ بِذَنَبِ الشَّيْءِ]۔ (غ) ذَنْبٌ اصل میں کسی چیز کی ذَنَبْ یعنی دم یا مؤخر حصہ کے پکڑنے کا نام ہے: [وَيُسْتَعْمَلُ فِيْ كُلِّ فِعْلٍ يَسْتَوْخِمُ عُقْبَاهُ اِعْتِبَارًا بِذَنَبِ الشَّيْءِ]۔ (غ) اور ذَنْبٌ ہر ایک اس فعل پر استعمال ہوتا ہے جس کا انجام ناگوار اور گراں ہو۔ گویا وہ بمنزلہ ایک چیز کی دم کے ہے لسان العرب میں ہے: [اَلذَّنْبُ الْاِثْمُ وَالْجُرْمُ وَالْمَعْصِيَةُ] یعنی ذَنْبٌ اثم جرم اور معصیت تینوں پر شامل ہے۔ اب اِثْمٌ ہر

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَ تُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ؕ وَ بِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۲﴾

جنہوں نے انکار کیا ان سے کہہ دے کہ تم جلد مغلوب کیے جاؤ گے، اور جہنم کی طرف ہانکے جاؤ گے، اور کیا ہی برا بچھونا ہے۔ (382)

ایک اس فعل کا نام ہے جو ثواب سے انسان کو روکتا ہے۔ جرم ان افعال کا نام ہے جن کی وجہ سے گویا جناب الٰہی سے قطع تعلق ہو جاتا ہے کیونکہ اس کا اشتقاق جرم بمعنی قطع سے ہے اور معصیت اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کو کہتے ہیں خواہ عمداً ہو یا سہواً۔ گو جو نافرمانی سہو سے ہو وہ قابل مؤاخذہ نہیں۔ پس معلوم ہوا کہ ذنب کا لفظ زبان عربی میں نہایت وسیع ہے اور اس سے مراد وہ افعال بھی ہو سکتے ہیں جو فی الحقیقت گناہ نہیں اور نہ نافرمانیاں ہیں۔ مگر ان کا انجام ناگوار ہے اور ایسی نافرمانی بھی اس سے مراد ہو سکتی ہے جس میں عمد اور ارادہ کا کوئی دخل نہیں اور ایسے سخت گناہ بھی اس سے مراد ہو سکتے ہیں جو جناب الٰہی سے قطع تعلق کا موجب ہو جائیں۔ پس لفظ ذنب کا صحیح ترجمہ گناہ نہیں بلکہ قریب تر لفظ جو اس کے مفہوم کو ادا کرتا ہے قصور ہے اور کبھی وہ اتنا چھوٹا ہو گا کہ اس میں کرنے والے پر کوئی الزام نہیں اور بعض وقت بہت بڑا جیسے یہاں۔

فرعون کے لوگوں کی حالت کا ذکر کر کے یہ بتا دیا کہ جس طرح وہ دنیا میں مغلوب و ذلیل ہوئے اسی طرح مخالفین اسلام کی حالت بھی ہو گی۔

382- تُحْشَرُوْنَ۔ حَشْرٌ کسی جماعت کو اپنی جائے قرار سے نکال دینا اور وہاں سے بے آرام کر کے جنگ وغیرہ کی طرف لے جانا ہے۔ چنانچہ اس روایت [اَلنِّسَاءُ لَا يُحْشَرْنَ] (المفردات للراغب: جلد1، صفحہ 119) میں معنی یہ ہیں: [لَا يُخْرَجْنَ اِلَى الْغَزْوِ]۔ (غ) یعنی عورتوں کو جنگ کے لیے نکلنے پر مجبور نہ کیا جائے گا اور حشر کا لفظ سوائے جماعت کے نہیں بولا جاتا۔ (غ) ﴿وَ ابْعَثْ فِي الْمَدَآىِٕنِ حٰشِرِيْنَ﴾ [الشعرآء: 36:26] ''اور شہروں میں نقیب بھیج دے۔'' ﴿وَ الطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً﴾ [صٓ: 19:38] ''اور پرندوں کو جو اکٹھے کیے گئے تھے۔'' ﴿وَ اِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ﴾ [التکویر: 5:81] ''اور وحشی اکٹھے کیے جائیں گے۔'' ﴿وَ حُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ﴾ [النمل: 17:27] ''اور سلیمان کے لیے لشکر اکٹھے کیے گئے۔'' ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ﴾ [الحشر: 2:59] ''وہی ہے جس نے اہل کتاب میں سے ان لوگوں کو جو کافر ہیں اپنے گھروں میں سے پہلی جلاوطنی کے لیے نکالا'' اور قیامت میں لوگوں کے اکٹھا کیے جانے پر بھی لفظ حشر بولا گیا ہے۔

کفار کی مغلوبیت کی پیشگوئی سخت ترین مخالفت کے وقت:

اس آیت میں اور بھی صفائی سے بیان کیا ہے کہ جو لوگ اسلام کی مخالفت پر کمر بستہ ہوں گے وہ ضرور پہلے اسی دنیا میں مغلوب ہوں گے پھر جہنم کی طرف اکٹھے کر کے چلائے جائیں گے اور اس دنیا میں ان کی مغلوبیت آخرت میں جہنم کا ثبوت ہو گی۔ یہ پیشگوئی اس زمانہ کی ہے کہ ابھی نبی کریم ﷺ کی جمعیت ملک عرب میں دشمنوں کے مقابلہ پر کچھ بھی نہ تھی اور مخالفت ایک

قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ؕ ان دو گروہوں میں جن کی آپس میں مڈبھیڑ ہوئی یقیناً تمہارے لیے نشان تھا۔ (383)

مشرکین عرب کی طرف سے ہی نہ تھی بلکہ اندرونی مخالف منافق اور بیرونی مخالف عرب کے سب مشرک اور یہود اور نصاریٰ اسلام کی مخالفت پر کمربستہ ہو چکے تھے۔ ان حالات میں ایسے صاف الفاظ میں کفار کی مغلوبیت کی پیشگوئی کرنا اور پھر اس پیشگوئی کا آنحضرت ﷺ کے سامنے پورا ہو جانا اسلام کی صداقت کے چمکتے ہوئے نشانوں میں سے ایک نشان ہے۔ اور آج ایک مسلمان کے قلب کو اس بات سے قوت ملتی ہے کہ وہ خدا جس نے اپنا وعدہ ان حالات میں پورا کیا وہ اسلام کی ہر ایک بے کسی کے وقت اس کا حامی ہوگا اور اس کے مخالفین کو مغلوب کرے گا۔

383- **اس آیت میں بالخصوص اہل کتاب مخاطب ہیں۔** کیونکہ اس سورت کے ابتدائی حصہ میں اصل خطاب انہیں کے ساتھ چلتا ہے۔ علاوہ ازیں اس میں مشرکوں اور مسلمانوں کے مقابلہ اور جنگ کی طرف توجہ دلائی ہے۔ پس جس کو توجہ دلائی ہے وہ کوئی تیسرا گروہ ہے اور یہ عیسائی ہیں جن کے ساتھ اصل بحث چلتی ہے۔ دو گروہوں کی مڈھ بھیڑ سے مراد جنگ بدر ہے جیسا کہ اگلے الفاظ میں صاف اشارہ بھی ہے کہ ایک گروہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتا تھا اور دوسرا گروہ کافروں کا تھا جو دیکھنے میں ان سے دوچند تھے۔

جنگ بدر میں آنحضرت ﷺ کی صداقت کا نشان ایک تو اس طرح تھا کہ قرآن کریم کی مکی سورتوں میں مسلمانوں اور کفار کے درمیان ایک مڈھ بھیڑ کی خبر بار بار دی گئی تھی۔ جس میں کفار کی ہزیمت اور مسلمانوں کی فتح کی پیشگوئی کی گئی تھی۔ یہاں تفصیل کے ساتھ ان پیشگوئیوں کے ذکر کا موقعہ نہیں۔ صرف ایک پیشگوئی پر کفایت کی جاتی ہے سورۃ القمر میں آخری رکوع میں ہے:

﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ ۝ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَ يُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ۝ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَ السَّاعَةُ اَدْهٰى وَ اَمَرُّ ۝﴾ [القمر: 54:44-46] ”کیا یہ (کفار) کہتے ہیں کہ ہم ایک جماعت ہیں ایک دوسرے کی مدد کرنے والے ان کی جماعت کو ہزیمت دی جائے گی اور وہ پیٹھیں پھیر کر واپس ہو جائیں گے۔ ہاں ایک گھڑی ان کے وعدے کا وقت ہے اور وہ گھڑی بڑی سخت اور تلخ ہوگی۔“ کہا جائے گا کہ یہ تو قیامت کے متعلق ہے۔ مگر جیسا کہ میں بار بار کہہ چکا ہوں قرآن کریم نے پیشگوئی میں ایسی لطیف طرز اختیار کی ہے کہ قیامت کی رسوائی کے ساتھ اس دنیا کی مغلوبیت کا ذکر بھی کیا ہے تا کہ ایک کے پورا ہو جانے سے دوسرے کی صداقت پر شہادت ہو۔ مگر یہاں سَاعَةٌ سے مراد وہی ہزیمت کی ساعت ہے ورنہ قیامت کے دن ہزیمت اور جنگ کا کیا ذکر ہے وہ تو اسی دنیا میں ہوگی اور یہ بھی ایک معنی میں ان کے لیے قیامت ہی ہے۔ ہاں پھر قیامت میں اس سے بھی زیادہ سختی اور تلخ کامی دیکھیں گے۔ اس بات کا ثبوت کہ خود نبی کریم ﷺ اس پیشگوئی سے بدر کی جنگ مراد لیتے تھے صحیح احادیث سے ملتا ہے۔ چنانچہ اس آیت کی تفسیر میں بخاری میں ہے: [عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ وَهُوَ فِي قُبَّةٍ لَهُ يَوْمَ بَدْرٍ: "اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَنْشُدُكَ عَهْدَكَ وَوَعْدَكَ. اَللّٰهُمَّ إِنْ شِئْتَ لَمْ تُعْبَدْ بَعْدَ الْيَوْمِ أَبَدًا." فَأَخَذَ أَبُو بَكْرٍ بِيَدِهِ فَقَالَ: حَسْبُكَ يَا رَسُولَ اللهِ! أَلْحَحْتَ عَلٰى رَبِّكَ. وَهُوَ يَثِبُ فِي الدِّرْعِ، فَخَرَجَ

فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ اُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ؕ وَ اللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ

ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑتا تھا اور دوسرا کافر تھا، وہ ان کو ظاہر آنکھ سے اپنے سے دو چند دیکھتے۔ اور اللہ اپنی مدد کے ساتھ جس کو چاہے قوت دیتا ہے۔

وَهُوَ يَقُولُ: ﴿سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَ يُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ۝ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَ السَّاعَةُ اَدْهٰى وَ اَمَرُّ ۝﴾] (صحيح البخاری، كتاب الجهاد، باب قَوْلِهِ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ أَدْهَى وَأَمَرُّ : 4877) ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ بدر کے دن نبی ﷺ ایک چھوٹے سے خیمہ میں تھے اور **بارگاہ الٰہی میں یوں دعا کر رہے تھے:** ''میں تیرے عہد اور تیرے وعدہ کا واسطہ دیتا ہوں۔ اے اللہ! اگر تیری ایسی ہی مشیت ہے (یہ نظر بحالت ظاہر تھا کیونکہ بظاہر مسلمان کفار کے سامنے اتنے تھوڑے اور بے سامان تھے کہ ان کے ہاتھوں ان کا کچلا جانا صاف نظر آتا تھا) تو آج کے دن کے بعد زمین میں تیری پرستش نہیں کی جائے گی۔'' ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آپ کا ہاتھ پکڑا اور کہا یا رسول اللہ بس کیجیے۔ آپ نے اپنے رب پر الحاح کیا ہے۔ آپ نے زرہ پہنی ہوئی تھی۔ پس آپ نکلے اور یہ آیت پڑھ رہے تھے: ﴿سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَ يُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ۝ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَ السَّاعَةُ اَدْهٰى وَ اَمَرُّ ۝﴾ اسی قسم کی اور بہت سی پیشگوئیاں اسی جنگ کے متعلق قرآن کریم میں تھیں۔ پس ایک طرف پیشگوئیوں کا پہلے موجود ہونا، دوسری طرف باوجود مسلمانوں کی قلت اور بے سروسامانی اور دشمن کی کثرت اور مسلح ہونے کے کفار کا ہزیمت اٹھانا ان دونوں باتوں نے جنگ بدر کو ایک عظیم الشان نشان بنا دیا تھا۔ تو اب دوسرے مخالفت کرنے والوں کو کہا جاتا ہے کہ اسی نشان پر غور کرو۔

بائبل میں جنگ بدر اور ہجرت کی پیشگوئیاں:

اور اہل کتاب یعنی عیسائیوں کے لیے بالخصوص ایک نشان جنگ بدر میں یہ تھا کہ جنگ بدر کی پیشگوئی ان کی کتابوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ کی ہجرت اور بدر میں قریش کی طاقت کو کمزور کیا جانے کی پیش گوئی صاف الفاظ میں یسعیاہ نبی کی کتاب میں موجود ہے۔ دیکھو [یسعیاہ: 13:21 تا 17] آیت تک۔

''عرب کی بابت الہامی کلام'':

''عرب کے صحرا میں تم رات کو کاٹو گے۔ اے ودانیوں کے قافلو! پانی لے کے پیاسے کا استقبال کرنے آؤ۔ اے تیما کی سرزمین کے باشندو! روٹی لے کے بھاگنے والے کے ملنے کو نکلو۔ کیونکہ وے تلواروں کے سامنے سے ننگی تلوار سے اور کھینچی ہوئی کمان سے اور جنگ کی شدت سے بھاگے ہیں۔ کیونکہ خداوند نے مجھ کو یوں فرمایا۔ ہنوز ایک برس۔ ہاں مزدور کے سے ایک ٹھیک برس میں قیدار کی ساری حشمت جاتی رہے گی اور تیر اندازوں کے جو باقی رہے قیدار کے بہادر لوگ گھٹ جائیں گے کہ خداوند اسرائیل کے خدا نے یوں فرمایا۔''

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ ﴿۱۳﴾ بصیرت والوں کے لیے اس میں یقینی عبرت ہے۔(384)

اب صاف ظاہر ہے کہ بھاگنے والے میں آنحضرت ﷺ کی ہجرت کی طرف اشارہ ہے جس میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ کے ساتھ تھے۔ اور درحقیقت ساری تاریخ مقدس میں ایک ہی شخص کے بھاگنے کو یہ عظمت حاصل ہوئی کہ اس سے ایک سنہ چل پڑا۔ پس اس بھاگنے میں آپ کی ہجرت کی طرف اشارہ ہے اور الفاظ ''عرب کی بابت الہامی کلام'' اس واقعہ کو عرب پر ہی محدود کرتے ہیں۔ اب بھاگنے کے ذکر کے تعلق میں یہ کہا کہ ایک سال کے اندر قیدار کی ساری حشمت جاتی رہے گی اور قیدار کے بہادر لوگ گھٹ جائیں گے، سو ایسا ہی ہوا کہ جنگ بدر کا وقوع جو ہجرت کے ایک سال کے گزر جانے کے بعد ہوا اس میں قیدار کی حشمت جاتی رہی اور ان کے بہادر لوگ گھٹ گئے۔ قیدار کا لفظ بائبل میں بہت مرتبہ بنی اسماعیل کے متعلق استعمال ہوا ہے۔ پس اہل کتاب کے لیے یہ کھلا کھلا نشان جنگ بدر میں تھا۔

384- عِبْرَةً۔ عَبَرٌ کے اصل معنی ہیں ایک حال سے دوسرے حال کی طرف تجاوز کرنا۔ اسی سے عبور ہے اور اعتبار اور عبرۃ سے وہ حالت مراد ہے جس کے ساتھ ایک دیکھی ہوئی چیز کی معرفت سے اس چیز کی معرفت حاصل کی جائے جو دیکھی نہیں گئی۔ (غ)

﴿یَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَیْهِمْ رَاْیَ الْعَیْنِ﴾ ان کو ظاہر نظر میں اپنے سے دوچند دیکھتے تھے۔ یعنی مسلمان کفار کو بظاہر اپنے سے دوچند دیکھتے تھے اور سورہ انفال میں ہے: ﴿وَ اِذْ یُرِیْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَیْتُمْ فِیْۤ اَعْیُنِكُمْ قَلِیْلًا وَّ یُقَلِّلُكُمْ فِیْۤ اَعْیُنِهِمْ﴾ [الأنفال: 44:8] ''اور جب تم میں مڈھ بھیڑ ہوئی تو ان کو تمہاری نظر میں کم دکھاتا تھا اور تم کو ان کی نظر میں کم دکھایا۔'' ان دونوں بیانات میں کوئی مخالفت نہیں ہے۔ اصل واقعہ یوں ہے کہ کفار کی کل جمعیت ایک ہزار کے قریب تھی اور مسلمان تین سو کے قریب تھے۔ تو ﴿یَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَیْهِمْ﴾ سے یہ ثابت ہوا کہ مسلمانوں کو وہ کوئی چھ سو کے قریب نظر آتے تھے وجہ یہ تھی کہ بقیہ حصہ پہاڑ کی اوٹ میں تھا اور یہ دوچند دکھانا بے معنی نہ تھا بلکہ اس میں حکمت یہ تھی کہ یہ بھی ارشاد الٰہی ہو چکا تھا: ﴿فَاِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ یَّغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ ۚ وَ اِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ یَّغْلِبُوْۤا اَلْفَیْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ [الأنفال: 66:8] کہ اگر تم میں سے ایک سو صابر ہوں گے تو دو سو پر غالب آئیں گے۔ اور ایک ہزار تم میں سے ہوں گے تو دو ہزار پر غالب آئیں گے۔ تو چونکہ یہ وعدہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو چکا تھا کہ تم دوچند جمعیت پر غالب آؤ گے گو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ زیادہ پر غالب نہیں آئیں گے۔ تاہم اس لیے کہ مسلمانوں کے حوصلے مضبوط رہیں اور انہیں یقین کامل رہے کہ ہم دشمن پر غالب آئیں گے ان کو اسی قدر حصہ دکھایا گیا جو تعداد میں ان کی اپنی جمعیت سے دوچند تھا۔ تو اس طرح پر کفار مسلمانوں کو تھوڑے کر کے دکھائے گئے اور مسلمان بھی کفار کو تھوڑے سے دکھائے گئے۔ کیونکہ وہ تو واقعی تھے ہی تھوڑے۔ پس انہوں نے مسلمانوں کو ہیچ سمجھا اور یہ خیال کیا کہ ہم فوراً ان کو نابود کر دیں گے۔ اگر یہ خیال ان کے دلوں میں نہ ہوتا تو ممکن تھا کہ جنگ کو ٹال دیتے لیکن اللہ تعالیٰ اس میدان میں پیشگوئیوں کے مطابق کفار کی طاقت کو توڑنا چاہتا تھا۔ پس قرآن کریم کی سب آیات ایک دوسری کی مؤید ہیں۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَ الْبَنِيْنَ وَ الْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَ الْفِضَّةِ وَ الْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَ الْاَنْعَامِ وَ الْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ اللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴿۱۴﴾

لوگوں کو نفسانی خواہشوں کی محبت بھلی معلوم ہوتی ہے (جیسے) عورتیں اور بیٹے اور ڈھیروں ڈھیر سونا اور چاندی اور پلے ہوئے گھوڑے اور مویشی اور کھیتی۔ یہ اس ورلی زندگی کا سامان ہے اور اللہ کے پاس اچھا ٹھکانا ہے۔ (385)

385- شَهَوَاتٌ۔ شَهْوَةٌ کی جمع ہے اور اس کے اصل معنی نفس کا اس چیز کا اشتیاق ہے جس کا تم ارادہ کرو اور دنیا میں شہوات انسانی دو طرح پر ہیں۔ ایک سچی اور ایک جھوٹی۔ شہوت صادقہ وہ ہے کہ اس خواہش کے پورا ہوئے بغیر بدن میں اختلال واقع ہو اور کاذبہ وہ ہے جو ایسی نہ ہو اور کبھی مشتہی کو (یعنی اس چیز کو جس کی خواہش کی گئی ہے) بھی شہوۃ کہا جاتا ہے۔ (غ) اور یہاں مراد مشتہیات ہی ہیں۔

﴿الْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ﴾ قَنَاطِيْرُ قِنْطَارٌ کی جمع ہے۔ قَنْطَرَةٌ جَسْرٌ یعنی پل کو کہتے ہیں اور بلند عمارت کو بھی کہتے ہیں۔ اور قِنْطَارٌ ایک معیار ہے جس کے متعلق اختلاف ہے۔ کسی نے کہا چالیس اوقیہ ہوتا ہے، کسی نے کہا بارہ سو دینار، کسی نے کہا بارہ سو اوقیہ، کسی نے کہا سترہ ہزار دینار۔ مگر حق وہ ہے جو ابوعبیدہ نے کہا ہے کہ عرب قنطار کا وزن نہیں جانتے۔ (ل) اور قَنْطَرَ الرَّجُلُ کے معنی ہیں مال کثیر کا مالک ہوا۔ (ل) امام راغب کہتے ہیں: قَنَاطِيْرُ قَنْطَرَةٌ کی جمع ہے اور قَنْطَرَةٌ اس مال کو کہتے ہیں جس سے انسان کی زندگی گزر جائے۔ گویا پل پر سے عبور کے لحاظ سے یہ معنی ہیں اور یہ [غَيْرُ مَحْدُوْدِ الْقَدْرِ فِيْ نَفْسِهٖ] ہے یعنی اس کا اندازہ محدود نہیں بلکہ جس طرح غنا کے لیے کوئی خاص مقدار معین نہیں اسی طرح قَنْطَرَةٌ ہے اور ﴿الْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ﴾ کے معنی کیے ہیں [اَلْمَجْمُوْعَةُ قِنْطَارًا قِنْطَارًا]۔

اَلْخَيْلُ۔ خَيْلٌ کا لفظ اصل میں گھوڑے اور سوار دونوں پر یکجائی حالت میں بولا جاتا ہے (اس کی وجہ راغب نے لفظ خیال سے لی ہے کیونکہ خُيَلَاءُ متکبر کو کہتے ہیں اس لیے کہ وہ اپنے آپ کو دوسروں سے بڑھ کر خیال کرتا ہے اور جو شخص گھوڑے پر سوار ہوتا ہے وہ بھی ایسا ہی خیال کرتا ہے۔) پھر علیحدہ علیحدہ گھوڑے اور سوار دونوں پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ (غ) اور یہ اسم جمع ہے۔ واحد کے لیے فرس بولا جاتا ہے۔

اَلْمُسَوَّمَةُ۔ سَوْمٌ کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 72]۔ اونٹ کو چراگاہ میں چھوڑنے پر بھی بولا جاتا ہے اور سَوَّمْتُهُ کے معنی اَعْلَمْتُهُ بھی آتے ہیں۔ (غ) یعنی میں نے اس پر نشان لگایا۔ پس ﴿الْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ﴾ کے دونوں معنی ہو سکتے ہیں اَلْمَرْعِيَةُ۔ وَالْمُعَلَّمَةُ یعنی چرنے کے لیے چھوڑے گئے یا پلے ہوئے اور نشان لگائے گئے۔ مجاہد کہتے ہیں: [اَلْخَيْلُ الْمُسَوَّمَةُ

قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۚ﴿۱۵﴾

کہہ، کیا میں تم کو اس سے اچھی بات بتاؤں۔ ان لوگوں کے لیے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں ان کے رب کے پاس باغ ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں وہ ان میں رہنے والے ہیں، اور پاک ساتھی اور اللہ کی رضامندی ہے، اور اللہ بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے۔(386)

الْمُطْهَمَةُ الْحِسَانُ] (صحيح البخاری، كتاب التفسير، باب (آمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ)) **یعنی خَيْلٌ مُسَوَّمَةٌ** سے مراد موٹے خوبصورت گھوڑے ہیں۔

اَلْاَنْعَامُ۔ نَعَمٌ کی جمع ہے اور یہ لفظ اونٹ، گائے اور بکری پر بولا جاتا ہے۔ مگر خصوصیت سے اونٹ پر بولا جاتا ہے۔ کیونکہ اونٹ ان کے لیے سب سے بڑی نعمت تھی۔

مَآب۔ اَوْبٌ سے مصدر بھی ہے اور اسم مکان و زمان بھی اور اَوْبٌ رجوع ہے مگر اَوْبٌ صرف اس جاندار پر بولا جاتا ہے جو ارادہ رکھتا ہے اور رجوع عام ہے۔

عیسائیوں کے ساتھ بحث میں دنیا کی محبوب چیزوں کا ذکر بالخصوص کیا ہے اور اس میں اشارہ ہے کہ **یہ قوم دنیا کی مرغوب چیزوں کی محبت میں پڑ کر اللہ کو بالکل بھول جائے گی**۔ بالخصوص یہاں ڈھیروں ڈھیر سونے چاندی کا ذکر بتاتا ہے کہ یہ عرب کے لوگوں کا نقشہ نہیں جن کے پاس سونا چاندی اگر ہوگا بھی تو برائے نام اور آیت کا خاتمہ ان الفاظ پر کیا ہے کہ حُسْنَ مَآبٍ اللہ کے پاس ہے گویا یہ بتایا ہے کہ مرغوبات دنیا کو اپنی زندگی کا مقصد بنانا انجام کار مفید نہیں۔ ان سے بے شک فائدہ اٹھائے مگر مدنظر خدا کی رضا ہو جیسا اگلی آیت میں کھول دیا۔

386- ﴿رِضْوَانٌ﴾۔ رِضًا سے ہے اور رضائے کثیر کو رضوان کہا جاتا ہے۔ (غ) اور چونکہ سب سے بڑی رضا اللہ کی رضا ہے اس لیے قرآن کریم میں لفظ رضوان رضائے الٰہی سے مخصوص ہے جیسے: ﴿اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ﴾[الحدید: 27:57] ''مگر اللہ کی رضا کو حاصل کرنے کے لیے (نکالی)۔'' ﴿يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا﴾[الفتح: 29:48] [الحشر: 8:59] ''اپنے رب کا فضل اور اس کی رضا چاہتے ہیں۔'' ﴿يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَ رِضْوَانٍ﴾[التوبة: 21:9] ''ان کا رب ان کو اپنی رحمت اور رضا کی خوشخبری دیتا ہے۔'' اور رضا کو راغب نے دو طرح پر لکھا ہے۔ بندہ کا اللہ سے راضی ہونا اور وہ یہ ہے کہ جو کچھ اس کی قضا و قدر اس پر وارد ہوا سے برا نہ سمجھے اور اللہ کا بندہ سے راضی ہونا کہ اللہ تعالیٰ بندے کو اپنے امر پر چلنے والا اور اپنی نہی سے رکنے والا دیکھے۔

نعمائے جنت: خُلُوْدٌ۔ اِزْدِوَاجٌ کے متعلق [دیکھو نمبر: 39] اور [39أ]۔ یہاں انہی امور کا ذکر کر کے جن کا ذکر سورہ بقرہ میں کیا تھا

اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ قِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۶﴾

وہ جو کہتے ہیں اے ہمارے رب ہم ایمان لائے پس ہمارے گناہ بخش اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔ (387)

اَلصّٰبِرِيْنَ وَ الصّٰدِقِيْنَ وَ الْقٰنِتِيْنَ وَ الْمُنْفِقِيْنَ وَ الْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ﴿۱۷﴾

صبر کرنے والے اور سچ کر دکھانے والے اور فرمانبردار اور خرچ کرنے والے اور صبح کے وقتوں میں استغفار کرنے والے۔ (388)

آخر میں لفظ ﴿وَّ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ﴾ اور بڑھا دیئے ہیں اور دوسری جگہ ﴿رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ﴾ کو جنت کی سب سے بڑی نعمت فرمایا ہے: ﴿وَ رِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ [التوبة: 72:9] ''اور اللہ کی رضا سب سے بڑھ کر (نعمت) ہے۔'' پس نعمائے جنت میں رضائے الٰہی کو داخل کر کے بتا دیا ہے کہ **مومن کی اصل خوشنودی کا سامان رضائے الٰہی ہے** اور پھر صحابہ کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچ کر کہ ﴿رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ﴾ [المائدة: 119:5] اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے، یہ بتایا کہ نعمائے جنت کا حصول بلکہ اعظم ترین نعمت جنت کا حصول اسی دنیا سے شروع ہو جاتا ہے۔ اس آیت میں یہ بتانا مقصود ہے کہ بعض قومیں محض مرغوبات دنیا میں منہمک ہو گئیں یا ہو جائیں گی۔ **مگر مرغوبات دنیا میں انہماک کا انجام کبھی اچھا نہیں ہوتا**۔ ہاں رضائے الٰہی اصل چیز ہے، جس کے حصول کے لیے انسان کو پوری کوشش کرنی چاہیے۔ کیونکہ یہی دنیا و آخرت کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ ﴿وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ﴾ یعنی اللہ بندوں کے عملوں کو خوب دیکھنے والا ہے۔ وہ ان کے اعمال حسنہ پر ان کو جزائے احسن عطا فرماتا ہے۔

387- یہاں جو دعائے مغفرت ذنوب یعنی کمزوریوں کی حفاظت کی دعا ہے اس میں بالخصوص مراد کمزوریوں کے سرزد ہونے سے حفاظت ہے۔ ایمان لانے سے پچھلے گناہ تو معاف ہو ہی جاتے ہیں۔ پس وہ سب گناہوں سے پاک ہو کر پھر اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کرتے ہیں کہ آئندہ ان سے کمزوریاں سرزد نہ ہوں۔

388- اَلصَّادِقِيْنَ۔ صِدْقٌ اولاً قول کے لیے ہی آتا ہے۔ مگر اس کا استعمال لغت میں اور قرآن کریم میں افعال کے لیے بھی کثرت سے ہوا ہے۔ مثلاً صَدَقَ فِي الْقِتَالِ کے معنی ہیں جنگ کا حق پورا کیا اور جو کرنا واجب تھا اور جس طرح کرنا واجب تھا اسی طرح کیا اور قرآن کریم میں آتا ہے: ﴿رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ﴾ [الأحزاب: 23:33] ''مرد ہیں جنہوں نے سچ کر دکھایا جو اللہ سے عہد کیا تھا۔'' یعنی انہوں نے عہد کو سچ کر دکھایا۔ ان افعال کے ذریعہ سے جو انہوں نے ظاہر کیے۔ (غ) ایسا ہی: ﴿لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ﴾ [الفتح: 27:48] ''اللہ نے اپنے رسول کو خواب سچ کر دکھایا۔'' میں صدق بالفعل مراد ہے یعنی سچ کر دکھایا۔ چونکہ یہاں صبر کے بعد صدق کا مرتبہ رکھا ہے اور صبر کے معنی [اِمْسَاكٌ فِيْ ضَيْقٍ] یعنی تنگی کی

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ

اللہ گواہی دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتے اور علم والے بھی انصاف پر قائم ہو کر۔

حالت میں اپنے آپ کو روک رکھنا ہے اس لیے صادقین سے صادق بالفعل یا جو کچھ کہا ہے اس کو سچ کر دکھانے والے مراد ہیں۔ صبر میں صرف اپنے آپ کو روک رکھنا ہے، صدق میں قدم آگے بڑھانا ہے۔

اَلْقَانِتِيْنَ۔ قُنُوْتٌ طاعت یعنی فرمانبرداری کو خضوع کے ساتھ لازم کر لینا ہے۔ صبر اور صدق کے ساتھ تیسرا مرتبہ قنوت کا ہے یعنی صبر اور صدق دکھائے۔ مگر ایسی حالت میں کہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کو اپنے اوپر لازم کیا ہو اور پھر فرمانبرداری بھی ایسی ہو جس میں خضوع یعنی عاجزانہ حالت پائی جائے۔ اپنے کیے پر فخر نہ ہو، بڑائی نہ ہو۔

اَلْمُنْفِقِيْنَ۔ یہ چوتھا مرتبہ ہے۔ صبر بھی دکھائے صدق بھی۔ فرمانبرداری بھی ہو۔ لیکن جب تک انسان انفاق فی سبیل اللہ نہیں کرتا یعنی اپنے سارے مال کو، اپنی ساری طاقتوں کو خدا کی راہ میں لگا نہیں دیتا وہ کسی بڑی کامیابی کا وارث نہیں ہو سکتا۔

اَلْمُسْتَغْفِرِيْنَ۔ [دیکھو نمبر: 258]۔ یہ پانچواں مرتبہ ہے۔ اور چاروں مراتب کے بعد اس کے لانے سے صاف بتا دیا ہے کہ یہ <u>ترقی کے لیے آخری مرتبہ ہے</u>۔ پس اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی حفاظت چاہنے والے ہیں یعنی باوجود صبر اور صدق دکھانے کے، باوجود فرمانبرداری کو اپنے اوپر لازم کر لینے کے، باوجود اپنے مال اور قویٰ کو خدا کی راہ میں لگا دینے کے اپنے نفس پر کوئی بھروسہ نہیں کرتے، بلکہ حفاظت الٰہی کے طالب ہوتے ہیں۔ اور جس قدر زیادہ انسان استغفار کرتا ہے اسی قدر زیادہ وہ حفاظت الٰہی کے ماتحت آتا ہے اور اس لیے ہر قسم کے خطرات سے مامون ہو جاتا ہے۔

اَلْاَسْحَارُ۔ سَحَرٌ کی جمع ہے اور سَحَرٌ اصل میں آخر شب کے اندھیرے کا دن کی روشنی کے ساتھ مختلط ہو جانے کا نام ہے اور اس وقت کو بھی سحر کہتے ہیں۔ (غ)

صبح کے وقت استغفار سے مراد بعض نے اس وقت کی نماز کو لیا ہے جیسے قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ (ج) اور بعض نے محض استغفار۔ مگر نماز میں بھی استغفار ہی ہوتا ہے۔ صبح کے وقت کی خصوصیت کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صبح کے وقت دعا زیادہ قبول ہوتی ہے۔ سحر کا وقت درحقیقت ایسا وقت ہے کہ ایک تو دنیا کے شور و شغف اس وقت کم ہوتے ہیں دوسرے قوائے حیوانی بھی اس وقت کسی قدر کمزور ہوتے ہیں اور اس لیے انسان کی توجہ اور قوائے روحانی کے کمال کا وقت ہوتا ہے۔ آج کل کی عیاشی بھی رات کے دو تین بجے ختم ہو جاتی ہے اور لمبی یا وبائی بیماریوں میں عموماً یہی وقت نزع کا ہوتا ہے جو سب اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ وقت قوائے حیوانی کی کمزوری کا ہوتا ہے۔ اس لیے اس وقت کو دعائے استغفار کے لیے مخصوص کیا ہے۔ حدیث صحیح میں جس پر صحیحین اور سنن کا اتفاق ہے یہ آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: [يَنْزِلُ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى كُلَّ لَيْلَةٍ إِلَى السَّمَآءِ الدُّنْيَا حِينَ يَبْقٰى ثُلُثُ اللَّيْلِ الْآخِرُ فَيَقُولُ: هَلْ مِنْ سَائِلٍ فَأُعْطِيَهُ؟ هَلْ مِنْ دَاعٍ فَأَسْتَجِيْبَ لَهُ؟ هَلْ مِنْ مُّسْتَغْفِرٍ فَأَغْفِرَ لَهُ؟] (صحيح البخارى، كتاب التهجد، باب الدُّعَاءِ وَالصَّلَاةِ مِنْ

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۱۸ اس کے سوا کوئی معبود نہیں غالب حکمت والا ہے۔(389)

آخِرِ اللَّيْلِ: 1145) یعنی ''اللہ تبارک وتعالیٰ ہر رات جب رات کا آخری تیسرا حصہ باقی ہوتا ہے سماء الدنیا پر نزول فرماتا ہے۔ پس فرماتا ہے: ''کیا کوئی سائل ہے میں اس کو دوں گا؟ کیا کوئی دعا کرنے والا ہے میں اس کی دعا قبول کروں گا؟ کیا کوئی مغفرت مانگنے والا ہے میں اس کو اپنی مغفرت میں لے لوں گا؟ اللہ تعالیٰ تو مکان کی قید سے پاک ہے پس اس کے نزول سے مراد بھی اس کی رحمت اور فضل کا خاص جلوہ ہے جس کے لیے کوئی جاذب دل ہونا چاہیے۔ افسوس کہ مسلمان اب اس قدر غفلت کی نیند سورہے ہیں کہ اس قبولیت کے وقت سے کوئی فائدہ اٹھانے والا نہیں الا ماشاء اللہ۔ بلکہ دوسری قوموں کا تتبع کر کے رات کو لغویت یا عیاشی میں گزار کر اس وقت جو جاگنے کا وقت ہے سو جاتے ہیں۔

اَلصّٰبِرِيْنَ وغیرہ یا تو اَلَّذِيْنَ کی صفت ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور یا خود نصب علی المدح ہے۔

389- قِسْطٌ۔ قِسْطٌ کے معنی عدل یا انصاف کا حصہ ہیں (اور مراد اس سے انصاف ہے) اور یہی وجہ ہے کہ قَسَطَ کے معنی ہیں اس نے ظلم کیا گویا دوسرے کا حصہ لے لیا اور اَقْسَطَ کے معنی ہیں اس نے انصاف کیا۔ گویا دوسرے کا حصہ دے دیا۔ (غ) اسی لیے قَاسِطٌ ظالم کے معنی میں آیا ہے۔ ﴿وَ اَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا﴾ [الجن: 15:72] ''اور حق سے پھرنے والے سو وہ دوزخ کا ایندھن ہیں۔'' اور مُقْسِطٌ اچھے معنی میں آتا ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ﴾ [المآئدۃ: 42:5] ''اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔''

﴿قَآئِمًا بِالْقِسْطِ﴾ کی دو توجیہیں ہوسکتی ہیں۔ جمہور مفسرین نے تو اسے شَهِدَ سے حال لیا ہے مگر یہ بھی جائز ہے کہ اولوالعلم سے حال ہو اور تقدیر یوں ہوگی: [وَأُوْلُو الْعِلْمِ حَالَ كَوْنِ كُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمْ قَائِمًا بِالْقِسْطِ] (تفسیر الرازی: جلد1، صفحہ 1110) (ز) یعنی اولوالعلم کی گواہی بھی یہی ہے اس حال میں کہ ان میں سے ہر ایک انصاف کے ساتھ کھڑا ہوا۔ میرے نزدیک یہ دوسری وجہ ہی درست ہے۔

یہاں **<u>اللہ تعالیٰ نے اپنی توحید پر تین قسم کی شہادت پیش کی ہے</u>**۔ اول خود اللہ تعالیٰ کی شہادت یعنی اللہ تعالیٰ کے اس قول کی شہادت اس کی فعلی کتاب سے ملتی ہے اور اس کے ہاتھ کی نکلی ہوئی چیزیں خود توحید پر دلالت کرتی ہیں دوسری شہادت ملائکہ کی ہے جن کا تعلق پاک فطرت انسانوں سے ہے کیونکہ فطرت انسانی جب گردوپیش کے حالات سے متاثر نہیں ہوتی تو اللہ تعالیٰ کی توحید پر گواہی دیتی ہے۔ عموماً تمام لوگ یہاں تک کہ خدا کے منکر بھی مصائب کے وقت میں خدا تعالیٰ کی ہستی کا اقرار کرتے ہیں اور بت پرست اور دوسری قسم کے مشرک جب مصائب میں مبتلا ہوتے ہیں تو اپنے بتوں کو اور دوسرے شرکاء کو بھول جاتے ہیں اور خالص اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہیں۔ اور علم والوں کی شہادت درحقیقت دنیا کی الہامی کتابوں کی شہادت ہے کہ وہ سب بھی بہت سی باتوں میں باہم اختلاف رکھتے ہوئے اس بات پر متفق ہیں کہ خدا ہے اور ایک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اولوالعلم کے ساتھ ﴿قَآئِمًا بِالْقِسْطِ﴾ کی شرط لگادی ہے کہ اہل علم اگر انصاف پر قائم ہوں تو وہ بھی یہی گواہی دیں گے۔ یہاں توحید پر ایسی جامع

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۗ وَ مَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ؕ وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹﴾

دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے، اور انہوں نے جن کو کتاب دی گئی اختلاف نہیں کیا مگر اس کے پیچھے کہ ان کے پاس علم آچکا ہے، آپس کی ضد سے۔ اور جو شخص اللہ کی آیتوں کا انکار کرتا ہے تو اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔ (390)

فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَ مَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَ قُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَ الْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ

پھر اگر تجھ سے جھگڑا کریں تو کہہ دے کہ میں نے اپنی توجہ کو اللہ کی فرمانبرداری میں لگا دیا ہے اور انہوں نے (بھی) جو میرے پیچھے چلتے ہیں۔ اور ان لوگوں کو جنہیں کتاب دی گئی اور امیوں کو کہہ دے کہ کیا تم فرمانبردار ہو؟ پھر اگر وہ فرمانبردار ہو جائیں تو یقیناً انہوں نے راہ پالی، اور اگر پھر

شہادت پیش کرنے کا منشا یہی ہے کہ **عیسائیت پر اتمام حجت** کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی گواہی جو اس کی فعلی کتاب قدرت سے ملتی ہے اور ملائکہ کی گواہی جو نیک دل انسانوں کی صحیح فطرت سے ملتی ہے کیونکہ ملائکہ کا ان کے ساتھ تعلق ہوتا ہے اور اہل علم کی انصاف کے ساتھ شہادت سب اس بات پر متفق ہیں کہ خدا ایک ہے۔ اور تثلیث کی کوئی شہادت ان تینوں ذرائع سے نہیں ملتی یعنی نہ قانون قدرت اس پر شاہد ہے، نہ فطرت انسانی اپنی صحیح حالت میں اس کی گواہی دیتی ہے اور نہ ہی دنیا کی الہامی کتابیں یہ شہادت دیتی ہیں۔ حتی کہ مروجہ اناجیل باوجود اپنی تحریفات کے تین خداؤں کی کوئی شہادت نہیں دیتی ہیں۔ پس جب توحید الٰہی پر اس قدر زبردست شہادت موجود ہے اور ان تین ذرائع یعنی قانون قدرت، فطرت انسانی اور الہامی کتابوں کی شہادت کے سوا کوئی اور ذریعہ شہادت مسلمہ فریقین نہیں ہوسکتا تو یہ عیسائی مذہب کے بطلان کی صریح دلیل ہے۔

390- بَغْيًا۔ بَغْيٌ کے اصل معنی خواہش ہیں اس لیے بعض نے یہاں بَغْيًا سے مراد لیا ہے: [طَلَبُ الرِّيَاسَاتِ وَالْمُلْكِ وَالسُّلْطَانِ] (ج) یعنی ریاست حکومت اور غلبہ کی خواہش سے اور یا اس سے مراد ضد اور حسد ہے۔

جب یہ بتا دیا کہ توحید الٰہی پر ہی تمام شہادتوں کا اتفاق ہے اور **دین اسلام ہی وہ دین ہے جس نے توحید خالص کو سکھایا۔** پس اسلام ہی اب سچا دین ہے جس کو قبول کرنے کے سوا کوئی شخص توحید خالص پر قائم نہیں ہوسکتا اور واقعات شہادت دیتے ہیں کہ یہ دعویٰ بالکل سچا ہے۔ ہر مذہب میں توحید کا کسی قدر شرک کے ساتھ اختلاط ہوگیا ہے مگر اسلام کی پاک کتاب نے اگر ایک طرف شرک کے خفی مراتب تک کو بیان کر دیا تو دوسری طرف وہ تعلیم تحریف سے بھی پاک ہے۔

الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰﴾ ع 2 11 10

جائیں تو تجھ پر پہنچانا ہی ہے۔ اور اللہ بندوں کو خوب دیکھنے والا ہے۔ (391)

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّ يَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۱﴾

وہ لوگ جو اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے ہیں، اور جو ان کو قتل کرتے ہیں جو لوگوں میں سے انصاف کا حکم دیتے ہیں، تو ان کو دردناک عذاب کی خبر دے دے۔ (392)

391- اَلْبَلَاغُ۔ بَلَاغٌ کے معنی انتہائے مقصد پہنچنا بھی ہیں جو بلوغ کے معنی ہیں اور تبلیغ یا پہنچا دینا بھی اس کے معنی ہیں اور یہاں پیغام کا پہنچا دینا ہی مراد ہے۔

آنحضرت ﷺ کی بعثت اسود واحمر کی طرف:

یہاں اہل کتاب اور اُمی دونوں کو خطاب کے لیے حکم دیا ہے اور اس میں درحقیقت کل دنیا آجاتی ہے۔ خواہ اُمی سے مراد مکہ کے لوگ لیے جائیں [دیکھو نمبر: 102]۔ کیونکہ انہی لوگوں کی طرف کوئی رسول نہ آیا تھا باقی کل دنیا کی قوموں کی طرف رسول آچکے تھے۔ پس وہ سب اہل کتاب میں داخل تھے۔ اس لیے اس آیت کے ماتحت مفسرین نے ان احادیث کو نقل کیا ہے جن میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا: [بُعِثْتُ إِلَى الْأَسْوَدِ وَالْأَحْمَرِ] (تفسیر ابن کثیر: جلد6، صفحہ 518) میں اسود اور احمر کی طرف مبعوث ہوا ہوں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بغیر آنحضرت ﷺ پر ایمان لانے کے نجات نہیں۔ گو پہلے وہ لوگ کتاب بھی رکھتے ہوں۔ گویا آنحضرت ﷺ کا پیغام صرف امیوں کے لیے نہ تھا بلکہ اہل کتاب کے لیے بھی تھا۔

392- بَشِّرْ۔ تَبْشِيْرٌ۔ خیر اور شر یعنی اچھی اور بری دونوں خبروں پر بولا جاتا ہے۔ (ل) کیونکہ جس طرح خوشی کی خبر چہرہ (بشرۃ) پر انبساط پیدا کرتی ہے اسی طرح ایک بری خبر بھی چہرہ پر ایک تغیر پیدا کرتی ہے۔ بعض نے کہا کہ عذاب پر تبشیر کا لفظ لانے کا یہ مطلب ہے کہ زیادہ سے زیادہ خوشی کی خبر جو وہ سنیں گے وہ بھی عذاب کی خبر ہے۔ (غ) بالفاظ دیگر خوشی کی کوئی خبر وہ نہ سنیں گے۔ جیسا شاعر کہتا ہے: [تَحِيَّةُ بَيْنِهِمْ ضَرْبٌ وَجِيْعٌ] ان کا آپس میں ایک دوسرے کو سلام کرنا مارنا اور گالی دینا ہے۔

نبیوں کا قتل:

دکھ کی خبر تو موجود لوگوں کو یا بعد میں آنے والوں کو ہی دی جاسکتی ہے۔ اس لیے یا تو مراد یہ ہے کہ جو لوگ نبیوں کو قتل کرتے تھے اب جو ان کے نقش قدم پر چل کر مخالفت کرتے ہیں ان کو عذاب کی خبر دے دو۔ اور یا نبیوں کے قتل سے مراد ان کی دعوت کا

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۫ وَ مَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۲۲﴾

یہ وہ لوگ ہیں جن کے عمل دنیا اور آخرت میں کام نہ آئے، اور ان کے لیے کوئی مددگار نہ ہوں گے۔(393)

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَ هُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۳﴾

کیا تو نے ان کو نہیں دیکھا جن کو کتاب کا ایک حصہ دیا گیا ہے، وہ اللہ کی کتاب کی طرف بلائے جاتے ہیں تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے، پھر ایک گروہ ان میں منہ موڑتا ہوا پھر جاتا ہے۔(394)

ابطال ہے یا ایسی مخالفت کہ گویا اپنی طرف سے تو قتل کا پورا سامان کر چکے گو حفاظت الٰہی نے بچا لیا۔[دیکھو نمبر: 91]

393- حبط عمل پر[دیکھو نمبر: 279]۔جیسا کہ سیاق سے ظاہر ہے یہاں ان اعمال کے حبط کا ذکر ہے جو آنحضرت ﷺ کی مخالفت میں حق کو مٹانے کے لیے کیے جاتے ہیں۔

394- نَصِيْبٌ۔ نَصَبَ سے ہے جس کے معنی وضع ہیں۔اور نصیب حظ منصوب یعنی معین حصہ کا نام ہے۔(غ)

تحریف بائبل:

ان لوگوں سے جن کو کتاب کا ایک حصہ دیا گیا یہود و نصاریٰ مراد ہیں جن کو کتاب دی گئی مگر وہ اصل کتاب الٰہی ان کے ہاتھوں میں نہ رہی بلکہ صرف اس کا ایک حصہ موجودہ محرف کتابوں میں باقی رہ گیا۔قرآن کریم نے اس بیان کے ساتھ کہ اصل کتاب ان کے پاس نہیں بلکہ اس کا صرف ایک حصہ ہے اپنا منجانب اللہ ہونا ثابت کر دیا ہے۔اس لیے کہ اس حقیقت پر جو اس وقت دنیا کی نظروں سے مخفی تھی۔آج تیرہ سو سال بعد روشنی پڑتی ہے اور خود عیسائیوں کو یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ موجودہ توریت و اناجیل میں اصل کتابوں کا صرف ایک حصہ باقی رہ گیا ہے اس لیے فرمایا کہ وہ کتابیں اب حق کے ساتھ فیصلہ نہیں کر سکتیں کیونکہ حق ان میں بہت کم رہ گیا اور اب ان کو کامل کتاب اللہ قرآن کی طرف بلایا جاتا ہے اور فیصلہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ جو مذہبی اختلافات ان کے درمیان ہیں ان کا فیصلہ کرے **کیونکہ قرآن کریم کا یہ دعویٰ ہے اور آج یہ ثابت شدہ دعویٰ ہے کہ تمام اختلافات مذہبی کا یہ فیصلہ کرتا ہے۔** جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ﴾[النحل: 64:16] یعنی ہم نے قرآن کو اسی غرض سے اتارا ہے کہ جو اصولی اختلافات مذاہب میں پڑ گئے ہیں ان کا یہ فیصلہ کر دے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۖ وَّ غَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۴﴾

یہ اس لیے ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ سوائے گنتی کے دنوں کے ہمیں آگ نہیں چھوئے گی، اور اس بات نے ان کو ان کے دین میں دھوکا دیا ہے جو وہ افترا کرتے تھے۔ (395)

فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۪ وَ وُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۵﴾

پھر کیا حال ہوگا جب ہم اُن کو اس دن اکٹھا کریں گے جس میں کوئی شک نہیں اور ہر ایک جان کو پورا دیا جائے گا جو اس نے کمایا اور ان پر ظلم نہ ہوگا۔ (396)

395- غَرّ۔ غَرَّهٗ کے معنی ہیں اسے دھوکہ دیا اور باطل کے ساتھ اس کو طمع دی۔ (ل) نیز [دیکھو نمبر: 582]

يَفْتَرُوْنَ۔ فَرْیٌ سے ہے جس کے اصل معنی قطع یا شق کرنے کے ہیں۔ مفردات میں ہے کہ فَرْیٌ ایسے قطع کرنے کو کہتے ہیں جو اصلاح کے لیے ہو اور اِفْرَاءٌ وہ جو فساد کے لیے ہو اور افتراء دونوں میں آتا ہے اور فَرِيَّةٌ کذب یعنی جھوٹ کو کہتے ہیں جس سے اِفْتَرٰی بمعنی اِخْتَلَقَ ہے۔ یعنی جھوٹ بنایا۔

دوزخ سے بریت کا دعویٰ:

یہی مضمون [البقرۃ: 80] میں ہے مگر یہاں مزید وضاحت موجود ہے کہ عیسائی بھی شامل ہیں۔ کیونکہ یہاں دین کے بارہ میں کسی افتراء کا ذکر ہے اور ظاہر ہے کہ سب سے بڑا افتراء دین کے بارہ میں جو کیا گیا اس کی مرتکب عیسائی قوم ہوئی ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ایک برگزیدہ رسول اور نبی کو خدا بنا دیا۔ اس سے اگلی آیت میں جو جواب دیا ہے ﴿وَ وُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ﴾ وہ بھی عیسائی مذہب کے عقیدہ کفارہ پر ایک زد ہے کیونکہ کفارہ کی رو سے صرف مسیح کے خون پر ایمان لانے سے ایک شخص نجات پا جاتا ہے۔ مگر اس کے خلاف قرآن کریم یہ اصول سکھاتا ہے کہ ہر ایک شخص کو اپنے اپنے اعمال کا پورا بدلہ ملے گا۔

396- فَكَيْفَ۔ اس دن کے ہول اور عظمت کی طرف توجہ دلانے کے لیے ہے۔ اور مراد ہے: [كَيْفَ تَكُوْنُ حَالُهُمْ] ان کی حالت کیسی ہوگی؟

لِيَوْمٍ سے مراد فِيْ يَوْمٍ ہے یعنی اس دن یا لِجَزَاءِ يَوْمٍ یعنی اس دن کی سزا کے لیے۔

فعل اور اس کی جزا میں اتصال:

﴿وُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ﴾ جو کچھ کسی جی نے کام کیا ہے یا کمائی کی ہے وہی اس کو پورا دیا جائے گا۔ یہاں کام کی جزا دینے کا ذکر نہیں کیا بلکہ خود اس کمائی کا ذکر کیا جو ہر جان کر رہی ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم کی رو سے ہر ایک عمل کسی کمائی کا موجب ہے یعنی اس کا کوئی نتیجہ ساتھ ساتھ پیدا ہوتا جاتا ہے اور یہ وہ کمائی ہے جو ہر جان کر رہی

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۫ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۶﴾

کہہ، اے اللہ! ملک کے مالک! تو جسے چاہتا ہے ملک دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے ملک لے لیتا ہے اور جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے۔ تیرے ہی ہاتھ میں (سب) بھلائی ہے تو ہر چیز پر قادر ہے۔ (397)

ہے۔ اور یہی نتائج پورے کے پورے قیامت کے دن مل جائیں گے۔ روح المعانی میں ہے کہ کمائی کا پورا دیا جانا اس لحاظ سے کہا ہے کہ کَسَبَ یعنی کام اور اس کی جزا میں کمال اتصال ہے۔

397- اَللّٰهُمَّ اصل میں یا اللہ ہے اور یا کی بجائے آخر میں میم مشدد لایا گیا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی دعا سے مخصوص ہے۔ بعض کے نزدیک اس کی اصل ترکیب ہے: [يَا اَللّٰهُ آمِنَّا بِخَيْرٍ]۔ اے اللہ ہمارے ساتھ بھلائی کا قصد فرما۔ (غ) یا قرآن کریم میں اَللّٰهُمَّ سے جس قدر دعائیں آئی ہیں ان میں اَللّٰهُمَّ کے ساتھ کسی اور صفت الٰہی کا بھی ذکر ہے۔ جیسے یہاں اور ﴿اللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ﴾ [الزمر: 46:39] ''اے اللہ! آسمانوں کے پیدا کرنے والے۔'' ﴿سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ﴾ [یونس: 10:10] ''اے اللہ! تو پاک ہے۔''

الْمُلْكِ۔ مُلْكٌ کے معنی ہیں جس شے میں تصرف حاصل ہے حکم کے ساتھ اس کو ضبط میں رکھنا۔ (غ) اور مِلْكٌ اس سے بمنزلہ جنس کے ہے یعنی ہر مُلک مِلک ہے مگر ہر مِلک مُلک نہیں۔ اور لسان العرب میں ملک اور ملکوت کے جب اللہ کی طرف مضاف ہوں ایک ہی معنی دیئے ہیں سُلْطَانُهُ وَ عَظْمَتُهُ یعنی اللہ تعالیٰ کا تسلط اور اس کی عظمت۔ مجاہد نے یہاں صرف نبوت معنی لیے ہیں اور قتادہ نے حکومت اور بادشاہ۔ (ج) اور حق یہ ہے کہ دونوں شامل ہیں۔

تَنْزِعُ۔ نَزَعَ کے معنی ہیں ایک چیز کو اس کی جائے قرار سے کھینچ لیا اور اس کا استعمال اعراض پر بھی ہوتا ہے مثلاً محبت اور عداوت کے نکال دینے پر ﴿وَ نَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ﴾ [الحجر: 47:15] ''اور جو ان کے دلوں میں کچھ کدورت ہوگی ہم اسے نکال دیں گے۔'' اور اسی سے تَنَازَعَ اور مَنَازَعَةٌ ہے ایک دوسرے کو کھینچنا جس سے مراد باہم جھگڑا ہے۔ (غ)

خدا کی بادشاہت:

یہاں مسلمانوں کو بتایا ہے کہ دنیا اور آخرت کی بادشاہت سب اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ اپنی مشیت سے جس کو چاہتا ہے بادشاہت عطا فرماتا ہے اور جس سے چاہتا ہے لے لیتا ہے اور ان تغیرات پر تاریخ عالم شاہد ہے۔ مگر یہاں لفظ مُلْكٌ میں جس کے حقیقی معنی سلطان و عظمت ہیں نبوت اور بادشاہت دونوں شامل ہیں اور خاص لفظ ملک کو اختیار کرنے میں یہ حکمت ہے کہ تا یہ معلوم ہو جائے کہ یہ وہی خدا کی بادشاہت ہے جس کی انتظار چلی آتی تھی اور جس کے قرب کی خوشخبری حضرت مسیح علیہ السلام نے دی تھی

تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَ تُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۫ وَ تُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ تُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ۫ وَ تَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۷﴾

تو رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے، اور مردہ سے زندہ کو نکالتا ہے اور زندہ سے مردہ کو نکالتا ہے، اور تو جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔ (398)

اور جس کے جلد آنے کے لیے اپنے پیروؤں کو روزانہ دعا میں یہ سکھایا تھا کہ ''تیری بادشاہت آوے۔'' [متی: 10:6] سلسلہ بنی اسرائیل میں بھی یہ خدا کی بادشاہت موجود تھی مگر اس کا اپنے کمال کو پہنچنا محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے مقدر تھا۔ اس لیے خدا کی بادشاہت کا لفظ بالخصوص اسی پر بولا گیا ہے اور ان الفاظ میں یہ خوش خبری مسلمانوں کو سنائی اور دوسرے یہود و نصاریٰ کو توجہ دلائی کہ خدا کی بادشاہت اب بنی اسرائیل سے نکل کر دوسری قوم کے پاس جانے والی ہے اور یہ اس وعدہ کے مطابق تھا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے کیا تھا اور جس کی خبر تمام نبیوں کے ذریعہ سے دی گئی تھی۔ چنانچہ سلسلہ موسوی کے آخری نبی حضرت مسیح علیہ السلام بھی بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے صاف الفاظ میں فرماتے ہیں کہ:

''جس پتھر کو معماروں نے رد کیا وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا یہ خداوند کی طرف سے ہوا اور ہماری نظر میں عجیب ہے اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے دے دی جائے گی۔'' [متی: 21:42, 43]

یہ وہی خدا کی بادشاہت تھی جو اب اللہ تعالیٰ کے قدیم وعدہ کے مطابق محمد رسول اللہ ﷺ کو دی گئی تھی۔

لفظ عزت میں حکومت کی خوش خبری:

یہاں علاوہ مُلک کے عزت دینے کا ذکر بھی فرمایا ہے جس سے صاف مطلب یہ ہے کہ وہ مغلوب اور محکوم نہیں رہیں گے اور یہ پیشگوئی ملک و حکومت دینے کی اور مسلمانوں کو دنیا میں ایک معزز قوم بنانے کی اس وقت کی جاتی ہے جب ابھی عرب کے اندر مسلمان چاروں طرف کفار میں گھرے ہوئے تھے اور کفار کا ہی غلبہ تھا اور یہودی اور عیسائی اور مشرک سب اس بات پر اتفاق کر چکے تھے کہ اس چھوٹے سے گروہ کو نابود کر دیں۔ پس یہ مسلمانوں کے لیے بطور تسلی نازل ہوئی اور نہ صرف اس حالت میں ان کی تسلی کے لیے تھی بلکہ آئندہ بھی یہ ہمیشہ ان کے لیے جب کبھی اسلام اسی قسم کی مشکلات میں مبتلا ہو موجب تسلی رہے گی۔

398- تُوْلِجُ۔ وُلُوْجٌ تنگ جگہ میں داخل ہونے کو کہتے ہیں۔ (غ) ﴿حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ﴾ [الأعراف: 7:40] ''جب تک کہ اونٹ سوئے کے ناکے میں سے داخل نہ ہو۔'' اور اِیْلَاجٌ اس طرح پر داخل کرنا۔ یہاں تاریکی کے روشنی میں اور روشنی کے تاریکی میں داخل کرنے پر یہ لفظ بولا ہے۔

عموماً **مردہ سے زندہ اور زندہ سے مردہ کے نکالنے سے مراد نطفہ** سے جاندار کا اور جاندار سے نطفہ کا پیدا کرنا مراد لیا گیا ہے۔ مگر

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ مومن مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بنائیں (399)

یہاں مراد یہ نہیں جس کو پچھلی آیت میں بادشاہت کا دینا، معزز بنانا کہا تھا اسی کو یہاں دن اور زندگی قرار دیا ہے اور جس کو وہاں بادشاہت کا لے لینا اور ذلیل کرنا فرمایا تھا اسے یہاں رات اور مردگی سے تعبیر کیا ہے۔ قوموں کی زندگی اور مردگی عزت اور ذلت یہی چیز ہے۔ انقلابات زمانہ کی طرف توجہ دلائی ہے مسلمان بھی غور کریں اور جو آج برسر حکومت ہیں وہ بھی۔

399- دُوْنِ۔ [يُقَالُ لِلْقَاصِرِ عَنِ الشَّيْءِ: دُوْنٌ] یعنی کسی چیز سے پیچھے رہنے والے کے متعلق دُوْنَ کہا جاتا ہے اور بعض کے نزدیک وہ دَنُوٌّ سے مقلوب ہے۔ (غ) پس ﴿مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ کے معنی ہوئے مومنوں کو چھوڑ کر یا مومنوں سے پیچھے رہتے ہوئے یا ان کے معاملہ میں کوتاہی کرتے ہوئے۔

موالاتِ کفار:

ان الفاظ کے معنی نہایت صاف ہیں مگر قرآن کریم کے پُرحکمت کلام کو مدنظر نہ رکھنے سے بڑی بڑی مشکلات پیش آئی ہیں۔ یہاں مومنوں کو کفار کی جس ولایت سے روکا ہے اس کے ساتھ ﴿مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ کے لفظ بڑھائے ہیں تو گویا یوں فرمایا کہ مومنوں کو نہیں چاہیے کہ مومنوں کو چھوڑ کر یا مومنوں کے معاملہ میں پیچھے رہتے ہوئے یعنی ان کے فوائد کو نقصان پہنچاتے ہوئے کفار کی ولایت اختیار کریں ولی اور ولایۃ کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 332] جہاں دکھایا گیا ہے کہ اس کے معنی میں قرب و محبت کے تعلقات کے ساتھ نصرت بھی شامل ہے۔ پس یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ شدید تعلق قرب و محبت و نصرت جو مومنوں کو باہم ہوتا ہے کفار کے ساتھ وہ نہیں ہو سکتا۔ گویا یہاں یہ فرمایا کہ کفار کے ساتھ بھی تم کو معاہدات نصرت وغیرہ کرنے ہوں گے مگر ایسا نہ ہو کہ کفار کے ساتھ تمہارے تعلقات نصرت ایسے ہوں جیسے مومنوں کے ساتھ یا ایسے جن سے مومنوں کو ہی نقصان پہنچے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کفار کے ساتھ تعلق یا معاہدہ نصرت ہو سکتا ہے مگر ایسا کوئی معاہدہ جائز نہیں جس میں مسلمانوں کو نقصان پہنچتا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام ایک عظیم الشان سلسلہ اخوت کل اقوام عالم میں قائم کرتا ہے اور تمام قومی اور ملکی تفریقوں کو مٹاتا ہے۔ خدائے عالم الغیب جانتا تھا کہ مسلمان مختلف ملکوں میں رہیں گے ان کے تعلقات مختلف قوموں سے ہوں گے اور غیر مسلم اقوام سے بھی تعلقات اور معاہدات نصرت ہوں گے پس شرط یہ لگا دی کہ کسی دوسری قوم کے ساتھ ایسا تعلق یا معاہدہ نصرت کا نہ ہو جس کی غرض اپنے ہی مسلمان بھائیوں کو نقصان پہنچانا ہو کیونکہ اس کے بغیر اسلام کی اخوت عالمگیر کا سلسلہ قائم ہی نہ ہو سکتا تھا۔ پس جب مسلمانوں کو حکومت اور بادشاہت کی خوش خبری سنائی تو ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ اصول اخوت اسلامی کو کسی حالت میں نہ بھولیں اور کفار کے ساتھ مل کر اپنے ہی بھائیوں کو تباہ نہ کریں۔ اخوت اسلامی کا تعلق تمام تعلقات پر مقدم ہو اور اس کا ذکر بالخصوص ایسے موقعہ پر کرنا جہاں عیسائی مذہب کا ذکر ہو رہا ہے یہ بھی اس کلام کے منجانب اللہ ہونے کا ثبوت ہے۔ گویا بتا دیا کہ عیسائی قوموں کے ساتھ بالخصوص تمہیں یہ معاملہ پیش آنے والا ہے کہ وہ تم سے ایک دوسرے کے خلاف فوائد معاہدے کر کے تمہاری بیخ کنی کے درپے ہوں گے اور تمہیں نقصان پہنچائیں گے۔ غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کی سلطنت

دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّاۤ اَنْ تَتَّقُوْا

اور جو ایسا کرے تو اس کا اللہ کے ساتھ کچھ تعلق نہیں سوائے اس کے کہ تم ان سے کسی طرح بچاؤ کرلو (400)

شوکت عظمت کو نقصان پہنچنے کی سب سے بڑی وجہ یہی ہوئی ہے کہ وہ غیر قوموں کے ساتھ مل کر اپنے بھائیوں کو نقصان پہنچاتے رہیں ہیں اور غیر قوموں بالخصوص عیسائی اقوام نے ہمیشہ اس ہتھیار کو استعمال کر کے مسلمانوں کی قوت وشوکت کو توڑا ہے۔ اسی لیے خدا کے پُرحکمت کلام میں ﴿تُؤْتِي الْمُلْكَ﴾ کے ساتھ ﴿تَنْزِعُ الْمُلْكَ﴾ کا بھی ذکر ہے کہ کیا اب بھی مسلمان سمجھیں گے؟ اور یہ جو کہا گیا ہے کہ کفار کے ساتھ تعلقات نصرت وغیرہ ہو سکتے ہیں تو یہ خود نبی کریم ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے نمونہ سے ظاہر ہے۔ حبش میں جو مسلمان ہجرت کر کے گئے تھے وہ حبش کے عیسائیوں کی حمایت میں ان کے دشمنوں کے خلاف لڑے نبی کریم ﷺ نے کئی مشرک قبائل سے معاہدات کیے اور یہودیوں سے بھی معاہدات کئے جن میں دشمنان اسلام کے مقابلہ میں ان قبائل نے یا غیر جانبدار رہنا منظور کیا اور یا مسلمانوں کو امداد دینا منظور کیا اس شرط پر کہ ان پر حملہ کے وقت مسلمان ان کی امداد کریں۔ جنگ حنین میں مشرکین مسلمانوں کی فوج میں موجود تھے۔ صحابہ کے وقت میں ایران کی جنگوں میں عیسائی فوج مسلمان فوج کے پہلو بہ پہلو لڑی۔ اصل بات یہ ہے کہ اسلام سب غیر مسلموں کے ساتھ یکساں سلوک کا حکم نہیں دیتا اور ترک موالات بھی مدارج رکھتی ہے۔ اس پر اصولی بحث سورہ ممتحنہ میں آئے گی۔

400- ﴿لَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ﴾ مِنَ اللّٰهِ قائم مقام مِنْ وِلَايَةِ اللّٰهِ ہے اور فِيْ شَيْءٍ میں تنوین تحقیر کے لیے ہے۔ یعنی اللہ کی ولایت سے وہ کسی چیز میں نہیں جس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کو اللہ کی کچھ ولایت حاصل نہیں۔ یا اللہ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

﴿تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً﴾ وِقَايَةٌ کے معنی بیان ہو چکے ہیں ایذا اور ضرر کی باتوں سے اپنے آپ کو بچانا [دیکھو نمبر: 10] اور یہی معنی تقویٰ کے ہیں: [جَعْلُ النَّفْسِ فِيْ وِقَايَةِ مِمَّا يُخَافُ]۔ (غ) جس سے خوف ہو اس سے اپنی حفاظت کر لیں اور اسی معنی کے لحاظ سے یہاں تَتَّقُوْا کا صلہ مِنْ آیا ہے یعنی ان کی طرف سے کسی نقصان کا خوف ہے تو اس سے تم اپنا بچاؤ کرلو۔ تُقَاةً بھی اسی سے ہے یہ اصل میں وُقَيَةٌ تھا ''و'' ''تا'' سے بدل گئی اور ''یائے'' متحرکہ نے ''الف'' کی صورت اختیار کر لی۔ پس تُقَاةٌ کے معنی بچاؤ ہوئے اور نکرہ لانے میں یہ بتانا مقصود ہے کہ کسی طرح کا بچاؤ کر لیں۔

مسئلہ تقیہ:

مفسرین نے یہاں تَتَّقُوْا کے معنی تَخَافُوْا لیے ہیں اور معنی یوں کیے ہیں کہ کافروں کو کسی صورت میں دوست نہ بناؤ سوائے اس کے کہ ان سے تم کو خوف ہو اس چیز کا جس کا خوف واجب ہے یا کچھ خوف ہو گویا اس صورت میں ان سے ظاہر طور پر دوستی کا تعلق کر لو، گو دل میں کچھ نہ ہو۔ اور پھر اس سے مسئلہ تقیہ کو اخذ کیا ہے۔ مگر درحقیقت ان الفاظ کو مسئلہ تقیہ سے کچھ تعلق نہیں۔ قرآن کریم میں اکراہ یا جبر کی حالت میں دوسری جگہ یوں فرمایا ہے: ﴿اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ﴾ [النحل: 106:16] ''مگر وہ نہیں جسے مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو۔'' یہ مکی آیت ہے اور مفصل بحث اس پر اپنے

مِنْهُمْ تُقٰىةً ؕ وَ يُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸﴾

اور اللہ تم کو اپنی سزا سے ڈراتا ہے۔ اور اللہ ہی کی طرف انجام کار پہنچنا ہے۔ (401)

موقعہ پر ہوگی مگر اس میں صرف اس قدر اجازت دی ہے کہ اگر قتل وغیرہ کے خوف کے وقت انسان کے منہ سے جان بچانے کے لیے کلمہ کفر نکل جائے تو اللہ معاف کر دے گا مگر ظاہر طور پر دوستی کا رنگ رکھنا حالانکہ دل میں دشمنی ہو یا بات بات پر جھوٹ بول کر پیچھا چھڑانا اسلام کی تعلیم کے سراسر خلاف ہے یہ زندگی کا منافقانہ رنگ ہے جسے اسلام سخت ترین نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ پس اکراہ کی صورت میں اگر کوئی شخص کوئی بات کہہ دے تو وہ اسے معاف ہے گو یہ اعلیٰ مقام مومن کا نہیں۔

اہل تشیع میں تقیہ:

لیکن اہل تشیع نے اس کو بہت وسیع کیا ہے اور ان کے نزدیک بوقت ضرورت ہر قول میں تقیہ جائز ہے ظاہر ہے کہ اس طرح جھوٹ پر جرأت ہوتی ہے اور ایک شخص کے کلام سے امن اٹھ جاتا ہے۔ کیونکہ اپنی ضرورت کا فیصلہ کرنے والا وہ خود ہوا، دوسرے کو کیا علم ہے کہ جو کچھ کہہ رہا ہے یہ صدق دل سے کہہ رہا ہے یا جھوٹ کہہ رہا ہے۔ اور اس طرح پر منافقت دنیا میں بڑھتی ہے۔ چنانچہ ان کے بعض آئمہ کا ایک یہ بھی قول مشہور ہے کہ [مَنْ صَلّٰى وَرَاءَ سُنِّيٍّ تَقْيَةً فَكَأَنَّمَا صَلّٰى وَرَآءَ نَبِيٍّ] (ر) یعنی جو شخص سنی کے پیچھے تقیہ کر کے نماز پڑھ لے گویا اس نے نبی کے پیچھے نماز پڑھی۔

کفار سے موالات کی ایک صورت:

الفاظ ﴿اِلَّاۤ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً﴾ کے معنی صاف ہیں مگر یہ کہ ان سے بچاؤ کر لو کسی طرح کا بچاؤ کر لینا۔ یعنی پورا پورا بچاؤ کر لو۔ گویا کفار سے یہ موالات کی صورت رکھی ہے کہ اس میں تمہارا اپنا بچاؤ مدنظر ہو یعنی کسی بڑے نقصان سے بچنے کے لیے اس کو اختیار کر لینا جائز ہے۔ مثلاً جنگ کی صورت میں ہی جب مسلمان مغلوب ہو جائیں تو مجبوراً اپنی حفاظت اور بچاؤ کے لیے جو صورت اختیار کرنی پڑے کر لیں۔ مگر جو کچھ عہد کریں اس کی پابندی ضروری ہوگی۔ جیسے نبی کریم ﷺ نے صلح حدیبیہ میں مغلوب فریق کی شرائط قبول کیں تو پھر ان کا ایفا بھی کیا یہاں تک کہ کفار نے خود اس عہد کو توڑ دیا۔ ایسا ہی جو کفار جنگ نہیں کرتے مگر ویسے اسلام کے نابود کرنے کی کوشش کرتے ہیں ان سے بھی مسلمانوں کو بچاؤ کی صورت کر لینی جائز ہے مگر یہ بچاؤ اور حفاظت قومی ہے نہ فرداً فرداً۔

401- ﴿وَ يُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ﴾ حَذَّرَ کسی خوف والے امر سے بچنا۔ (غ) اسی سے تحذیر ہے۔ نَفْسَهٗ سے مراد عقاب نفسہ ہی ہے نفس کا لفظ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا ہے اس سے مراد ذات ہے۔ سزا کو اپنی ذات کی طرف منسوب کرنے میں سخت تہدید ہے اور مطلب یہ ہے کہ اگر تم کو کفار کا خوف ہے تو اس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی سزا کا خوف ہونا چاہیے۔ پس ایسا نہ ہو کہ تم اللہ تعالیٰ کے حکم کی پروا نہ کرتے ہوئے دشمن سے خوف کرتے ہوئے اس کے ساتھ مل جاؤ۔ اور بعض کے نزدیک نَفْسَهٗ میں نفس کی اضافت اللہ کی طرف مِلک کی اضافت ہے اور نفس سے مراد انسانی نفس امارہ ہے۔ (غ) گویا مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم کو

قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۹﴾

کہہ، اگر جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے چھپاؤ یا اسے ظاہر کرو اللہ اسے جانتا ہے، اور وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (402)

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۚۛ وَّ مَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۚۛ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَ بَيْنَهٗٓ اَمَدًۢا بَعِيْدًا ؕ وَ يُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَ اللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۳۰﴾ ع

معانقة 4 عند المتأخرين

ع 3/10/11

جس دن ہر شخص جو کچھ اس نے نیکی کی ہے موجود پائے گا، اور جو کچھ اس نے بدی کی ہے، آرزو کرے گا کہ اس کے اور اس کے درمیان لمبا فاصلہ ہوتا۔ اور اللہ تم کو اپنی سزا سے ڈراتا ہے اور اللہ بندوں پر مہربان ہے۔ (403)

تمہارے نفوس امارہ سے ڈراتا ہے۔

402- **دشمنان اسلام کی مخفی تدابیر:** پچھلی آیت میں اعدائے اسلام کا ذکر تھا اور اہل اسلام کو ہدایت کی تھی کہ وہ انہیں اپنا دوست نہ بنائیں اس آیت میں اعدائے اسلام کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ خواہ تم اپنی تدابیر کو جو اسلام کی بیخ کنی کے لیے کر رہے ہو اپنے دلوں کے اندر مخفی رکھو اور خواہ ان کو ظاہر کر و یعنی خواہ پوشیدہ طور پر دشمنی کرو یا ظاہر طور پر اللہ تعالیٰ کو سب علم ہے اور وہ کسی تمہاری تدبیر کو کارگر نہ ہونے دے گا۔ بلکہ اس کی سزا تم کو دے گا۔ ہمارے نبی کریم ﷺ کا زمانہ تو ایسا تھا کہ اس وقت سب لوگ علی الاعلان ہی دشمن تھے سوائے تھوڑوں کے۔ اس لیے مخفی دشمنی کے ذکر میں اسلام کے آخری زمانہ کے دشمنوں کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے جو مسلمانوں کے ساتھ دوستی کا اظہار کرتے ہیں اور ان کی دوستی کا دم بھرتے ہیں۔ مگر ہر وقت ایسی تدابیر کے سوچنے میں مصروف ہیں جن سے اسلام اور مسلمانوں کی بیخ کنی ہو۔ سو یہ آیت مسلمانوں کے لیے باعث تسکین ہے کہ ان کا خدا مخفی تدابیر کا بھی وہی حشر کرے گا جو کھلی تدابیر کا کیا تھا۔ اس سورۃ کے صدر کا اصل مضمون اسی نتیجہ کا مؤید ہے۔

403- ﴿وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ﴾ مراد تو یہی ہے کہ جو کچھ بدی کی ہے اسے بھی موجود پائے گا لیکن مُحْضَرًا کے لفظ کو خیر کے ساتھ رکھا ہے کہ اصل غرض وہی ہے اور بدی کی سزا بتقاضائے ضرورت ہے اور نیز ﴿مَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ﴾ کو اس لیے بھی علیحدہ رکھا گیا ہے کہ اس کے متعلق کسی تمنی کا ذکر اگلے الفاظ میں آتا ہے۔

بَيْنَهَا میں ضمیر بعض نے يَوْمٌ کی طرف لی ہے یعنی اس جزا وسزا کے دن میں اور اس میں زمانہ دراز ہوتا مگر چونکہ جو نیک اعمال کی

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۱﴾

کہہ، اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو کہ اللہ تم سے محبت کرے اور تمہیں تمہارے گناہ بخش دے، اور اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ (404)

جزا پاتا ہے وہ یہ خواہش نہیں کرسکتا اس لیے ﴿مَا عَمِلَتْ﴾ کی طرف ہی اس کی ضمیر پھیرنا صحیح ہے۔

اَمَدًا۔ اَمَدٌ اور اَبَدٌ کے معنی قریب قریب ہیں۔ لیکن اَبَدًا اس زمانہ کو کہا جاتا ہے جس کے لیے کوئی حد محدود نہیں اور اَمَدٌ اس کو جو جب مطلق ہو تو اس کی حد مجہول ہوتی ہے اور زمان میں اور اَمَدٌ میں یہ فرق ہے کہ اَمَدٌ بلحاظ غایت بولا جاتا ہے۔ (غ)

اس آیت میں اسلام کے چھپے اور کھلے دونوں قسم کے دشمنوں کو یہ بتایا ہے کہ بدی کرنے والا انسان آخر اپنی بدی پر ضرور پچھتاتا ہے۔ اور ایک وقت آتا ہے جب وہ یہ تمنا کرتا ہے کہ کاش اس نے وہ برا کام نہ کیا ہوتا۔ اس میں فطرت انسانی کی شہادت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے یہ پیشگوئی بھی کی ہے کہ جو لوگ اسلام کے ساتھ بدی کرنا چاہتے ہیں وہ بھی آخر کار پچھتائیں گے۔ اس میں یہ بشارت بھی ہے کہ وہ انجام کار مسلمان بھی ہوں گے۔ یہ اس صورت میں ہے کہ اس یوم مذکور کو دنیا کا یوم سمجھا جائے اور کوئی شبہ نہیں کہ اس زندگی میں بھی انسان پر ایک وقت آتا ہے جب وہ اپنی بدیوں پر افسوس کرتا ہے لیکن اگر اس یوم کو یوم قیامت لیا جائے تو آخرت کی جزا و سزا مراد ہوگی اور یہ محض وعید ہوگا۔ بدی اور نیکی کے نتائج پانے کے اس قانون میں ابطال کفارہ بھی کیا ہے۔

404- **کفار کے ذکر میں مسلمانوں کو ہدایت:** یہ قرآن کریم کا کمال ہے کہ ان تمام آیات میں جن میں کسی خاص قوم سے خطاب ہے ایک طرف اگر ان پر اتمام حجت کرتا چلا جاتا اور لطیف سے لطیف امور کی طرف ان کو توجہ دلاتا ہے تو دوسری طرف مسلمانوں کو بھی کامل ہدایات دیتا چلا جاتا ہے۔ ان آیات میں جیسا کہ بیان ہو چکا خاص خطاب عیسائیوں سے ہے اور اس لیے ان کو بتایا ہے کہ تم خدا کے محب اور محبوب ہونے کے بڑے دعویدار ہو اور اس بات کے مدعی ہو کہ تمہارا مذہب خدا سے محبت سکھاتا ہے مگر خود مسیح جس کی پیروی سے تم خدا کی محبت کے مقام تک پہنچ سکتے تھے تم کو ہدایت دے گیا ہے کہ تمہاری خدا سے محبت اسی صورت میں قائم رہ سکتی ہے کہ میرے پیچھے آنے والے کو مانو اور اس کی اتباع کرو۔ اور یوں یہاں مسیح کے ان الفاظ کی طرف اشارہ ہے جو [یوحنا: 14:15, 16] میں مذکور ہیں:

> ''اگر تم مجھ سے پیار کرتے ہو تو میرے حکموں پر عمل کرو اور میں اپنے باپ سے درخواست کروں گا اور وہ تمہیں دوسرا تسلی دینے والا بخشے گا۔''

جس لفظ کے معنی تسلی دینے والا کیے گئے ہیں اس کے معنی شفیع بھی ہو سکتے ہیں۔ جیسا کہ بائبل کے نئے ترجموں کے حواشی پر صاف نوٹ دیا ہوا ہے۔ اب جائے غور ہے کہ یہ دوسرا تسلی دہندہ دوسرا شفیع جو مسیح کے بعد دنیا میں آیا کون ہے؟ عیسائیوں کو حکم

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۲﴾

کہہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو، پھر اگر وہ پھر جائیں تو اللہ انکار کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا۔

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۳﴾ۙ

اللہ نے آدم اور نوح اور ابراہیم کے گھرانے اور عمران کے خاندان کو قوموں پر چن لیا۔ (405)

تھا کہ جب دوسرا شفیع آ جائے تو اس کی اتباع کریں اور اسی بات پر قرآن کریم یہاں ان کو ملزم کرتا ہے۔

دوسری طرف مسلمانوں کو بھی بتاتا ہے کہ وہ نرے زبانی دعووں سے یا اپنے تجویز کردہ طریقوں سے خدا کے محبوب نہیں بن سکتے بلکہ ضروری ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے نقش قدم پر چلیں۔ اس بات کو بیان کرنے کی ضرورت اس لیے تھی کہ اس رکوع میں ذکر یہ کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن قوموں کو پہلے چنا، کس طرح وہ آخر رضائے الٰہی کی راہ سے دور پڑ گئیں۔ اس لیے مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ وہ رضائے الٰہی کے مقدم کرنے کو کبھی نہ چھوڑیں اور نہ دنیا کی مرغوبات میں حد سے زیادہ منہمک ہوں تا کہ ان کا حشر دوسری قوموں کی طرح نہ ہو۔

الفاظ ﴿يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ﴾ میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ **گناہوں سے حفاظت کفارہ پر ایمان سے نہیں ہوتی**۔ بلکہ ان راہوں پر چلنے سے ہوتی ہے۔ جو اللہ تعالیٰ تک پہنچانے والی ہیں اور جن کو محمد رسول اللہ ﷺ نے کامل طور پر دنیا پر ظاہر کیا جیسا کہ خود مسیح نے بھی کہا تھا:

''مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنی ہیں مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ یعنی سچائی کا روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا۔''

پس جب تمام سچائی کی راہیں دکھانے والا ابھی آنا تھا تو کفارہ گناہوں سے کیونکر چھڑا سکتا ہے۔

405- نُوْحٌ عربی میں نَاحٌ کے معنی ہیں نوحہ کیا، رویا۔ اور اس کا مصدر نَوْحٌ ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام ایک عظیم الشان نبی گزرے ہیں جن کی پیدائش بائبل والوں نے کوئی تین ہزار سال قبل مسیح بیان کی ہے۔ مگر نئے مفسرین بائبل اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے قبل کے واقعات کے متعلق کوئی صحیح تاریخی اندازہ موجود نہیں۔ قرآن کریم سے ایسا قیاس کیا جا سکتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد ایک عظیم الشان نبی حضرت نوح علیہ السلام ہوئے ہیں جن سے ایک نئے سلسلہ کی بنیاد پڑی۔ لیکن موجودہ نسل انسانی کا حضرت نوح کی علیہ السلام اولاد سے ہونا قرآن شریف سے ہرگز ثابت نہیں ہوتا۔

عِمْرَانَ۔ یہ امر تاریخی طور پر ثابت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والد کا نام عمران تھا اور اس لیے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام سے جو سلسلہ نبوت شروع ہوا وہ آل عمران کے اندر داخل ہوگا۔ گویا آل عمران سلسلہ موسویہ کے قائم مقام ہے۔ مقاتل نے یہاں عمران سے

ذُرِّيَّةًۢ بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۴﴾

(یہ) ایک دوسرے کی نسل سے (تھے)، اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔(406)

مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والد کو ہی لیا ہے۔ بہت سے مفسرین نے یہ خیال کیا ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام کے والد کا نام بھی عمران تھا مگر اس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں۔ گو اس کے خلاف بھی کوئی تاریخی ثبوت نہیں۔

حضرت عیسیٰؑ کے ذکر کی ابتدا:

اس آیت سے اس رکوع بلکہ اس سورۃ کا اصل مضمون شروع ہوتا ہے۔ کیونکہ اصل غرض حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قصہ کو صاف کر کے حضرت نبی کریم ﷺ کی نبوت کی صداقت کو ظاہر کرنا ہے۔ اس قصہ کو شروع کرنے کے لیے ابتدا یوں کی ہے کہ عیسیٰ خدا کا ایک ہی برگزیدہ بندہ نہیں بلکہ جب سے نسل انسانی کی ابتدا ہوئی اسی وقت سے اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کو برگزیدہ کرتا رہا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام ان کے بعد ان کی نسل سے حضرت نوح علیہ السلام جنہوں نے ایک نئے سلسلہ کی بنیاد رکھی پھر آل ابراہیم اور آل عمران جو آل ابراہیم کی ایک شاخ ہے اور اس آل عمران یعنی سلسلہ موسویہ کے بہت سے انبیاء علیہم السلام میں سے ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ آل ابراہیم کے بعد آل عمران کا ذکر کر کے یہ اشارہ کیا ہے کہ آل ابراہیم کا دوسرا عظیم الشان سلسلہ سلسلہ محمدیہ ہے جیسا کہ بالتفصیل آگے آئے گا۔ آدم سے شروع کرنے میں اور پھر قومی نبیوں کا ذکر کرنے میں یہ بھی اشارہ ہے کہ جس طرح **آدم اوّل** کا پیغام بتقاضائے ضرورت تمام نبیوں سے ایک الگ رنگ رکھتا تھا۔ اسی طرح **آدم آخر** یعنی محمد رسول اللہ ﷺ کا پیغام بھی بتقاضائے ضرورت تمام نبیوں سے الگ رنگ کا ہونا ضروری تھا اور جس طرح پہلے آدم کا پیغام اس کی ساری ذریت کی طرف تھا، گو محدود ہو۔ کیونکہ یہ موجودہ نسل انسانی کی ابتدا تھی اور حضرت آدم علیہ السلام اپنی ہی ذریت کی طرف مبعوث ہوئے۔ اسی طرح، آدم آخر کا پیغام ساری نسل آدم یعنی نسل انسانی کی طرف ہوا۔ گو وہ اس وجہ سے سب سے زیادہ وسیع ہو گیا۔ کیونکہ آدم آخر کے وقت نسل انسانی تمام روئے زمین پر پھیل چکی تھی۔ آدم اور حضرت نبی کریم ﷺ کا پیغام تمام نسل انسانی کی طرف تھا اور درمیان میں جس قدر نبی ہوئے ہیں ان کا پیغام ایک ایک قوم کی طرف تھا۔

تمام جہانوں پر چن لینے سے یہ مراد ہے کہ اپنے اپنے زمانہ کے لوگوں یا قوموں پر ان کو چنا۔ کل دنیا لازمی طور پر مراد نہیں۔ کیونکہ کل دنیا پر اِصْطِفَا کے لیے صرف ایک کا ذکر چاہیے تھا۔ بہتوں کا ذکر بتاتا ہے کہ اپنے اپنے زمانہ کے لوگوں پر ہی اِصْطِفَا مراد ہے۔

406- ذُرِّيَّةً۔ یہ بدل ہے آل ابراہیم اور آل عمران سے یا حال ہے۔ اس لیے منصوب ہے۔

﴿بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ﴾۔ مراد ایک دوسرے کی نسل سے ہونا ہے۔ یعنی آل عمران آل ابراہیم کی نسل ہے یا آل ابراہیم نوح کی نسل سے ہے۔ اور بعض کے نزدیک ﴿بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ﴾ سے اشارہ اتحاد نسل کی طرف نہیں بلکہ ایک اور قسم کی یگانگت کی طرف ہے جو دین سے تعلق رکھتی ہے جیسا کہ قتادہ سے مروی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات سَمِیْعٌ وعَلِیْمٌ کے آخر لانے سے یہ ظاہر

اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّیْ جب عمران کی ایک عورت نے[407] کہا میرے رب جو

کرنا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کی دعاؤں کو سنتا اور پھر جانتا ہے کہ کون شخص کس بلند مقام پر کھڑا کیا جانے کے لائق ہے۔

407- ﴿امْرَاَتُ عِمْرٰنَ﴾ اِمْرَأَتُ عِمْرَانَ کے معنی دونوں طرح پر ہو سکتے ہیں۔ عمران کی بی بی (اس صورت میں عمران مریم کے والد کا نام ہوا اور بزرگوں کے ناموں پر نام رکھنا یہ ایک عام رواج تھا۔) یا آل عمران کی عورت۔ چونکہ اوپر آل عمران کی برگزیدگی کا ذکر تھا اور اسی کے متعلق مضمون چلتا ہے اس لیے اس دوسرے معنی کو ترجیح ہے۔ اور عمران کا آل عمران کی جگہ رکھا جانا عام محاورہ کے مطابق ہے چنانچہ بائبل میں بھی ایک بڑے مورث کے نام سے ایک قوم کو پکارا گیا ہے جیسا بنی اسرائیل کی جگہ بہت دفعہ صرف اسرائیل ہی آیا ہے اور بنی اسماعیل کو قیدار کے نام سے پکارا ہے جو عربوں کے مورث اعلیٰ تھے۔ پس اس لحاظ سے قرین قیاس یہی ہے کہ عمران سے مراد سلسلہ آل عمران ہے اور یہاں ذکر انہی میں سے ایک عورت کا ہے اور چونکہ اوپر آل عمران کے اصطفا کا ذکر ہے جو عام ہے۔ یہاں ان میں کی ایک خاص عورت کا ذکر فرمایا۔ جس کے ذریعہ آل عمران کے آخری برگزیدہ انسان کا ظہور ہونا تھا۔ ایک دوسری مثال جو اسی ذکر کے اندر آئے گی وہ بھی آل عمران کی آخری یادگاروں یعنی زکریا اور یحییٰ علیہما السلام کے متعلق ہے۔ یہ بھی یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ قرآن کریم میں دوسری جگہ مریم کو ﴿یٰۤاُخْتَ هٰرُوْنَ﴾ [مریم: 28:19] ''اے ہارون کی بہن!'' اور ﴿ابْنَتَ عِمْرٰنَ﴾ [التحریم: 12:66] ''عمران کی بیٹی'' کر کے پکارا گیا ہے اور گو بعض مفسرین نے ان دونوں ناموں عمران اور ہارون کی یہ توجیہ کی ہے کہ عمران حضرت مریم رضی اللہ عنہا کے والد کا نام تھا اور ہارون آپ کے ایک بھائی کا نام تھا اور اس کے خلاف شہادت نہ ہونے کی وجہ سے یہ بات بھی قابل قبول ہے لیکن چونکہ اس امر کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں۔ اور جس عمران کا اوپر ذکر کیا اس سے صاف طور پر مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والد ہیں۔ اور ہارون جس کا ذکر قرآن میں آیا ہے وہ بھی اسی عمران کے بیٹے ہیں۔ اسی لیے اقرب الی الفہم یہی بات ہے کہ ﴿امْرَاَتُ عِمْرٰنَ﴾ اور ﴿یٰۤاُخْتَ هٰرُوْنَ﴾ دونوں لفظوں میں انہی اعلیٰ مورثوں کی طرف اشارہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حضرت مریم علیہا السلام کا کوئی نسب نامہ ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ مگر یہ بہر حال معلوم ہوتا ہے کہ مریم کے والدین کا تعلق بنی اسرائیل میں خاندان کہانت سے تھا اور اسی خاندان سے حضرت زکریا کا بھی تعلق تھا اور مریم کا ہیکل کی خدمت کے لیے مخصوص کیا جانا بھی اسی بات کو ظاہر کرتا ہے۔ اور چونکہ کہانت کا تعلق حضرت ہارون علیہ السلام کے خاندان سے تھا اس لیے مریم کو اخت ہارون اور اس کی والدہ کو امراۃ عمران کے نام سے پکارا ہے۔ عربی زبان میں لفظ اَبٌ۔ اَمٌّ۔ اَخٌ۔ اُخْتٌ سب کے سب وسیع معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: [أَنَا دَعْوَةُ أَبِيْ إِبْرَاهِيْمَ] (کنز العمال: جلد12، صفحہ423، حدیث 35479) میں اپنے باپ ابراہیم کی دعا ہوں۔ یہاں ابراہیم کو صاف طور پر اپنا اَبٌ کہا ہے اور ایک حدیث میں ہے کہ جب حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے شکایت کی کہ مجھے یہودی عورت کہا جاتا ہے تو آپ نے فرمایا: تو نے جواب میں یوں کیوں نہیں کہا: [إِنَّ أَبِيْ هَارُوْنَ وَعَمِّيْ مُوْسٰى وَزَوْجِيْ مُحَمَّدٌ] (المستدرك للحاكم: جلد4، صفحہ 31) میرا باپ ہارون ہے اور میرا چچا موسیٰ ہے اور میرا خاوند محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں۔ یہاں صفیہ رضی اللہ عنہا کا باپ اور چچا ہارون اور موسیٰ علیہما السلام کو قرار دیا ہے اور پھر عجیب بات یہ ہے کہ ایک ہی جملہ میں زوج تو اپنے حقیقی معنوں پر ہے اور اَبٌ

نَذَرْتُ لَكَ مَا فِيْ بَطْنِيْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّيْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۵﴾

کچھ میرے پیٹ میں ہے میں نے آزاد کر کے تیری نذر مانا ہے پس مجھ سے قبول فرما کیونکہ تو سننے والا جاننے والا ہے۔ (408)

اور عم دور کے تعلق والوں پر بولے ہیں۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ عمران اور ہارون کے لفظوں سے وہی عمران اور ہارون مراد نہ لیے جائیں اور اِمْرَاَۃٌ اور اُخْتٌ کے وسیع معنی نہ لیے جائیں۔

408- مُحَرَّرًا۔ تحریر کے معنی انسان کو حر کر دینا۔ (غ) اور مفردات میں ہے کہ انسان حر دو طرح پر ہوتا ہے ایک وہ جس پر کسی شے کا حکم جاری نہ ہو۔ جیسے: ﴿اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ﴾ یعنی جسمانی طور پر آزاد۔ اور دوسرا اخلاقی طور پر آزاد [وَمَنْ لَمْ تَتَمَلَّكْهُ الصِّفَاتُ الذَّمِيْمَةُ مِنَ الْحِرْصِ وَالشَّرَهِ عَلَى الْمُقْتَنِيَاتِ الدُّنِيْوِيَّةِ]۔ (غ) یعنی وہ شخص جس پر بری صفات حکمران نہیں۔ جیسے دنیوی مال و دولت پر حرص اور لالچ۔ راغب کے نزدیک مُحَرَّرًا سے مراد اسی قسم کی صفات ذمیمہ سے آزادی ہے جیسا کہ اس کے مقابل پر کسی شخص کو عَبْدُ الدِّرْهَمِ کہہ دیتے ہیں۔ یا عَبْدُ الشَّهْوَةِ کہہ دیتے ہیں۔ اور بعض کے نزدیک محرر سے مراد صرف اس قدر ہے کہ وہ اس سے دنیوی نفع نہ اٹھائے گی بلکہ اس کو عبادت الٰہی کے لیے مخصوص کیا جائے گا۔ اس لیے شعبی نے اس کے معنی مخلص کیے ہیں۔ مجاہد نے خَادِمًا لِلْبِيْعَةِ کیے ہیں۔ یعنی عبادت گاہ کی خادم اور بعض نے امر دنیا سے آزاد اس کے معنی کیے ہیں۔ (غ) بظاہر ان سب کا ماحصل ایک ہی ہے۔ یعنی اس کو خدمت دین کے لیے وقف کر دیا جائے گا۔

اولاد کو خدمت دین کے لیے وقف کرنا:

گزشتہ قصے تو سب مسلمانوں کی عبرت کے لیے بیان ہوئے ہیں۔ اس بیان میں یہ اشارہ ہے کہ بنی اسرائیل کی اس گئی گزری حالت میں ان کے اندر ایسے لوگ ابھی موجود تھے جو محض خدمت دین الٰہی کے لیے اپنی اولاد کو وقف کر دیتے تھے اور درحقیقت کوئی دین قائم نہیں رہ سکتا جب تک کہ اس کے اندر وہ لوگ موجود نہ ہوں جو اپنی زندگیوں کو دین کے لیے وقف کر دیں۔ کاش مسلمان آج اس سے سبق حاصل کریں اور ان میں ایسے لوگ پیدا ہوں جو اپنی اولاد کو خدمت دین کے لیے وقف کر دیں اور بچپن سے ان کو خدمت دین کے لیے تیار کریں۔ مگر یہاں تو عربی پڑھانے سے بھی بھاگتے ہیں اس لیے کہ بی اے میں روٹیاں اچھی مل جاتی ہیں۔ رونے کا مقام ہے کہ اس قوم کی نظر اس قدر تنگ ہو جائے جس کے اصول دین میں آخرت پر ایمان تھا۔ مگر مسلمان یاد رکھیں کہ گو وہ ساری دنیا کے بادشاہ بھی پھر بن جائیں مگر دین اسلام کی شوکت و عظمت دنیا میں قائم نہیں ہو سکتی جب تک کہ ان میں وہ لوگ کثرت سے نہ ہوں جو خدا کے دین کے لیے اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔

فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَاۤ اُنْثٰى ؕ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ؕ وَ لَیْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى ۚ وَ اِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ وَ اِنِّیْۤ اُعِیْذُهَا بِكَ وَ ذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ﴿۳۶﴾

پھر جب اس نے جنا، کہا میرے رب میں نے یہ لڑکی جنی ہے اور اللہ بہتر جانتا ہے جو اس نے جنا۔ اور لڑکا اس لڑکی کی طرح نہیں۔[409] اور میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے اور میں اسے اور اس کی نسل کو شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔[410]

409- **عورتیں بھی خدمت دین کر سکتی ہیں:** ﴿وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ﴾ جملہ معترضہ ہے۔ جب مریم کی والدہ نے بچہ جنا اور اس بچہ کو اس نے خدمت دین کے لیے وقف کرنے کی نذر مانی ہوئی تھی تو اس نے تعجب سے کہا کہ میں نے تو ایک لڑکی جنی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک جملہ میں بتا دیا کہ لڑکی بھی اس خدمت کو ادا کر سکتی ہے جس کے لیے اس نے لڑکے کو وقف کرنا چاہا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے علم کے ذکر سے یہ مقصود ہے کہ اس بات پر تعجب نہ کرو کہ یہ خدمت دین کیونکر کر سکے گی۔ اللہ اس کے مقام عظمت سے خوب واقف ہے اور وہ خوب جانتا ہے کہ جو مریم کی والدہ نے نذر مانی ہے اس کو یہ لڑکی بھی پورا کر سکتی ہے۔

﴿وَ لَیْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى﴾ یہ دوسرا جملہ معترضہ ہے اور اَلذَّكَرُ اور اَلْاُنْثٰى میں لام عہد کا ہے یعنی وہ لڑکا جسے تو چاہتی تھی اس لڑکی جیسا نہیں وہ تو صرف ایسا لڑکا چاہتی تھی جس کی زندگی خدمت دین کے لیے وقف ہو اور یہ ایک معمولی خواہش تھی کہ اس کے ہاں خادم دین لڑکا ہو اور خادم دین لڑکے ہر حیثیت کے ہو سکتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اسے ایک بہت بلند مرتبہ کی لڑکی عطا فرمائی جسے اس زمانہ کی ساری عورتوں پر بلند درجہ دیا جیسے ﴿وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ﴾ [42] سے ظاہر ہے۔

بعض مفسرین نے اسے جملہ معترضہ قرار دینے کی بجائے مریم کی والدہ کا قول قرار دیا ہے اور مراد یہ لی ہے کہ لڑکے لڑکیوں جیسے نہیں ہوتے یعنی ''ال'' جنس کا لیا ہے جو کچھ کام لڑکا کر سکتا ہے وہ لڑکی نہیں کر سکتی۔

410- اُعِیْذُ۔ عَوْذٌ کے معنی ہیں کسی دوسرے کی طرف پناہ چاہنا اور اس کے ساتھ تعلق۔ (غ) پس اَعَاذَ کے معنی ہوئے اس کی پناہ میں دیا۔

رَجِیْمٌ۔ رجم کے اصل معنی اَلرَّمْیُ بِالرِّجَامِ ہیں۔ (غ) یعنی کنکروں کے ساتھ مارنا مگر بطور مستعار یہ لفظ رَمْیٌ بِالظَّنِّ پر یعنی ظنون کے پھینکنے پر اور تو ہم پر اور شتم یعنی گالی دینے پر اور طَرْدٌ یعنی دھتکارنے یا دور کرنے پر بولا جاتا ہے اور اَلشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ میں اَلرَّجِیْمِ کے معنی ہیں بھلائی سے اور ملأ اعلیٰ کے منازل سے دور کیا گیا۔ (غ)

مریم کا بیاہا جانا اور صاحب اولاد ہونا:

حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ کی اس دعا سے معلوم ہوتا ہے کہ مریم کو باوجود ہیکل کی خدمت کے لیے وقف کرنے کے ان کا یہ منشا نہ

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّ سو اس کے رب نے اس کو اچھی قبولیت سے قبول کیا اور اس کو

تھا کہ وہ کنواری رہے گی بلکہ وہ جانتی تھی کہ وہ جوان ہو کر بیاہی جائے گی اور صاحب اولاد ہوگی۔ اس لیے انہوں نے نہ صرف مریم کے لیے دعا کی بلکہ مریم کی اولاد کے لیے بھی۔ رہبانیت یا تارک الدنیا ہونے کا طریق عیسائیوں کا ایجاد ہے۔

حدیث مس شیطان:

اس آیت کی تفسیر میں بخاری میں ہے: [عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: "مَا مِنْ مَّوْلُودٍ يُولَدُ إِلَّا وَالشَّيْطَانُ يَمَسُّهُ حِينَ يُولَدُ، فَيَسْتَهِلُّ صَارِخًا مِنْ مَسِّ الشَّيْطَانِ إِيَّاهُ، إِلَّا مَرْيَمَ وَابْنَهَا".] (صحيح البخاري، كتاب التفسير، باب (وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ): 4548) ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ ''کوئی بچہ پیدا نہیں ہوتا مگر کہ شیطان اسے چھوتا ہے جب وہ پیدا ہوتا ہے۔ پس وہ شیطان کے اس کو چھونے سے فریاد کرتا ہوا آواز بلند کرتا ہے سوائے مریم اور اس کے بیٹے کے۔'' اس کے بعد آتا ہے کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے کہ اگر چاہو تو پڑھو ﴿ اِنِّيْٓ اُعِيْذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴾ گویا یہ حدیث ان کے نزدیک اسی آیت کی تفسیر ہے۔

بظاہر جو کچھ اس حدیث کا منشا معلوم ہوتا ہے یعنی یہ کہ تمام بنی آدم کو پیدائش کے وقت شیطان چھوتا ہے سوائے مریم اور اس کے بیٹے کے۔ یہ بوجوہات قطعیۃ الدلالت باطل ہے۔

1. اوّل: آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ نے جو مریم اور اس کی ذریت کے لیے شیطان سے پناہ مانگی ہے وہ مریم کے پیدا ہونے کے بعد بلکہ اس کا نام بھی رکھنے کے بعد مانگی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ نام کبھی بچہ کے فوراً پیدا ہوتے نہیں رکھا جاتا اور حدیث جسے اس کی تفسیر قرار دیا جاتا ہے اس میں یہ ہے کہ ہر بچہ کو پیدا ہوتے ہی شیطان مس کرتا ہے۔ پس یا اس اعاذہ کو اس مس شیطانی سے کوئی تعلق نہیں جس کا ذکر حدیث میں ہے۔ ورنہ جب مس شیطانی کا وقت ہی گزر چکا تو پھر دعا کرنے کا کیا فائدہ تھا اور یا حدیث اس آیت کی تفسیر نہیں بلکہ حدیث کا ظاہری مفہوم آیت کے خلاف ہے۔

2. دوم: اگر بچہ کا پیدا ہوتے ہی رونا مس شیطانی کا نتیجہ ہوتا ہے تو پانچ منٹ بعد رونا کس بات کا نتیجہ ہے یا کیا حضرت مریم علیہا السلام اور حضرت مسیح بچپن میں کبھی روئے ہی نہیں۔ اگر بچپن میں کبھی نہ روئے تھے تو بڑے ہو کر کیوں روتے تھے؟ حضرت مسیح کے متعلق تو صاف لکھا ہے کہ وہ رو رو کر دعائیں کرتا تھا اور حضرت مریم علیہا السلام کا دردزہ کے وقت ﴿ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا ﴾ [مریم: 23:19] ''اے کاش! میں اس سے پہلے مر جاتی۔'' کہنا بتاتا ہے کہ اس وقت وہ بھی روئی ہوں گی۔ جن وجوہات سے تمام بچے بعد میں روتے ہیں انہی میں سے کسی وجہ سے پیدا ہوتے ہی روتے ہیں اور حضرت مریم علیہا السلام اور ان کا بیٹا بچپن کے ایام میں اسی طرح روتے تھے۔ جس طرح دوسرے بچے روتے ہیں ورنہ وہ بڑے ہو کر کیوں روتے؟

❸ سوم: شیطان کا چھونا دو معنوں میں آتا ہے۔ایک کسی تکلیف کے پہنچانے کے معنی میں جیسے: ﴿اَنِّیْ مَسَّنِیَ الشَّیْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّ عَذَابٍ﴾[صٓ: 41:38] ''مجھے شیطان نے تکان اور تکلیف پہنچائی ہے۔''اس معنی میں حضرت مسیح کو بھی دکھ پہنچا۔ جب یہودیوں نے ان کو طرح طرح کی تکلیفیں دیں اور آخر صلیب پر چڑھایا اور دوسرے وسوسہ ڈالنے کے معنی میں جیسے: ﴿اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓىِٕفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَكَّرُوْا﴾[الأعراف: 201:7] ''جب ان کو شیطان سے کوئی خیال پہنچتا ہے،(خدا کو) یاد کرتے ہیں۔'' مگر **بچہ کے دل** میں عین پیدائش کے وقت **شیطان کا وسوسہ ڈالنا بے معنی بات ہے**۔شیطانی وساوس کا تعلق سن تمیز سے ہے۔جس کو ہوش ہی نہیں اس کے دل میں شیطان کیا وسوسہ ڈالے گا۔

❹ چہارم: قرآن شریف اور حدیث صحیح کا اس پر اتفاق ہے کہ **ہر بچہ پیدائش کے وقت معصوم پیدا ہوتا ہے**۔قرآن کریم میں ہے: ﴿فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا﴾[الروم: 30:30] یعنی اللہ تعالیٰ نے سب لوگوں کو فطرت صحیحہ پر پیدا کیا ہے اور حدیث میں اسی کی تفسیر میں ہے:[مَا مِنْ مَوْلُوْدٍ اِلَّا یُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ] (صحيح البخاري، كتاب التفسير، باب (وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ): 4548) ''کوئی بچہ نہیں مگر صحیح فطرت پر پیدا ہوتا ہے'' اور یہ بات اصول اسلام میں داخل ہے کہ ہر بچہ معصوم پیدا ہوتا ہے۔پس وہی مذہب یہ تعلیم نہیں دے سکتا کہ ہر بچہ کو پیدائش کے وقت شیطان چھوجاتا ہے۔

احادیث میں یحییٰ کا گنہگار رہونے سے استثناء:

سوال ہوگا کہ کیا یہ حدیث صحیح نہیں۔بلاشبہ اس کے وہ معنی صحیح نہیں جو پادری صاحبان لیتے ہیں کہ اس سے تمام انبیاء کا سوائے مریم اور ابن مریم کے گنہگار رہونا لازم آتا ہے۔گنہگار نہ ہونے کے بارہ میں تو اس سے زیادہ صریح الفاظ اور موجود ہیں۔ایک حدیث میں ہے: [مَا مِنْ عَبْدٍ يَلْقَى اللهَ إِلَّا ذَا ذَنْبٍ إِلَّا يَحْيَى بْنِ زَكَرِيَّا]۔(کنز العمال،جلد11،صفحہ521، حدیث:32431)(ث) کوئی بندہ نہیں مگر وہ خدا کو گنہگار رہونے کی حالت میں ملے گا سوائے یحییٰ بن زکریا کے۔اور اسی کی روایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے یوں ہے: [كُلُّ ابْنِ آدَمَ يَلْقَى اللهَ بِذَنْبٍ يُعَذِّبُهُ عَلَيْهِ، إِنَّ شَاءَ أَوْ يَرْحَمُهُ، إِلَّا يَحْيَى بْنُ زَكَرِيَّا](تفسیر ابن کثیر،جلد2،صفحہ39)(ث)

یحییٰ،مریم،ابن مریم کا ذکر بطور مثال:

ان احادیث کی رو سے تو مریم اور ابن مریم دونوں ذَا ذَنْبٍ قرار پاتے ہیں،مگر نہیں۔ایسی احادیث میں صرف ان لوگوں کی پاکیزگی پر زور دینا مقصود ہوتا ہے جن پر جھوٹے الزامات لگائے گئے ہوں اور جس طرح یحییٰ سے مراد حضرت یحییٰ نہیں بلکہ ہر وہ شخص جو اس زمرہ صالحین میں داخل ہے جن میں سے یحییٰ ایک ہے مراد ہے اسی طرح مریم اور اس کے بیٹے سے بھی ہر وہ شخص مراد ہے جو مریم صفت ہے اور جو ابن مریم والے زمرہ صلحا میں داخل ہے۔اور یحییٰ اور مریم اور ابن مریم یہاں سب بطور مثال ہیں اور ان کے ناموں کا انتخاب اس لیے ہوا کہ ان پر بہت سخت الزام لگائے گئے اور زمرۂ صلحا میں یہی لوگ آنحضرت ﷺ کے قریب تر تھے۔

حدیث مس شیطان کا اصل مفہوم:

اگر حدیث کے الفاظ پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ واقعی وہی توجیہ درست ہے جو اوپر کی گئی ہے کہ مریم وغیرہ یہاں صفاتی نام ہیں اور بطور مثال رکھے گئے ہیں۔ اصل میں حدیث میں بچہ کے رونے کا ذکر نہیں بلکہ بڑے آدمی کے فریاد رسی کے طور پر آواز بلند کرنے کا ذکر ہے اور مدد مانگنے کا ذکر ہے۔ چنانچہ اِسْتِهْلَالٌ کے معنی رونا نہیں بلکہ آواز بلند کرنا ہے جس طرح رویت ہلال کے وقت آوازیں بلند کی جاتی ہیں تا کہ لوگوں کو خبر ہو جائے اسی سے اِهْلَالٌ ہے اور صَارِخٌ کے معنی بھی رونے والا نہیں بلکہ بالاتفاق صَارِخٌ اس شخص کو کہا جاتا ہے جو مدد کے لیے کسی کے پاس فریاد لے جائے یعنی مستغیث کو۔ (ل) اور صَرَخَ فُلَانٌ کے معنی ہیں [اِسْتَغَاثَ فَقَالَ وَاغَوْثَاهُ] اس نے فریاد کی اور کہا کوئی میری مدد کے لیے پہنچے اور قرآن کریم میں ہے: ﴿فَلَا صَرِيْخَ لَهُمْ﴾ [یٰسٓ: 43:36] جہاں صریخ کے معنی فریاد رس یا مددگار ہیں نہ رونے والا۔ پس مس شیطان کا جو نتیجہ لکھا ہے فَيَسْتَهِلُّ صَارِخًا تو وہ صرف اس قدر ہے کہ وہ شخص جس کو شیطان چھوتا ہے۔ وہ فریاد کرتا ہوا آواز بلند کرتا ہے۔ پس يُوْلَدُ سے مراد یہاں بچہ کا پیدا ہونا نہیں بلکہ انسان کی پیدائش روحانی ہے یا گناہ کا احساس اس کے اندر پیدا ہونا اور اس پیدائش روحانی کو دو قسم پر تقسیم کیا ہے، ایک وہ لوگ جو مریم صفت ہیں اور ان کو شیطان چھوتا بھی نہیں۔ یعنی وسوسہ اندازی نہیں کر سکتا۔ اور دوسرے وہ لوگ جن کو شیطان چھوتا ہے پھر وہ خدا کی طرف رجوع کرتے ہیں تو آخر کار شیطان پر غالب آجاتے ہیں اور یہ صرف اس حدیث سے معلوم نہیں ہوتا بلکہ خود قرآن کریم نے اس کو بتصریح بیان فرمایا ہے: ﴿وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ ۘ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَ نَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَ عَمَلِهٖ وَ نَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۙ﴿۱۱﴾ وَ مَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْۤ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَ صَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَ كُتُبِهٖ وَ كَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ ﴿۱۲﴾﴾ [التحریم: 66:11-12] ''اور اللہ ان کے لیے جو ایمان لائے، فرعون کی عورت کی مثال بیان کرتا ہے۔ جب اس نے کہا اے میرے رب! میرے لیے اپنے پاس جنت میں گھر بنا اور مجھے فرعون اور اس کے عمل سے نجات دے اور مجھے ظالم لوگوں سے نجات دے۔ اور مریم عمران کی بیٹی، جس نے اپنی عصمت کو محفوظ کیا تو ہم نے اپنی روح اس میں پھونکی اور اس نے اپنے رب کی باتوں کی اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی اور وہ فرمانبرداروں میں سے تھی۔'' یہاں مومنوں کی مثال دو عورتوں سے دی ہے۔ اول فرعون کی بی بی، دوسرے مریم۔ اول کی صفت میں بیان فرمایا کہ ان کے دلوں میں یہ تڑپ پیدا ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو فرعون اور اس کے عمل سے نجات دے۔ معلوم ہوا کہ ان لوگوں پر شیطان اپنی وسوسہ اندازی کرتا رہتا ہے مگر وہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے اور بار بار تڑپ تڑپ کر اس کی طرف آتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ تو ہم کو فرعون سے نجات دے۔ اسی کے مطابق حدیث میں ہے [فَيَسْتَهِلُّ صَارِخًا] مومن پر جب شیطان حملہ کرتا ہے تو وہ خدا کی طرف فریاد لے جاتا ہے اور خدا سے مدد چاہتا ہے یہ اس کی روحانی پیدائش ہے۔ اور دوسرے کی صفت میں بیان فرمایا کہ وہ مریم صفت ہیں ﴿الَّتِيْۤ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا﴾ فَرَجٌ کے معنی مواقع مخافت ہیں۔ یعنی انہوں نے ان تمام راہوں کو مضبوط کر لیا ہوتا ہے جن سے شیطان حملہ آور ہو سکتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو محفوظیت کے مقام پر پہنچ چکے ہیں جس کو انبیاء میں مقام عصمت کہا جاتا ہے اور حدیث گویا انہی دو آیتوں کی تفسیر ہے نہ آیت ﴿اُعِيْذُهَا بِكَ﴾ کی جس کے ساتھ اس کا کچھ تعلق نہیں۔ پس جس طرح آیت

اَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا وَّ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ؕ عمدہ پرورش سے بڑھایا اور اسے زکریا کے سپرد کیا۔ (411)

قرآنی میں مریم صفت مومنوں کا ذکر ہے۔ اسی طرح حدیث میں مریم کا نام لے کر مریم صفت مومنوں کا ذکر کیا اور یہی وجہ ہے کہ مریم کے ذکر کو مقدم کیا کہ وہی اصل مقصود ہے اور اِبْنُهَا یعنی ابن مریم کو پیچھے رکھا ہے کہ وہ بطور نتیجہ ہے۔ کیونکہ جب مومن بھی اس محفوظیت کے مقام پر پہنچ جاتے ہیں تو پھر انبیاء بدرجہ اولیٰ اس مقام پر ہیں اگر ابن مریم کی کوئی بڑائی مقصود ہوتی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام پہلے لیا جاتا۔ یہی اصل توجیہ اس حدیث کی ہے جو اس کو قرآن اور حدیث اور واقعات کے مطابق ٹھہراتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اصل اصول مذہب کے قرآن شریف سے لیے جاتے ہیں اور احادیث کو قرآن کریم کے ماتحت کیا جاتا ہے۔ کیونکہ احادیث میں اکثر روایت بالمعنی ہے اور لفظوں میں کمی بیشی ہے۔ پس حِيْنَ يُوْلَدُ کے لفظ کے معنی اگر ولادت روحانی نہ کیے جائیں تو ان الفاظ کو زائد کہنا پڑے گا۔ جو کسی راوی کی غلطی سے داخل ہو گئے۔

411- ﴿فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ﴾ تَقَبَّلَ کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 163]

تقبل کے بعد قبول کے لانے میں راغب لکھتے ہیں: حکمت یہ ہے کہ تقبل میں اقتضائے ثواب ہے اور قبول میں اقتضائے رضائے الٰہی۔

﴿اَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا﴾ نَبَتٌ اور نَبَاتٌ اصل میں نامیات یعنی بڑھنے والی چیزوں میں سے وہ ہے جو زمین سے اگتی ہے اور خاص استعمال اس کا ان اشیاء میں ہوتا ہے جن کی ساق یعنی تنا نہ ہو۔ پھر اس کا استعمال ہر بڑھنے والی شے پر ہوتا ہے خواہ وہ سبزی میں سے ہو یا درخت یا حیوان ہو یا انسان۔ (غ) اَنْبَتَ کے بعد مصدر اَنْبَاتًا کی بجائے نَبَاتًا آیا ہے اور یہ اسی کی جگہ ہے۔ گو بعض نے نَبَاتًا کو یہاں حال کہا ہے مگر ابن جریر کہتے ہیں کہ عرب یہ کثرت سے کرتے ہیں کہ مصادر کو اصول افعال پر لاتے ہیں گو لفظ مختلف ہوں۔ مثلاً تَكَلَّمَ فُلَانٌ كَلَامًا کہیں گے تَكَلَّمَ فُلَانٌ تَكْلُّمًا نہیں۔ اس لحاظ سے تَقَبَّلَ کے بعد قَبُوْلٍ اور اَنْبَتَ کے بعد نَبَاتٌ آیا ہے۔ مفردات میں ہے کہ اَنْبَتَ کا لفظ انسانوں پر بولنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ بھی ایک وجہ سے نبات ہی ہیں۔ کیونکہ ان کی ابتدا بھی زمین سے ہی ہوتی ہے۔ گو نبات سے ان میں ایک وصف زائد ہو۔ پس یہاں اَنْبَتَ سے مراد اس کا اِنْمَاءٌ یعنی بڑھانا ہے۔

كَفَّلَ۔ كِفْلٌ یا كَفِيْلٌ وہ حصہ ہے جس میں کفایت ہو اس لیے كَفَالَةٌ بمعنی ضمانت ہے اور تکفیل دوسرے کی کفالت میں دے دینا۔ (غ)

زَكَرِيَّا۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے والد کا نام ہے اور یہ نام قرآن کریم میں زمرۂ انبیاء میں بھی آتا ہے۔ [لوقا: 5:1] میں زکریا کے متعلق ذیل کے الفاظ ہیں:

> ''یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کے زمانہ میں ابیاہ کے فریق میں سے زکریا نام ایک کاہن تھا اور اس کی بیوی ہارون کی اولاد میں سے تھی۔۔۔ اور وہ دونوں خدا کے حضور راستباز اور خداوند کے سارے حکموں اور قانونوں پر بے عیب

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ؕ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ

جب کبھی زکریا اس کے پاس عبادت گاہ میں آتے اس کے پاس رزق پاتے۔ کہا اے مریم! یہ تجھے کہاں سے ملا؟ اس نے کہا یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ بے شک اللہ

چلنے والے تھے۔''

(اناجیل میں ایسے صریح بیانات کے ہوتے جہاں ایک کاہن اور اس کی بی بی خداوند کے سارے حکموں اور قانونوں پر بے عیب چلنے والے بتائے جاتے ہیں اس کے پیروؤں کا یہ دعویٰ کہ شریعت پر کوئی شخص نہیں چل سکتا۔ ایک مضحکہ انگیز حرکت ہے۔)

اناجیل میں زکریا کو صرف کاہن بیان کیا گیا ہے۔ البتہ پرانے عہد نامے میں ایک نبی زکریاہ نام بیان کیا گیا ہے۔ اور اس کی کتاب بھی مجموعہ عہد نامہ قدیم میں موجود۔ پس ممکن ہے کہ جہاں قرآن کریم نے زکریا کو زمرۂ انبیاء میں فرمایا: [الأنعام: 85:6] وہاں اشارہ زکریاہ کی طرف ہی ہو کیونکہ جہاں زکریا کو انبیاء میں سے گنا ہے وہاں ان کے ہاں یحییٰ کے پیدا ہونے کا کوئی ذکر نہیں اور جہاں زکریا کے ہاں یحییٰ کے پیدا ہونے کا ذکر ہے جو تین جگہ آیا ہے یعنی یہاں اور سورۃ مریم میں اور سورۃ الانبیاء میں وہاں زکریا کو نبوت عطا فرمانے کا کوئی ذکر نہیں اور زکریاہ اور زکریا دونوں ناموں میں اس قدر مشابہت ہے کہ عربی میں آ کر ان کا ایک ہی صورت اختیار کر لینا کوئی بعید بات نہیں۔ بلکہ بعض مقامات کے الفاظ قرآنی اسی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ امر کہ مریم قرعہ اندازی سے زکریا کی سپردگی میں آئیں۔ اگر وہ نبی ہوتے تو کاہنوں پر خود ہی ان کا حق فائق ہوتا۔ یا زکریا کا یحییٰ کے متعلق دعا کرتے ہوئے یہ کہنا: ﴿يَّرِثُنِيْ وَ يَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ﴾ [مریم: 6:19] میرا وارث ہو اور آل یعقوب کا وارث ہو۔ ظاہر ہے کہ نبوت کی طرف اشارہ آل یعقوب میں ہے۔ ورنہ يَرِثُنِيْ کافی تھا۔ ایسا ہی سورہ انبیاء میں زکریا اور اس کی بی بی کا اکٹھا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے: ﴿اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَ يَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّ رَهَبًا﴾ [الأنبیآء:90:21] ''وہ بھلائیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے تھے اور ہم کو امید اور خوف رکھتے ہوئے پکارتے تھے۔'' ان قرائن سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ زکریا نبی اور زکریا والد یحییٰ دو الگ الگ شخص ہیں۔

مریمؑ کے متعلق بعض مفسرین کے خیالات:

عجوبہ پسند طبائع نے یہاں بھی کچھ قصے بنا لیے ہیں کہ مریم ایک دن میں اتنا بڑھتی تھی جتنا کوئی دوسرا ایک سال میں بڑھے۔ حالانکہ یہاں صرف نَبَاتًا حَسَنًا عمدہ پرورش کا ذکر ہے۔ زکریا کی سپردگی میں ان کا دیا جانا حصول علم دین کے لیے تھا۔ یہ کہنا کہ پیدا ہوتے ہی اس کی ماں اس کو ہیکل میں لے گئی تھی۔ اسی عجوبہ پسندی کی وجہ سے ہے جو بہت سی تفاسیر میں دیکھی جاتی ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ کفالت کا وقت وہی ہوتا ہے جب بچہ تربیت کے قابل ہوتا ہے۔ مروجہ اناجیل میں مریم کی پیدائش تربیت وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں۔

اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۷﴾ جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔ (412)

412- كُلَّمَا۔ [كُلَّ زَمَانٍ أَوْ كُلَّ وَقْتٍ] جب کبھی۔

اَلْمِحْرَابُ۔ حَرَبَ اس کا مادہ ہے جس کے معنی جنگ ہیں۔ مفردات میں ہے کہ مسجد کے محراب کو محراب اس لیے کہا جاتا ہے کہ [لِأَنَّهُ مَوْضِعُ مُحَارَبَةِ الشَّيْطَانِ وَالْهَوٰى] یعنی وہ شیطان اور خواہشات کے جنگ کا مقام ہے۔ لیکن لسان العرب میں ہے کہ [اَلْمِحْرَابُ صَدْرُ الْبَيْتِ وَاَكْرَمُ مَوْضِعٍ فِيْهِ] یعنی محراب گھر کے صدر اور سب سے معزز مقام کا نام ہے۔ اور زجاج کا قول نقل کیا ہے کہ محراب [اَرْفَعُ بَيْتٍ فِي الدَّارِ] کا نام ہے یعنی گھر میں سب سے اعلیٰ درجہ کے کمرہ کو کہتے ہیں۔ (ل) لیکن یہ بنی اسرائیل کے ذکر میں ہے اور بنی اسرائیل میں محراب مسجد کو کہتے تھے جس میں وہ بیٹھا کرتے تھے۔ (ل) یا جہاں نماز کے لیے جمع ہوا کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محراب وہ خاص جگہ تھی جہاں عبادت کے لیے وہ بیٹھا کرتے تھے اور یہ ان کی مساجد ہی تھیں۔

رِزْقٌ کے اصل معنی راغب کے نزدیک عطاء جاری ہیں خواہ دنیوی ہو یا اخروی، مال ہو یا جاہ یا علم۔ اس لیے رُزِقْتُ عِلْمًا علم دیا جانے پر بولتے ہیں۔ مفسرین نے تو حسب معمول اس کو غیر معمولی رزق قرار دیا۔ حالانکہ یہاں کوئی ایسے لفظ نہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں: [فَاكِهَةُ الصَّيْفِ فِي الشِّتَاءِ وَ فَاكِهَةُ الشِّتَاءِ فِي الصَّيْفِ] یعنی گرمی کے پھل سردیوں میں اور سردی کے پھل گرمیوں میں۔ حالانکہ قرآن شریف میں نہ روٹی کا ذکر ہے نہ پھلوں کا۔ اول تو رزق سے مراد پھل ہی لینا اس پر کوئی دلیل نہیں۔ پھر پھل بھی خلاف موسم اور یہ بھی لکھا ہے کہ زکریا اس پر سات دروازوں پر قفل لگایا کرتے تھے۔ ان قفلوں میں تو معمولی پھلوں کا پہنچنا بھی کافی اعجاز تھا۔ خلاف موسم بتانے کی کوئی ضرورت نہ تھی اور مجاہد سے روایت ہے: [وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا أَيْ عِلْمًا أَوْ قَالَ صُحُفًا فِيْهَا عِلْمٌ]۔ (ث) یعنی رزق سے مراد یہاں علم ہے یا صحیفے جن میں علم تھا۔

﴿مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ عِنْدَ ظرف مکان اور زمان ہے اور اس کے معنی [حُضُوْرُ الشَّيْءِ وَدُنُوُّهُ] یعنی کسی شے کا حضور اور اس کا قرب اور اس پر مِنْ داخل ہوتا ہے جس طرح لَدُنْ پر مِنْ داخل ہوتا ہے۔ یعنی مِنْ عِنْدِنَا۔ مِنْ لَّدُنَّا۔ مفردات میں ہے کہ عِنْدَ میں قرب ہے وہ بعض وقت بلحاظ مکان ہوتا ہے اور بعض وقت بلحاظ اعتقاد جیسے عِنْدِیْ كَذَا یعنی میرے اعتقاد میں یوں ہے اور کبھی مرتبہ کے لحاظ سے جیسے: ﴿بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ میں اور کبھی محض حکم میں جیسے: ﴿عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ﴾ [الزخرف: 85:43] ''اسی کو (موعودہ) گھڑی کا علم ہے۔'' ﴿وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ﴾ [الرعد: 43:13] ''اور وہ جس کے پاس کتاب کا علم ہے۔'' ایسا ہی ﴿فَاُولٰٓئِكَ عِنْدَ اللّٰهِ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ﴾ [النور: 13:24] ''تو اللہ کے نزدیک یہی جھوٹے ہیں۔'' ﴿وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ﴾ [النور: 15:24] ''اور وہ اللہ کے نزدیک بڑی بھاری بات تھی۔'' ان تمام مقامات پر فِیْ حُکْمِہٖ مراد ہے یعنی اللہ کے حکم میں۔ اسی طرح ﴿وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ ۫ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ﴾ [الحجر: 21:15] ''اور کوئی چیز نہیں مگر اس کے خزانے ہمارے ہی پاس ہیں اور ہم اسے ایک مناسب اندازے سے اتارتے رہتے ہیں۔'' اور یہی صورت یہاں ہے ﴿مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ یعنی اللہ کے حکم سے یہ چیزیں پہنچتی ہیں۔ مفسرین کا خیال ہے کہ اس کو ﴿مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ اس لیے

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ وہیں زکریا نے اپنے رب سے دعا کی، کہا میرے رب

کہا گیا ہے کہ بلا واسطہ بشر پہنچتا تھا مگر یہ ضروری نہیں۔ ﴿اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ﴾ جب سب چیزوں کے خزانے اللہ تعالیٰ کے پاس ہی ہیں تو جو کچھ پہنچتا ہے سب ﴿مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ ہی ہے۔ چنانچہ ایک جگہ فرمایا کہ جب ان لوگوں کو کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں ﴿هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ ''یہ اللہ کا احسان ہے'' اور جب کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو کہتے ہیں: هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ یعنی تمہاری بے تدبیری سے ہے۔ اس کے جواب میں فرمایا: ﴿قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ [النسآء: 78:4] بھلائی برائی ہر چیز اللہ کی طرف سے ہی ہے۔ حالانکہ اسی کی تشریح آگے چل کر یوں کی ہے کہ بدنتائج انسان کے اپنے بداعمال سے ہیں۔ اسی طرح فرماتا ہے: ﴿مَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ [آل عمران: 126:3] ''مدد تو اللہ کی طرف سے ہے۔'' حالانکہ نصرت اسباب کے ساتھ ہی آتی ہے۔ اگر مسلمان قتال نہ کرتے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں کی طرح انکار کر دیتے تو یہ نصرت بھی نہ ملتی۔ پس بلا واسطہ ہو یا بالواسطہ ہر چیز ﴿مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ ہی ہے۔

مریمؑ کے پاس رزق کا پہنچنا:

ہم اس بات پر ایمان لاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بلا اسباب بھی کوئی امر مہیا کر دے یا ایسے اسباب سے مہیا کر دے جن کے سمجھنے پر انسان قادر نہیں جیسے: ﴿وَّ یَرْزُقْهُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ﴾ [الطلاق: 3:65] اللہ تعالیٰ متقی کو ایسے ذرائع سے رزق پہنچاتا ہے جہاں سے اس کو گمان بھی نہیں ہوتا اور اگر یہ مریم صدیقہ کی کرامت ہو کہ کسی ظاہری سبب کے بغیر ان کو پہنچ جاتا ہو، تو اس سے بھی ہمیں انکار نہیں۔ لیکن سوال صرف یہ ہے کہ آیا قرآن کریم نے یہاں ایسا فرمایا ہے یا کسی حدیث صحیح میں ایسا آیا ہے کہ مریم کو بے موسم کے پھل سات قفلوں کے اندر پہنچ جایا کرتے تھے۔ اس کا جواب نفی میں ہے۔ نہ اللہ تعالیٰ نے ایسا فرمایا نہ رسول اللہ ﷺ نے؛ اور الفاظ ظاہری سے سوائے اس کے کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ مریم کے پاس کچھ رزق پہنچ جاتا تھا۔ ممکن ہے زائرین پہنچاتے ہوں۔ جیسا کہ دستور ہے کہ جو لوگ خلوت نشینی اختیار کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کسی کے دل میں ڈال کر ان کو پہنچا دیتا ہے اور ممکن ہے یہاں رزق سے مراد جیسا مجاہد نے کہا ہے علم ہو اور اس علم کو ہی مریم نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہا ہو۔ تو اس پر ایک دن جب زکریا نے سوال کیا کہ اے مریم! یہ تم کو کہاں سے پہنچتا ہے؟ تو اس نے وہی خدا پرستوں والا جواب دیا۔ جن کی نظر وسائل سے بلند ہوتی ہے اور وہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی سمجھتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام تو یہاں تک فرماتے ہیں: ﴿وَ الَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَ یَسْقِیْنِ﴾ [الشعرآء: 79:26] ''وہ اللہ ہے جو مجھے کھانا کھلاتا اور پانی پلاتا ہے۔'' حالانکہ اپنے ہاتھ سے کھاتے اور پیتے تھے۔

کہا جائے گا اگر یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی تو اس کا ذکر یہاں کیوں کیا؟ لیکن کیا قرآن کریم معمولی امور کا ذکر نصیحت کے لیے نہیں کرتا؟ **بلکہ سبق تو انسان معمولی امور سے ہی حاصل کر سکتا ہے۔** اگر یہ کوئی غیر معمولی امر تھا تو ہمیں اس سے فائدہ کیا؟۔ یہ کوئی معجزہ تو ہے نہیں کہ مخالفین پر اتمام حجت کے لیے دکھایا گیا ہو۔ نہ کوئی ایسی کرامت ہے جو منکرین کے لیے ظاہر ہوئی ہو۔

لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّیَّةً طَیِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِیْعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۸﴾

اپنی جناب سے مجھے پاکیزہ اولاد عطا فرما، تو دعا سننے والا ہے۔(413)

بلکہ بات صاف ہے مسلمانوں کو سمجھانا مقصود ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے لیے اور اس کے دین کی خدمت کے لیے اپنی زندگی وقف کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے لیے بھی رزق کا کچھ سامان کر دیتا ہے اور کسی نہ کسی ذریعہ سے اس کو رزق پہنچا دیتا ہے۔ بلکہ آخر پر ان الفاظ میں کہ ﴿وَاللّٰهُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ﴾ یہ بھی بتا دیا کہ ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ بے حساب رزق دیتا ہے۔ انہی الفاظ میں مسلمانوں کو بھی مخاطب فرمایا ہے۔

ایک اور بات قابل توجہ یہ ہے کہ زکریا ہمیشہ ہی جب اس کے پاس جاتے تو رزق پاتے۔ اگر یہ کوئی غیر معمولی رزق ہوتا تو یہ سوال پہلے دن ہی ان کو کرنا چاہیے تھا کہ اے مریم یہ تم کو کہاں سے ملا؟ حالانکہ عبارت قرآنی بتاتی ہے کہ وہ جب کبھی مریم کے پاس جاتے ایسا پاتے اور سوال نہ کرتے۔ پھر انہوں نے کسی ایک موقعہ پر ایسا سوال کیا ہے۔ جب انہوں نے مریم میں خدا پرستی کے آثار دیکھے ہیں۔ اگر یہ مراد ہوتی کہ پہلی مرتبہ ہی دیکھ کر سوال کیا تھا تو عبارت یوں ہونی چاہیے تھی لَّمَا دَخَلَ عَلَیْهَا۔

413- هُنَالِكَ۔ هُنَا ظرف مکان ہے۔ ل بُعد کے لیے اور کاف خطاب کے لیے۔ یعنی جہاں وہ (مریم کے پاس محراب میں) تھے وہیں یہ دعا کی۔

نیک اولاد کی خواہش:

معلوم ہوتا ہے حضرت زکریا علیہ السلام بنی اسرائیل کی حالت کو دیکھ کر یہ سمجھے ہوئے تھے کہ اب یہ قوم اس قابل نہیں رہی کہ اس کے اندر وہ پاک لوگ پیدا ہوں جو اس قوم کو راہ راست پر رکھ سکیں اور اسی لیے انہوں نے کبھی اولاد کے لیے دعا بھی نہیں کی تھی۔ چنانچہ دوسری جگہ ان کے یہ الفاظ مذکور ہیں۔ ﴿وَ اِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ﴾ [مریم: 5:19] ''اور میں اپنے بھائی بندوں سے اپنے پیچھے ڈرتا ہوں۔'' ان کا خوف اسی وجہ سے تھا کہ ان لوگوں کی عملی حالتیں ان کو اچھی نظر نہ آتی تھیں۔ ورنہ انبیاء اور اولیاء کو مال و جائداد کے ورثوں کا فکر نہیں ہوا کرتا۔ پس جب مریم کے اندر انہوں نے ایسی نیکی اور سعادت دیکھی تو ان کی طبیعت میں بھی ایک جوش پیدا ہوا کہ اللہ تعالیٰ انہیں بھی ایسی نیک اولاد عطا کرے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نیکوں کے دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے تو نیک اولاد کے لیے ہی پیدا ہوتی ہے۔ باوجود بوڑھا ہو جانے کے زکریا علیہ السلام نے اولاد کے لیے دعا نہ کی۔ کی تو یہی کی اے خدا نیک اولاد دے۔

یہ کہنا کہ دعا کی خواہش ان کے دل میں اس لیے پیدا ہوئی تھی کہ انہوں نے سمجھ لیا کہ خدا اس بات پر قادر ہے، درست نہیں۔ اس لیے کہ وہ پہلے بھی مقبولین بارگاہ الٰہی میں سے تھے۔ ہر ایک راستباز انسان جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دعائیں قبول کیا کرتا ہے۔ اور حضرت زکریا علیہ السلام کا تو اپنا قول دوسری جگہ قرآن میں منقول ہے: ﴿وَّ لَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآىِٕكَ رَبِّ شَقِیًّا﴾ [مریم: 4:19] ''اور میرے رب تجھ سے دعا کر کے میں محروم نہیں رہا۔'' یعنی جو دعا کی وہ قبول ہوئی۔ پھر عورت کے بانجھ ہونے کا

فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ هُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى

پھر فرشتوں نے اسے پکارا جبکہ وہ عبادت گاہ میں کھڑا نماز پڑھ رہا تھا کہ اللہ تجھے یحییٰ کی خوش خبری دیتا ہے(414)

یقین تو بے اولادی سے ہوا پہلے وہ دعا کیوں نہ کرتے تھے۔ اصل بات یہی ہے کہ وہ بنی اسرائیل کی حالت کو دیکھ کر یہ خیال کرتے تھے کہ یہ قوم اب اس قابل نہیں رہی کہ ان میں نیک لوگ پیدا ہوں۔ مریم کی نیکی کو دیکھ کر ان کی طبیعت میں ایک جوش پیدا ہوا اور ان کی روح بے اختیار بارگاہ الٰہی میں پکار اٹھی: ﴿فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۝ يَّرِثُنِيْ وَ يَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ ۖ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ۝﴾[مریم: 19:5-6] ''اے خدا مجھے بھی اپنی جناب سے ایک وارث عطا فرما جو میرے علوم اور نیکیوں کا وارث ہو اور یعقوب کے سچے پیروؤں کے علوم اور نیکیوں کا وارث ہو اور اے میرے رب اسے اپنی بارگاہ میں پسندیدہ بنائیو۔'' نیکوں کو دیکھ کر نیکوں کے دل میں نیکی کی تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ اسی کی طرف مسلمانوں کو توجہ دلائی۔

414- **ملائکہ کا کلام:** ﴿فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ﴾ بعض کے نزدیک یہاں ملائکہ سے مراد جبریل علیہ السلام ہے اور بعض کے نزدیک جماعت ملائکہ۔ اللہ تعالیٰ کا کلام اور الہام بھی ملائکہ کی وساطت سے ہی نازل ہوتا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا: ﴿يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ اِسْمُهٗ يَحْيٰى﴾[مریم: 19:7] ''اے زکریا! ہم تجھے ایک لڑکے کی خوشخبری دیتے ہیں اس کا نام یحییٰ ہے۔'' پس یہ وحی تھی جو زکریا کو ہوئی۔ خواہ کوئی سے ملائکہ اس کے لانے والے ہوں اور دوسری جگہ قرآن کریم نے حصر کر کے بتا دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام انسان سے تین ہی طرح پر ہوتا ہے۔ دل میں بات ڈال کر رؤیا، کشف، الہام سے، بذریعہ جبریل علیہ السلام جو انبیاء سے مخصوص ہے۔ عام ملائکہ کا کلام کشف یا الہام کے رنگ میں ہوگا۔

يَحْيٰى۔ مفردات میں ہے: [سَمَّاهُ بِذٰلِكَ مِنْ حَيْثُ إِنَّهُ لَمْ تُمِتْهُ الذُّنُوْبُ كَمَا أَمَاتَتْ كَثِيْرًا مِنْ وُلْدِ آدَمَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ] (مفردات الراغب: ص 139-140) یعنی اس کا نام یحییٰ رکھا اس بات کی طرف اشارہ کرنے کے لیے کہ گناہ سے اس پر موت نہیں آئے گی۔ جیسا کہ بہت سے آدم کے بیٹوں پر آئی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یحییٰ نام بتانے میں اشارہ یہ تھا کہ جیسے کہ بنی اسرائیل کی عامہ حالت اس وقت تھی کہ وہ فسق و فجور میں مبتلا تھے اور اعلیٰ درجہ کے نیک اور راستباز انسان ان میں عموماً نہ تھے۔ یہ لڑکا ایسا نہ ہوگا بلکہ وہ ایک روحانی زندگی کا وارث ہوگا اور گناہ کی موت اس پر نہ آئے گی۔ بعض نے کہا ہے کہ یحییٰ نام اس طرف اشارہ کے لیے بتایا کہ اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو ایمان سے زندہ کرے گا یا اس لیے کہ وہ علم و حکمت سے زندہ ہوگا۔ (ل) یا اس لیے کہ اس کے ذریعہ سے لوگ ہدایت کے ساتھ زندہ کیے جائیں گے۔ (ر) اناجیل میں یہ نام یوحنا آتا ہے اور **یوحنا بپتسمہ دینے والے** کے نام سے یہ مشہور ہیں۔ انہوں نے ہی حضرت مسیح کو بپتسمہ دیا تھا۔ ان کا اور حضرت مسیح کا زمانہ ایک ہی تھا۔ ان کا ظہور کچھ حضرت مسیح سے پہلے ہوا۔ یہ عجیب بات ہے کہ سلسلہ موسوی کی ابتدا بھی دو نبیوں موسیٰ اور ہارون سے ہی ہوتی ہے اور اس کا خاتمہ بھی دو نبیوں یحییٰ اور عیسیٰ پر ہی ہوتا ہے۔ جس طرح حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کی اصلاح کا سارا کام اکیلے نہ کر سکتے تھے اسی طرح حضرت مسیح بھی اکیلے اس قابل نہ تھے۔ حضرت موسیٰ اور مسیح

مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ سَيِّدًا وَّ حَصُوْرًا وَّ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۳۹﴾

جو اللہ کے ایک کلام کو سچا کرنے والا اور سردار اور بدیوں سے رکنے والا اور نبی نیکوکاروں میں سے (ہوگا)۔(415)

دونوں کا کام بڑا تھا اور یہی وجہ ہوئی کہ ان کے ساتھ دوسرے نبی کی بعثت کی ضرورت پیش آئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کام کا کچھ حصہ حضرت ہارون علیہ السلام نے کیا۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے حضرت مسیح کے لیے لوگوں کو تیار کیا۔

حضرت یحییٰ اور عیسیٰ علیہما السلام دونوں کے لیے کتب سابقہ میں کچھ پیشگوئیاں تھیں۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے متعلق پیشگوئی ان الفاظ میں ملاکی نبی کی کتاب میں تھی: ''دیکھو خداوند کے بزرگ اور ہولناک دن کے آنے سے پیشتر میں ایلیاہ نبی کو تمہارے پاس بھیجوں گا۔'' [ملاکی: 5:4]۔ بظاہر اس پیشگوئی میں الیاس کے آنے کا ذکر ہے اور **الیاس کے متعلق یہودیوں کا یہ خیال تھا کہ وہ زندہ آسمان پر چلا گیا ہوا ہے** اور یہ صرف خیال ہی نہ تھا بلکہ ان کی کتاب میں یہ لفظ بھی تھے: ''ایلیاہ بگولے میں ہو کے آسمان پر جاتا رہا۔'' [2سلاطین: 11:1]

الیاس کی دوبارہ آمد کی پیشگوئی کیوں کر پوری ہوئی:

اب جب حضرت مسیح نے دعویٰ کیا تو یہودیوں نے اس پر یہ اعتراض کیا کہ ہماری پیشگوئیوں میں لکھا ہے کہ مسیح سے پیشتر ضروری ہے کہ الیاس آئے۔ چنانچہ شاگردوں نے یہ اعتراض حضرت مسیح کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے یہ جواب دیا:

''ایلیاہ تو آچکا اور انہوں نے اس کو نہیں پہچانا بلکہ جو چاہا اس کے ساتھ کیا۔ اسی طرح ابن آدم بھی ان کے ہاتھ سے دکھ اُٹھائے گا۔'' اس کے بعد لکھا ہے: ''تب شاگرد سمجھ گئے کہ اس نے ہم سے یوحنا بپتسمہ دینے والی کی بابت کہا ہے۔'' [متی: 12,13:17]

اور دوسری جگہ اس کی وجہ یوں دی ہے: ''اور وہ ایلیاہ کی روح اور قوت میں اس کے آگے آگے چلے گا۔''

گویا یحییٰ علیہ السلام کی آمد ہی الیاس علیہ السلام کی دوبارہ آمد تھی اس لیے کہ وہ اس کا مثیل ہو کر آیا۔ مگر یہودی اس تشریح سے مطمئن نہ ہوئے۔

415- كَلِمَةٍ۔ یہ لفظ قرآن کریم میں وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی کلام کے ہم معنی۔ جیسے عیسائیوں کے حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا قرار دینے پر فرمایا: ﴿كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ﴾ [الکھف: 5:18] ''بڑی بات ہے جو ان کے مونہوں سے نکلتی ہے۔'' اور ایک جگہ کافر کی طرف اس قول کو منسوب کر کے ﴿رَبِّ ارْجِعُوْنِ ۙ﴿۹۹﴾ لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ﴾ [المؤمنون: 23:99-100] ''میرے رب مجھے لوٹاؤ۔ تاکہ میں اس میں جسے چھوڑ آیا ہوں اچھے کام کروں۔'' فرمایا: ﴿اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا﴾ [المؤمنون: 23:100] ''وہ ایک بات ہے جسے وہ کہے گا۔''

یہ تو کلمہ کے عام معنی ہیں۔ یہاں کس کلمہ کی تصدیق ہے؟ مفردات میں تین قول دیئے ہیں۔ كَلِمَةُ التَّوْحِيْدِ توحید کی بات،

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّ قَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَ امْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ؕ قَالَ

اس نے کہا میرے رب میرے بیٹا کیوں کر ہوگا؟ اور مجھ پر بڑھاپا آچکا ہے اور میری عورت بانجھ ہے۔ کہا

كِتَابُ اللّٰهِ یعنی اللہ کی کتاب، عِيْسٰى اور عیسیٰ کا نام كَلِمَةٌ اس لیے رکھا گیا کہ دوسری جگہ ﴿وَكَلِمَتُهٗۤ اَلْقٰىهَاۤ اِلٰى مَرْيَمَ﴾ [النساء: 171:4] ''اور اس کی پیشگوئی ہے جو اس نے مریم کی طرف القا کی۔'' قرآن شریف میں آتا ہے۔ میرے نزدیک یہاں کلمہ عام معنی میں ہے یعنی اللہ کے ایک کلام کو سچا کر دکھائے گا اور اس کلمہ کے لفظ میں اس پیشگوئی کی طرف اشارہ ہے جو یحییٰ کے متعلق بائبل میں پائی جاتی ہے اور جو پچھلے نوٹ میں مذکور ہو چکی ہے۔

سَيِّدًا۔ سَيِّدٌ سَوْدٌ سے ہے اور سواد سیاہی کو کہتے ہیں اور بڑی جماعت کو بھی اسی لحاظ سے سواد کہتے ہیں اور سید وہ ہے جو سواد یا جماعت کثیر کا متولی ہو۔ (غ) یحییٰ کو سید اس لیے کہا کہ وہ بھی ایک جماعت کا پیشوا بننے والا تھا۔

حَصُوْرًا۔ حَصَرَ سے ہے جس کے معنی تَضْيِيْقٌ یعنی روکنے کے ہیں۔ مفردات میں ہے کہ حُصُوْرٌ وہ ہے جو عورتوں کے پاس نہیں جاتا۔ یا نامردی کی وجہ سے یا پاکدامنی کی وجہ سے اور شہوت کے دور کرنے میں کوشش کی وجہ سے۔ اور پھر لکھا ہے کہ اس آیت میں یہ دوسری قسم کا ہی حصور مراد ہے یعنی پاکدامنی کی وجہ سے عورتوں کے پاس نہ جانے والا۔ کیونکہ اس سے ایک شخص تعریف کا مستحق ہو سکتا ہے اور یہی بات صحیح ہے۔ ورنہ نامرد تو دنیا میں بہتیرے ہوئے اور ہوں گے۔ یہ کسی تعریف کے موقع پر نہیں بولا جا سکتا اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک روایت میں بھی یہ لفظ آئے ہیں: [اَلَّذِيْ لَا يَأْتِي النِّسَآءُ مَعَ الْقُدْرَةِ عَلٰى ذٰلِكَ]۔ (ر) اور روح المعانی میں ہی یہ بھی ہے کہ جائز ہے کہ حصور سے مراد یہ ہو کہ جو شخص نفس کے روکنے کو کمال تک پہنچا دے اور باوجود قدرت کے شہوات سے اسے روک رکھے۔

یحییٰ اور عیسیٰؑ:

عیسائی لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ کمال بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے شادی نہیں کی۔ قرآن کریم اس کے بالمقابل یحییٰ کو پیش کرتا ہے کہ اگر یہ کوئی خوبی ہے تو پھر حضرت یحییٰ علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کم نہیں۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی زندگی دنیا کی ان معمولی آسائشوں سے بھی خالی تھی جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو میسر تھیں۔ چنانچہ انجیل میں ان کا یہ نقشہ کھینچا ہے کہ وہ مے نہ پیتے تھے اور کھاؤ پیو نہ تھے۔ اور حضرت مسیح کو لوگ کہا کرتے تھے کہ یہ کھاؤ پیو ہے اور مے پیتا ہے:

''کیونکہ یوحنا نہ کھاتا آیا نہ پیتا اور وہ کہتے ہیں کہ اس میں بدروح ہے۔ ابن آدم کھاتا پیتا آیا اور وہ کہتے ہیں دیکھو کھاؤ اور شرابی آدمی۔'' [متی: 11-19]

قرآن کریم تو یحییٰ علیہ السلام کو انبیاء میں سے ایک نبی بیان فرماتا ہے۔ مگر حضرت مسیح نے یوحنا کو نبیوں سے بھی بڑھ کر کہا ہے کہیں مسیح کے متعلق ایسا فقرہ ہوتا تو اس کی بنا پر اسے خدا بنا لیا جاتا۔ مگر یوحنا کو کچھ بھی نہیں سمجھا جاتا۔ حالانکہ مسیح صاف کہتا ہے:

''تو پھر کیوں گئے تھے؟ ایک نبی کے دیکھنے کو؟ ہاں میں تم سے کہتا ہوں بلکہ نبی سے بڑے کو۔۔۔ میں تم سے سچ کہتا

كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ﴿۴۰﴾ فرمایا اسی طرح ہوگا اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔(416)

ہوں کہ جو عورت سے پیدا ہوئے ہیں۔ان میں یوحنا بپتسمہ دینے والے سے کوئی بڑا نہیں ہوا۔''[متی: 11:9-11]

سوال یہ ہے کہ کیا مسیح عورت سے پیدا نہیں ہوئے؟ پھر اس صریح بیان کے مطابق بڑا کون ہوا؟ یحییٰ یا عیسیٰ؟ عیسائی خود ہی اس کا جواب دیں۔اور جہاں فرشتہ زکریا کو یحییٰ کی بشارت دیتا ہے وہاں ان الفاظ میں بشارت ہے:

''اور بہت سے لوگ اس کی پیدائش کے سبب خوش ہوں گے۔کیونکہ وہ خداوند کے حضور میں بزرگ ہوگا اور ہرگز نہ مے نہ کوئی اور شراب پیے گا اور اپنی ماں کے پیٹ سے ہی روح القدس سے بھر جائے گا۔''[لوقا: 1:15-14]

اور احادیث میں بھی آتا ہے: [مَا مِنْ عَبْدٍ يَلْقَى اللهَ إِلَّا ذَا ذَنْبٍ إِلَّا يَحْيَى بْنِ زَكَرِيَّا](شعب الإيمان، باب السادس والثلاثون من شعب الإيمان و هو باب في تحريم النفوس و الجنايات: 4947) کوئی بندہ نہیں جو خدا کو ملے مگر وہ قصوروار ہوگا سوائے یحییٰ بن زکریا کے۔یہ تمام باتیں اگر ان کو ظاہر پر حمل کیا جائے تو حضرت یحییٰ علیہ السلام کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بڑی فضیلت ثابت کرتی ہیں۔عیسائی صاحبان اس پر غور کریں۔

416- غُلَامٌ۔غلام اس کو کہتے ہیں جس کی مونچھیں نکل رہی ہوں۔(غ) یعنی نوجوان۔یا پیدا ہونے سے لے کر جوانی تک غلام کہلاتا ہے اور کہل کو بھی غلام کہہ دیتے ہیں۔(ت) قرآن کریم میں اکثر لڑکے کی بشارت غلام کے لفظ سے دی گئی ہے جس میں شاید یہ بھی ظاہر کرنا مقصود ہے کہ موعود لڑکا جوانی کی عمر کو پہنچے گا۔اور یہاں یعنی حضرت زکریا علیہ السلام کے سوال میں شاید یہ بھی اشارہ ہو کہ وہ لڑکا جس کے اب پیدا ہونے کی بشارت دی جاتی ہے وہ کب نوجوان ہوگا۔

الْكِبَرُ۔ كِبَرٌ یا بڑائی بعض وقت بلحاظ جسامت کے ہوتی ہے اور بعض وقت بلحاظ زمانہ کے اور بعض وقت بلحاظ منزلت اور رفعت کے۔(غ) یہاں کبر بلحاظ زمانہ کے مراد ہے یعنی مُسِنٌّ ہونا یا بڑھاپا۔

عَاقِرٌ۔عَقَرَ کے اصل معنی کسی چیز کا اصل ہیں یعنی اس کی جڑ اور اس سے [عَقَرْتُ النَّخْلَ] کے معنی آتے ہیں: [قَطَعْتُهُ مِنْ أَصْلِهِ]۔(غ) یعنی میں نے کھجور کو جڑ سے کاٹ دیا۔اس طرح عَقَرَ کے معنی ذبح کر دینا یا کاٹ دینا ہو گئے ہیں۔چنانچہ [عَقَرْتُ الْبَعِيْرَ] کے معنی ہیں نَحَرْتُهُ اسے ذبح کر دیا انہی معنوں میں آتا ہے ﴿فَعَقَرُوْهَا﴾ [الشمس: 14:91] ''پھر اس (اونٹنی) کو مار ڈالا۔'' ﴿فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ﴾[القمر: 29:54] ''سو اس نے ہاتھ بڑھایا اور (اسے) مار دیا۔'' اور اِمْرَأَةٌ عَاقِرٌ اس عورت کو کہتے ہیں جو بچہ نہیں جنتی۔[كَأَنَّهَا تَعْقِرُ مَاءَ الْفَحْلِ] گویا وہ نر کے پانی کو کاٹ دیتی ہے یا ضائع کر دیتی ہے۔(غ)

﴿كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ﴾ کی ترکیب یوں ہے۔اَلْاَمْرُ كَذٰلِكَ یعنی ایسا ہی ہونا ہے ﴿كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ﴾ اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔پس یہ دو الگ الگ جملے ہیں پہلے میں مبتدا محذوف ہے۔

یہ سوال اللہ تعالیٰ کی قدرت کے استعظام پر اور ایک ایسے بڑے نشان کے ظاہر ہونے پر ہے جو انسان بطور تعجب کرتا ہے۔کیونکہ

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ۭ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ۭ

اس نے کہا میرے رب میرے لیے کوئی نشان مقرر کردے۔ فرمایا تیرے لیے نشان یہ ہے کہ تین دن سوائے اشارہ کے لوگوں سے بات نہ کرے،(417)

ظاہر حالات اس کے مخالف ہیں۔ اس میں کسی قسم کی بے ادبی خیال کرنا درست نہیں۔ اس لیے کہ ایسا ہی سوال حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیٹے کی بشارت پر کیا ہے۔ ﴿قَالَ اَبَشَّرْتُمُوْنِيْ عَلٰٓي اَنْ مَّسَّنِيَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ﴾ [الحجر: 54:15] ''اس نے کہا کیا تم مجھے خوش خبری دیتے ہو حالانکہ مجھے بڑھاپے نے آلیا ہے۔ تو تم کاہے کی خوش خبری دیتے ہو۔''

417- ﴿ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ﴾ سورہ مریم میں اسی تذکرہ میں فرمایا ﴿ثَلٰثَ لَيَالٍ﴾ یعنی تین راتیں۔ اصل بات یہ ہے کہ بعض وقت ایک کا ذکر کرکے دونوں مراد لے لیتے ہیں۔ جیسے: ﴿سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ﴾ [النحل: 81:16] ''کپڑے جو تمہیں گرمی سے بچاتے ہیں۔'' میں اصل مراد ہے [اَلْحَرُّ وَالْبَرْدُ]۔ یعنی گرمی اور سردی سے بچاتے ہیں۔ یا مشرق کہہ کر مراد مشرق و مغرب لے لیتے ہیں۔ اسی طرح اَیَّامٌ میں لَیَالِیْ بھی شامل ہیں اور لَیَالٍ میں اَیَّامٌ شامل ہیں۔ اور ایک جگہ اَیَّامٌ اور ایک جگہ لَیَالٍ کہہ کر اس کو واضح کردیا۔

رَمْزًا۔ رَمْزٌ کے معنی ہیں ہونٹوں سے اشارہ کرنا اور آواز مخفی اور آنکھوں سے اشارہ۔ (غ) رَمْزٌ کے اصلی معنی تحرک یعنی ہلانا ہیں اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے رَمْزًا کے معنی [اَلْاِشَارَةُ بِالْيَدِ وَالْوَحْيُ بِالرَّأْسِ] (ر) مروی ہیں یعنی ہاتھ سے اشارہ اور سر سے اشارہ۔

اَلْعَشِيُّ۔ عَشِيٌّ اس وقت کا نام ہے جو آفتاب کے ڈھلنے سے لے کر صبح تک ہو۔ (غ) چنانچہ قرآن کریم میں آتا ہے: ﴿اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰىهَا﴾ [النازعات: 46:79] ''صرف ایک شام یا صبح ہی۔'' اور عشاء صلوٰۃ مغرب سے لے کر عَتَمَةٌ تک بولا جاتا ہے یعنی تاریکی کے وقت تک ﴿وَجَاۗءُوْٓ اَبَاهُمْ عِشَاۗءً يَّبْكُوْنَ﴾ [یوسف: 16:12] ''اور رات کو اپنے باپ کے پاس روتے ہوئے آئے۔''

اِبْكَارٌ یعنی بُكْرَةٌ دن کے پہلے حصہ کو کہتے ہیں (غ) اور اِبْكَارٌ اسی معنی میں مصدر ہے۔

زکریاؑ کی خاموشی اضطراری تھی یا اختیاری:

زکریا علیہ السلام کا نشان مانگنا اس بات پر دلیل نہیں کہ آپ کو وعدہ الٰہی پر ایمان نہ تھا۔ حسن کہتے ہیں: [لِيَتَلَقّٰى تِلْكَ النِّعْمَةَ بِالشُّكْرِ]۔ (م) تاکہ اس نعمت پر شکر کرے۔ یہاں لوگوں نے بعض لغو قصے بڑھا دیئے ہیں کہ شیطان نے زکریا علیہ السلام کو کہہ دیا تھا کہ تمہیں فرشتے کی آواز نہیں آئی بلکہ یہ شیطان کی آواز تھی اور کہ اسی لیے زکریا علیہ السلام نے کہا تھا ﴿اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ﴾ اور اسی لیے نشان مانگا تھا۔ اس بات کی طرف تو مفسرین گئے ہیں کہ حضرت زکریا علیہ السلام کا نہ بولنا کسی آفت کی وجہ سے نہ تھا۔ کیونکہ سورہ

وَ اذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّ سَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَ الْاِبْكَارِ ﴿۴۱﴾ ع 4 11 12

اور اپنے رب کو بہت یاد کر اور شام اور صبح تسبیح کر۔

وَ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَ طَهَّرَكِ وَ اصْطَفٰىكِ عَلٰى

اور جب فرشتوں نے کہا اے مریم! اللہ نے تجھے برگزیدہ کیا اور تجھے پاک بنایا ہے(418) اور قوموں کی عورتوں

مریم میں صاف لفظ سَوِیًّا بڑھا دیا ہے یعنی حالت صحت میں ہونے کے باوجود کلام نہ کرو۔ مگر اکثر کا خیال یہی ہے کہ زکریا کا نہ بولنا بطور اضطرار تھا۔ لیکن ابو مسلم کہتے ہیں کہ یہ بطور اختیار تھا اور عطاء کہتے ہیں کہ یہ روزہ رکھنے کی طرف اشارہ تھا۔ کیونکہ ان میں دستور تھا کہ روزہ رکھتے تھے تو کلام نہ کرتے تھے۔ (ر) یہ توجیہ بہت لطیف ہے۔ ایک تو اس پر ﴿اِنِّیْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا﴾ [مریم: 26:19] شاہد ہے یعنی مریم کہتی ہیں میں نے رحمن کے لیے روزہ نذر مانا ہے۔ اس لیے آج میں کسی انسان سے گفتگو نہ کروں گی۔ کیونکہ جہاں نہ بولنے کا حکم ہے وہیں یہ بھی حکم ہے کہ اپنے رب کو بہت زیادہ یاد کرو اور صبح اور شام تسبیح کرو۔ اگر حضرت زکریا علیہ السلام بولنے پر قادر نہ تھے تو تسبیح کا حکم ٹھیک نہیں رہتا۔ یہ کہنا کہ اختیاری طور پر نہ بولنا نشان نہیں لفظ نشان کے معنی کی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ حضرت زکریا علیہ السلام نے یہی عرض کیا تھا کہ ﴿اجْعَلْ لِّیْٓ اٰيَةً﴾ میرے لیے کوئی نشان مقرر کر دو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہارے لیے یہ نشان مقرر کرتے ہیں کہ تین دن روزہ رکھو اور لوگوں سے بات چیت نہ کرو۔

لوقا کا قصہ:

انجیل لوقا میں جو قصہ بیان کیا گیا ہے وہ قابل قبول نہیں۔ وہاں لکھا ہے کہ فرشتہ نے زکریا علیہ السلام کو یوں کہا:

''اور دیکھ جس دن تک یہ باتیں واقع نہ ہولیں تو چپکا رہے گا اور بول نہ سکے گا اس لیے کہ تو نے میری باتوں کا جو اپنے وقت پر پوری ہوں گی یقین نہ کیا۔'' اور آگے لکھا ہے کہ جب زکریا باہر نکلا تو وہ لوگوں سے: ''اشارے کرتا تھا اور گونگا ہی رہا۔'' [لوقا: 1:20-22]

حالانکہ زکریا علیہ السلام نے جو کچھ کہا وہ اس سے بڑھ کر نہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایسے ہی حالات میں کہا۔ اور یہ مفسرین بائبل کو خود اعتراف ہے۔ پھر ایک ہی سوال پر ایک جگہ کوئی بات خلاف یقین نہیں اور دوسری جگہ یہ کہنا کہ یقین نہ کیا صحیح نہیں۔

418- ﴿قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ﴾ [دیکھو نمبر: 414] ﴿فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ﴾ پر۔ دونوں کا منشا ایک ہی ہے۔ یہاں پر یہ بحث ہوئی ہے کہ آیا حضرت مریم علیہا السلام نبیہ تھیں یا نہیں۔ بعض لوگوں نے کہا کہ وہ نبیہ تھیں۔ بعض نے انکار کیا۔ قائلین اثبات نے اس بات سے حضرت مریم کی نبوت کا استدلال کیا ہے کہ ملائکہ نے ان سے کلام کیا اور لقانی نے کہا ہے کہ ملائکہ کا کلام کرنا ایسے لوگوں سے ثابت ہے جو بالاجماع نبی نہیں۔ چنانچہ ایک روایت میں آتا ہے کہ ایک شخص اپنے ایک بھائی کی زیارت کے لیے محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے نکلا تو فرشتوں نے اسے کہا کہ اللہ تعالیٰ تم سے ایسی محبت کرتا ہے جیسی تم اپنے بھائی سے محبت کرتے

ہو۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں: [مَنْ تَوَهَّمَ أَنَّ النُّبُوَّةَ مُجَرَّدُ الْوَحْيِ وَمُكَالَمَةُ الْمَلِكِ فَقَدْ حَادَ عَنِ الصَّوَابِ]۔ (روح المعانی: جلد3، صفحہ 154) (ر)

محض مکالمہ نبوت نہیں:

یعنی جو شخص یہ خیال کرتا ہے کہ مجرد وحی اور مکالمہ کا نام نبوت ہے وہ صواب سے پھر گیا۔ اس کے ساتھ اختلاف بھی لوگوں نے کیا ہے۔ غور کیا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ **غیر انبیاء سے مکالمہ الٰہی ایک امر مسلم ہے** اور حدیث صحیح [رِجَالٌ يُكَلَّمُونَ مِنْ غَيْرِ أَنْ يَكُونُوا أَنْبِيَاءَ] (صحيح البخاری، كتاب فضائل الصحابة، باب مَنَاقِبُ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ أَبِي حَفْصٍ الْقُرَشِيِّ الْعَدَوِيِّ رضی الله عنه: 3689) (یعنی ایسے لوگوں کا وجود جن سے کلام الٰہی ہوتا ہے حالانکہ وہ نبی نہیں) اس پر ایسی کھلی دلیل ہے کہ جس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ پھر ایک مریم سے ہی کلام الٰہی از روئے قرآن ثابت نہیں بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو بھی وحی کا ہونا ثابت ہے۔ ﴿وَ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى﴾ [القصص: 7:28] ''اور موسیٰ کی ماں کو ہم نے وحی کی۔'' پھر ﴿اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ﴾ [المآئدة: 111:5] ''جب میں نے حواریوں کی طرف وحی کی۔'' بھی موجود ہے یعنی حواریوں کی طرف وحی کی۔ اب بہرحال حواریوں کی نفی نبوت پر حدیث شاہد ہے کیونکہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: [لَمْ يَكُنْ بَيْنِيْ وَبَيْنَهُ نَبِيٌّ] (مسند أحمد: جلد15، صفحہ 153) یعنی میرے اور عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان کوئی نبی نہیں ہوا۔ پس **صرف وحی پانا نبوت نہیں**۔ ہاں لفظ نبی کے لغوی معنی چونکہ یہ ہیں کہ وہ خدا سے خبر پا کر پہنچاتا ہے گو وہ خبر کسی ہدایت دینی سے تعلق نہ رکھتی ہو۔ بلکہ محض ایک ذاتی امر ہو یا ایک پیشگوئی ہو اس لیے لغوی معنی کے لحاظ سے بلاشبہ ہر اس شخص پر جس سے اللہ تعالیٰ نے کلام کیا لفظ نبی کا صادق آ سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ بنی اسرائیل میں صرف خواب بینوں کو بھی نبی کہہ دیتے تھے۔ مگر چونکہ اصطلاح شریعت میں لفظ نبی انہی لوگوں پر صادق آتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت دینی لے کر آتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اور بندوں کے درمیان سفیر ہوتے ہیں جیسا کہ راغب نے لکھا ہے۔ [نوٹ نمبر: 91] اس لیے جب محض مکالمہ مخاطبہ والے پر لفظ نبی بولا جائے گا تو صرف مجازی معنی میں بولا جائے گا۔ پس جن لوگوں نے حَوَّا اور اٰسِيَة اور اُمِّ مُوْسٰى اور سَارَة اور هَاجِرَة اور مَرْيَمْ کو نبیہ کہا ہے۔ (ر) وہ محض اس لغوی یا مجازی معنی کی رو سے ہے اور اسی لیے انہوں نے لفظ رسول ان پر نہیں بولا جس میں یہ بتانا مقصود ہے کہ گو اللہ تعالیٰ ان سے کلام کرتا تھا مگر وہ کلام کسی دینی ہدایت کے متعلق نہ تھا۔ اور جن معنوں میں مریم نبیہ تھیں ان معنوں میں اس امت کے برگزیدہ لوگ بھی نبی ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ان سے بھی ہمکلام ہوتا ہے۔ اور سورہ تحریم میں صاف طور پر اس امت کے برگزیدہ لوگوں کی مریم بنت عمران سے مثال دی ہے۔

طَهَّرَكِ۔ طَهَارَةٌ کے معنی دوسری جگہ بیان ہو چکے ہیں۔ طَهَارَةٌ دو قسم پر ہے۔ **طہارت جسمانی اور طہارۃ نفس**۔ اور گو بعض جگہ دونوں معنوں پر بھی یہ لفظ بولا گیا ہے ﴿وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ﴾ [البقرة: 222:2] ''اور پاکیزگی اختیار کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔'' ﴿يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا﴾ [التوبة: 108:9] ''چاہتے ہیں کہ پاک رہیں۔'' مگر یہاں مقصود بالذات طہارت نفس ہی ہے۔ ایمان کی وجہ سے کفر سے پاک کیا اور طاعت کے ساتھ نافرمانی سے پاک کیا۔ (ر) یا جیسا کہ کہا گیا ہے اخلاق

نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۲﴾ میں سے تجھے چن لیا ہے۔ (419)

ذمیمہ سے پاک کیا۔

419- **عالمین پر فضیلت سے مراد:** ﴿عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ﴾ بنی اسرائیل کے ذکر میں فرمایا تھا: ﴿وَ اَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾ [البقرة: 2:47] ''اور یہ کہ میں نے تمہیں قوموں پر فضیلت دی۔'' ایسے موقعوں پر مراد ہمیشہ [عَالِمِيْ زَمَانِهِمْ] یعنی اس زمانہ کے لوگ ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک حدیث مرسل میں یہ تشریح بھی آئی ہے: [مَرْيَمُ خَيْرُ نِسَآءِ عَالَمِهَا] (روح المعانی: جلد3، صفحہ 155) (ر) مریم اپنے زمانہ کے لوگوں میں سب سے بہتر تھیں۔

عورتوں میں فضیلت: ہاں احادیث اس بارہ میں مختلف طور پر آئی ہیں اور ان میں سے جو ایک میں دوسرے کے ساتھ اختلاف نظر آتا ہے کہ مثلاً کسی حدیث میں تو محض چار عورتوں کے افضل النساء ہونے کا ذکر آتا ہے جیسا ابن مردویہ کی روایت میں مریم، آسیہ، خدیجہ اور فاطمہ کا نام ہے اور ایک میں یوں آتا ہے کہ عورتوں میں سے سوائے تین کے کسی کی تکمیل نہیں ہوئی۔ مریم، آسیہ، خدیجہ اور عائشہ رضی اللہ عنہن کی فضیلت سب عورتوں پر ایسی ہے جیسے ثرید کی فضیلت کھانوں پر۔ (ث) اور ایک حدیث میں ہے کہ بہترین عورتوں کی مریم بنت عمران اور بہترین عورتوں کی خدیجہؓ بنت خویلد ہیں۔ (ث) معلوم ہوتا ہے یہ فضیلت بعض پہلوؤں سے ہے۔

عیسائیوں کا مریمؑ کی فضیلت سے حضرت عیسیٰؑ کی فضیلت پر استدلال:

بعض عیسائی یہ بھی اعتراض کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو اتنی بڑی فضیلت حاصل ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ کو حاصل نہیں۔ اس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی فضیلت لازم آتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ماں کی فضیلت کے بغیر اولاد افضل نہیں ہوسکتی؟ اگر اولاد کو فضیلت اسی صورت میں ہوسکتی ہے جب ماں کو فضیلت حاصل ہو تو مریم کی ماں کو تو کوئی فضیلت حاصل نہ تھی۔ مریم کو کیونکر فضیلت حاصل ہوگئی؟ اور اگر یہ سلسلہ اور آگے چلایا جائے تو حضرت عیسیٰ کی دادیوں، نانیوں میں تو بعض ایسی عورتیں ملیں گی جن کے متعلق عیسائیوں کی کتابوں میں جو کچھ پایا جاتا ہے کوئی مسلمان اس کو مان بھی نہیں سکتا۔ عجیب بات ہے کہ قرآن کی رو سے مریم صدیقہ کو جو فضیلت ملتی ہے وہ پہلے مل چکتی ہے اور وہ بیٹا جس کو اس وجہ پر افضل کہنے کی جرأت کی جاتی ہے نہ صرف ابھی پیدا ہی نہیں ہوا بلکہ ماں کے رحم میں بھی موجود نہیں۔ اگر وہ پیدا نہ بھی ہوتا تو مریم کو جو فضیلت ملنی تھی وہ مل چکی۔ کیسا پرحکمت کلام ہے۔ مریم کے اصطفا، اس کی تطہیر، اس کی فضیلت کے ذکر میں جو اس آیت میں موجود ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیدا ہونے کی بشارت تک بھی نہیں۔ اس کا ذکر بعد میں آئے گا۔

مریمؑ کا ذکر اناجیل میں:

ہاں جس ماں کی فضیلت کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی فضیلت کی وجہ قرار دیا جاتا ہے۔ اناجیل کو اٹھا کر دیکھو وہاں اسی ماں کو کس زمرہ میں داخل کیا گیا ہے:

يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَ اسْجُدِيْ وَ ارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾

اے مریم! اپنے رب کی فرمانبرداری کر اور سجدہ کر اور جھک جانے والوں کے ساتھ جھک جا۔(420)

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ

یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں(421)

''کسی نے اس سے کہا دیکھ تیری ماں اور تیرے بھائی باہر کھڑے ہیں اور تجھ سے باتیں کرنی چاہتے ہیں۔ اس نے خبر دینے والے کے جواب میں کہا کون ہے میری ماں اور کون ہیں میرے بھائی اور اپنے شاگردوں کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا دیکھو میری ماں اور میرے بھائی یہ ہیں۔ کیونکہ جو کوئی میرے آسمانی باپ کی مرضی پر چلے وہی میرا بھائی اور بہن اور ماں ہے۔''[متی: 48:12 - 50]

اب اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح کے خیال میں اس کی ماں آسمانی باپ کی مرضی پر چلنے والی نہ تھی۔ ورنہ ماں کی طرف سے یوں بیزاری کا اظہار اور شاگردوں سے جو اس کی رائے میں آسمانی باپ کی مرضی پر چلنے والے تھے یوں محبت کا اظہار نہ ہوتا۔ پھر ایک جگہ مریم نے کچھ کہنا چاہا تو آپ یوں اپنی **والدہ محترمہ سے مخاطب ہوتے ہیں:** ''اے عورت مجھے تجھ سے کیا کام ہے۔''[یوحنا: 4:2] کیا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام اپنی والدہ محترمہ کی اس قدر عزت کرتے تھے کہ ان کو تمام دنیا کی عورتوں سے بلند مرتبہ سمجھتے ہوں اور اپنی فضیلت کو بھی ماں کی بزرگی کی طرف منسوب کرتے ہوں۔ بلکہ یہاں تو حالات کچھ اس کے برعکس نظر آتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ کا اپنی بیٹی کی عزت کرنا: جائے غور ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ اپنی بیٹی کی اس سے بہت بڑھ کر عزت کرتے ہیں جس قدر حضرت مسیح نے اپنی والدہ کی کی۔ آپ کبھی فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ایسے الفاظ میں خطاب نہیں کرتے۔ بلکہ ہمیشہ پیار، محبت، عزت کے الفاظ سے پکارتے ہیں۔ بلکہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی تعظیم کے لیے بعض وقت اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ بہر حال حضرت مریم علیہا السلام کی فضیلت سے کوئی استدلال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی فضیلت پر نہیں ہوسکتا۔

420- **حکم دینے سے خلاف ورزی حکم پر استدلال غلط ہے:** جب کبھی نبی کریم ﷺ کو کوئی حکم ہو (بلکہ عام حکم بھی ہو) تو عیسائی کہا کرتے ہیں کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے اس کے خلاف کیا تھا۔ اس لیے یہ حکم ہوا کہ ایسا کرو۔ اس موقعہ پر بھی انہیں غور کرنا چاہیے کہ کیا مریم پہلے خدا کی فرمانبرداری یا عبادت نہ کرتی تھیں؟ سیدھی بات ہے بعض وقت مشکلات کے لحاظ سے ایک بات کی تاکید کی جاتی ہے۔ مریم پر بھی بڑے ابتلاؤں کا وقت آنے والا تھا کہ لوگ اس پر طرح طرح کے الزام لگائیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمانبرداری کی تاکید فرمائی۔

421- اَنْبَاءٌ۔ نَبَأٌ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں ایسی خبر جس میں کوئی عظیم الشان مطلب ہو۔ اور اس سے علم یا غلبہ ظن حاصل ہو۔ (غ)

وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۪ وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۴﴾

اور تو ان کے پاس نہ تھا جب وہ اپنی قلمیں ڈالتے تھے کہ ان میں سے کون مریم کا کفیل بنے اور نہ تو ان کے پاس تھا جب وہ آپس میں جھگڑتے تھے۔ (422)

اَلْغَيْبُ۔ اس کا استعمال ہر اس چیز پر ہوتا ہے جو حاسہ سے مخفی ہو یا انسان کے علم میں نہ ہو۔ (غ) واقعات گزشتہ بھی اس لحاظ سے غیب میں داخل ہو جاتے ہیں جب ان کا صحیح علم نہ رہا ہو۔

واقعات گزشتہ کس صورت میں غیب میں داخل ہو جاتے ہیں: عیسائی اعتراض کرتے ہیں کہ تاریخی باتوں کو قرآن شریف نے ﴿ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ ﴾ کہا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ **حضرت مریم صدیقہ علیہا السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق** واقعات دنیا میں دشمن اور دوست دونوں میں نہایت غلط طور پر مروج ہو گئے اس لیے قرآن کریم نے اصل واقعات پر عالم کو مطلع فرما کر واقعی ایک غیب سے پردہ اٹھایا ہے اور مسیح اور مریم کی اصل حیثیت کو دنیا میں ظاہر فرمایا ہے اور اس میں کچھ شک نہیں کہ ایسی گڑبڑی میں جہاں مسیح کے اصل حالات پر خطرناک تاریکی کا پردہ پڑ چکا تھا۔ ان کی اصلیت پر اطلاع پانا کسی عالم کا کام بھی نہ ہو سکتا تھا۔ چہ جائیکہ عرب کا ایک امی ان اصل حالات کو ظاہر کرتا۔ اصل انجیل جس میں خالص حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیم تھی، وہ دنیا سے بالکل نابود ہو چکی تھی اور اس کی جگہ بہت سی انجیلیں لے چکی تھیں جن میں سے بعض کو کلیسا نے بلا دلیل الہامی مان لیا اور بعض کو وضعی قرار دے کر رد کر دیا اور مسیح کو خدائی کا مرتبہ دے کر اس کے خون کے کفارہ کو نجات کا موجب قرار دیا اور شریعت کو لعنت قرار دیا، اعمال کی ضرورت باقی نہ سمجھی۔ یہودیوں نے بوجہ اپنی عداوت کے جو ان کو مسیح کے ساتھ تھی کوئی صحیح حالات حضرت مسیح علیہ السلام کے باقی نہ رکھے تھے۔ ہاں وہ ان پر طرح طرح کے ناپاک الزام لگاتے تھے۔ جب اہل کتاب کے دونوں گروہ ایک شخص کے معاملہ میں اس طرح حد بندیوں کو توڑ کر دور نکل چکے تھے اور کوئی صحیح علم حضرت مسیح کے متعلق باقی نہ رہا تھا تو اب سوائے اللہ تعالیٰ کی وحی کے ان واقعات کا صحیح علم دنیا پر دوبارہ نہ آ سکتا تھا۔ یہ واقعی غیب کی خبر تھی جو اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی محمد رسول اللہ ﷺ پر ظاہر فرمائی اور آج دنیا آہستہ آہستہ اس بات کی قبولیت کی طرف چلی آتی ہے جس کا اعلان آج سے تیرہ سو برس پہلے ایک امی نے جو ایک ناخواندہ قوم میں سے تھا دنیا میں کیا۔

مریمؑ کی عصمت پر شہادت انباء الغیب سے ہے:

اس لیے ﴿ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ﴾ کے الفاظ ایک اعلیٰ درجہ کی صداقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور دوسری وجہ کہ حضرت مریم علیہا السلام کی عصمت کی شہادت کو ﴿ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ ﴾ سے کیوں قرار دیا؟ یہ ہے کہ واقعی گواہ تو اس کا دنیا میں کوئی نہ تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک نبی کی معرفت اس کی شہادت ادا کی تا دنیا اس حقیقت پر بذریعہ وحی آگاہ ہو جس سے آگاہی کا اور کوئی واقعی ذریعہ نہ رہا تھا۔

422- اَقْلَامٌ۔ قَلَمٌ کی جمع ہے اور قَلَمٌ (ل) یا قِلْمٌ (غ) کی جمع بھی اقلام آتی ہے جو اس تیر کا نام ہے جو قمار میں کام دیتا تھا۔ اور

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ جب فرشتوں نے کہا اے مریم! اللہ تجھے اپنی طرف سے

قَلَمٌ تیر کو اس لیے کہتے ہیں کہ وہ کاٹا جاتا ہے کیونکہ قَلَمٌ کے اصل معنی کاٹنے کے ہیں اس لیے ناخن کٹوانے پر بھی بولا جاتا ہے۔ اور یہاں زجاج وغیرہ نے اَقْلَامٌ سے مراد قِدَاحٌ یعنی قرعہ اندازی کے تیر ہی لیے ہیں اور بعض کے نزدیک معمولی قلمیں مراد ہیں جن سے کاہن لوگ لکھا کرتے تھے۔ اور قلم کا لفظ تقدیر الٰہی کے متعلق بھی بولا جاتا ہے۔ گو اس کی کیفیت کا علم کسی انسان کو نہیں دیا گیا۔ جیسا کہ ابن سیدہ کا قول لسان العرب میں منقول ہے: [وَالْقَلَمُ الَّذِیْ فِی التَّنْزِیْلِ لَا أَعْرِفُ كَيْفِيَّتَهُ] (جلد12، صفحہ 490) اور ایک اعرابی کا قول نقل کیا گیا ہے: [سَبَقَ الْقَضَاءُ وَ جَفَّتِ الْاَقْلَامُ] یعنی قضا وقدر کا فیصلہ ہو چکا اور قلمیں خشک ہو چکیں۔ مراد یہ ہے کہ جو فیصلہ ہونا تھا وہ پہلے ہو چکا۔ پس لوح وقلم میں بغیر کسی تشبیہ کے مراد قضا وقدر ہے۔

اس آیت میں کس واقعہ کی طرف اشارہ ہے؟ بعض کے نزدیک یہ مراد ہے کہ صغر سنی میں جب وہ تعلیم وتربیت کے لیے ہیکل میں آئیں تو اس وقت کاہنوں میں جھگڑا ہوا کہ ان کا کفیل کون ہو اور بذریعہ قرعہ اندازی جو خواہ تیروں سے ہوئی یا قلموں سے حضرت زکریا علیہ السلام مریم صدیقہ علیہا السلام کے کفیل ہوئے۔ اس صورت میں ﴿مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ﴾ وغیرہ میں ضمیر کاہنوں کی طرف ہوگی جن کا کوئی ذکر پہلے نہیں۔ مگر یہ کہا گیا ہے کہ چونکہ زکریا علیہ السلام کی کفالت میں مفہوم یہ پایا جاتا ہے کہ یہ کفالت کسی جھگڑے کے بعد ہوئی تھی اس لیے ان جھگڑنے والوں کی طرف ضمیر جاتی ہے۔ یہ بہت بعید تاویل ہے۔

حضرت مریمؑ کی دوسری کفالت مریمؑ کی بلوغت پر تھی:

بعض مفسرین کے نزدیک یہ اشارہ کسی ایسی کفالت کی طرف ہے جو مریم علیہا السلام کے بلوغ کو پہنچ جانے کے بعد وقوع میں آئی۔ جب زکریا علیہ السلام اس کی کفالت سے عاجز آ گئے۔ (ر) یعنی پہلے کوئی جھگڑا نہیں ہوا اور بعض نے دو دفعہ قرعہ اندازی لے کر اس آیت کو اسی دوسری قرعہ اندازی کے متعلق مانا ہے اور گو روح المعانی میں اس قول کو مرجوح لکھا ہے مگر فی الحقیقت اسے ترجیح ہے۔ کیونکہ قرآن کریم ایک پُرنظم کلام ہے اور تمام واقعات کا ذکر ایک ترتیب سے ہوتا چلا آ رہا ہے۔ پہلے مریم کی پیدائش کا ذکر کیا پھر اس کی کفالت زکریا کا ذکر۔ اسی ذکر میں زکریا علیہ السلام کی دعا اور یحییٰ کی بشارت کا ذکر ضمنی طور پر آ گیا۔ اس کے بعد پھر اصل ذکر کی طرف رجوع کیا تو مریم علیہا السلام کے اصطفا و پاکیزگی برگزیدگی کا ذکر۔ اسے فرمانبرداری اور نماز کا حکم دیا۔ یہ واقعات یقیناً زمانہ بلوغت سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے اس کے بعد پھر ایک گزشتہ واقعہ کی طرف اشارہ کرنا بلاغت کے خلاف ہے۔ پس یہ آیت یقیناً اس وقت کی طرف اشارہ کرتی ہے جب مریم صدیقہ علیہا السلام سن رشد کو پہنچ چکی تھیں اب ان کی تربیت کا زمانہ ختم ہو گیا اور ہیکل میں نہ رہ سکتی تھیں۔ اس لیے بھی کہ بلوغت کے ساتھ ایام حیض کا آنا ضروری تھا اور یہودیوں میں ایام حیض کے اندر عورت کو ناپاک سمجھ کر الگ رکھا جاتا تھا۔

مریم صدیقہ کا نکاح: پس یہاں جس کفالت کا ذکر ہے اس سے مراد کفالت نکاح ہے۔ ایک سن بلوغ کو پہنچی ہوئی عورت کے

يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيحُ ایک کلام کے ساتھ خوش خبری دیتا ہے۔(423) اس

لیے اب یہ ضروری تھا کہ اس کے نکاح کا فکر کیا جاتا۔ اور مریم کی ماں نے مریم کو خدمت دین کے لیے نذر کر دینے کے بعد بھی یہ دعا مانگ کر کہ ﴿اِنِّیْٓ اُعِیْذُھَا بِكَ وَ ذُرِّیَّتَھَا﴾ بتا دیا تھا کہ تارک بٹھانا اس کا منشا ہرگز نہ تھا اور نہ تارک بٹھانے کا بنی اسرائیل میں کوئی دستور معلوم ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ وہ ہیکل کی خدمت کے لیے وقف ہو چکی تھیں، اس لیے انہیں یہ اختیار نہ تھا نہ ان کی والدہ کو یا والد کو اختیار تھا کہ ان کے نکاح کی تجویز کریں۔ بلکہ اس کے متعلق **قرعہ اندازی** سے فیصلہ کرنا مناسب سمجھا گیا۔ کیونکہ وہ بہت سے کام قرعہ اندازی سے کر لیا کرتے تھے اور اسے خدائی فیصلہ سمجھتے تھے۔ جیسا کہ خود کہانت کے کام کے سر انجام دینے میں قرعہ اندازی کو خدائی فیصلہ سمجھا جاتا تھا۔ جیسا کہ اناجیل میں مرقوم ہے:

''اور جب وہ خدا کے حضور اپنے فریق کی باری پر کہانت کا کام انجام دیتا تھا تو ایسا ہوا کہ کہانت کے دستور کے موافق اس کے نام کا قرعہ نکلا کہ خداوند کے مقدس میں جا کر خوشبو جلائے۔'' [لوقا: 1:8, 9]

باقی رہا ذکر خصومت سو یہ بھی کوئی بعید از قیاس بات نہیں۔ ایسی نیک اور پاک بی بی کو اپنی زوجیت میں لانے کی خواہش بہتیرے دلوں میں پیدا ہوئی ہوگی۔ علاوہ ازیں وہ ہیکل کی نذر ہو چکی تھیں گویا ماں باپ کا یا اپنا اختیار تو اس معاملہ میں رہا نہ تھا۔ اس لیے مناسب یہی سمجھا گیا کہ بذریعہ قرعہ اندازی ہی اس کا فیصلہ ہو۔ پس یہاں گویا درحقیقت یہ ذکر ہے کہ مریم کے لیے خاوند کا فیصلہ بذریعہ قرعہ اندازی کیا گیا اور ضمیریں اس صورت میں عام ہیں یعنی وہ لوگ جو اس وقت تھے۔

اور یہ جو فرمایا کہ تم ان کے پاس نہ تھے۔ تو اس میں یا تو یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ **مریم علیہا السلام کی بریت کی شہادت** ایک ایسے شخص کی طرف سے ہے جس کا تعلق فریق مقدمہ سے کوئی نہیں اس لیے یہ نہایت سچی اور بے لوث شہادت ہے اور یا اس لحاظ سے کہا کہ وہ واقعات تمہارے ذریعہ سے ظاہر کیے جاتے ہیں، جن کا علم دنیا میں مفقود ہو چکا تھا تو تم ان کے پاس نہ تھے۔ پس یہ علم غیب سوائے خدا کے کون ظاہر کر سکتا تھا۔

ہاں ایک امکان یہ بھی ہے کہ **یہ مریم کے اصطفائے روحانی کی طرف اشارہ ہو۔** ملائکہ کا ذکر پہلے آ چکا ہے اور قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی شخص کی برگزیدگی کے وقت ملاء اعلیٰ میں ایک خصومت ہوتی ہے۔ جیسا کہ فرمایا: ﴿مَا كَانَ لِیَ مِنْ عِلْمٍۭ بِالْمَلَاِ الْاَعْلٰٓی اِذْ یَخْتَصِمُوْنَ﴾ [صٓ: 69:38] مجھے ملاء اعلیٰ کے متعلق کوئی علم نہ تھا، جب وہ جھگڑتے تھے۔ اس صورت میں اقلام سے مراد قضا و قدر ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ اس لفظ کے معنی میں پہلے بیان ہو چکا ہے اور ملائکہ کی طرف اس کو منسوب کرنا اس لیے درست ہے کہ گو سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے مگر وہ ملائکہ کی وساطت سے ہی ہوتا ہے جیسا کہ خدا ہی کلام کرنے والا ہے۔ مگر یہاں قول ملائکہ کی طرف منسوب ہے۔

423- **کلمۃ اللہ سے مراد:** ﴿اِنَّ اللّٰهَ یُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ﴾ اس کے معنی میں نے یوں کیے ہیں: اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے ایک کلام کے ذریعہ بشارت دیتا ہے۔ مگر عام طور پر اس کے معنی یوں کیے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ تجھے اپنے ایک کلمہ کی بشارت دیتے ہیں اس

کے معنی کے لحاظ سے گویا مسیح کو اللہ تعالیٰ کا ایک کلمہ کہا گیا ہے۔ اور عیسائیوں کا اس پر بہت زور ہے کہ مسیح کو کلمۃ اللہ کہہ کر قرآن شریف نے ایک ایسی خصوصیت دے دی ہے جو دوسرے کسی نبی کو نہیں دی۔ اور پھر اس خصوصیت کی بنیاد پر مسیح کو خدا بنایا جاتا ہے۔ یہی وہ دلیل ہے جو وفد نجران نے نبی کریم ﷺ کے مقابلہ پر پیش کی اور یہی وہ دلیل ہے جس پر آج بھی عیسائی زور دیتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کریم نے کیسا لطیف جواب بھی ان لوگوں کو دے دیا تھا کہ اس کی بشریت یا خدائی کا فیصلہ اصولی رنگ میں کرو۔ کیا جس شخص کے ساتھ کھانے پینے، قضائے حاجت کی ضروریات، ماں کے رحم میں رہنے، پیدا ہونے، بڑھنے، جوان اور پھر بوڑھا ہونے کے پھر وفات پانے کے عوارض پائے جاتے ہوں اس کو بشر کہیں گے یا خدا؟ مگر ہر ایک باطل پرست کا یہ قاعدہ ہے کہ وہ اصولی بحث سے گریز کرتا ہے اور خصوصیات میں جا کر پناہ ڈھونڈتا ہے۔ اب اگر یہ بھی مان لیں کہ مسیح کو کَلِمَةٌ مِنَ اللّٰهِ کہا گیا ہے اور کسی نبی کا نام لے کر اس کے ساتھ کلمۃ اللہ کا لفظ نہیں بولا۔ تو کیا اس سے مسیح کی خدائی ثابت ہو سکتی ہے یا بشریت کے دائرہ سے وہ نکل جاتا ہے۔ یہ محض ایک دعویٰ ہے جس کی دلیل کوئی نہیں کہ کیونکر صرف اس خصوصیت سے دائرہ بشریت سے نکل کر مسیح خدا بن جاتا ہے۔

بروئے قرآن کلمات اللہ بہت ہیں:

پھر مسیح کو تو ﴿كَلِمَةٍ مِّنْهُ﴾ کہا یعنی اپنی طرف سے ایک کلمۃ۔ اس سے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اکیلا ہی کلمہ نہیں بلکہ کلموں میں سے ایک کلمہ ہے اور اپنے کلمات کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ﴾ [الكهف: 109:18] کہو اگر میرے رب کے کلمات کے لیے سمندر بھی سیاہی بن جائیں تو میرے رب کے کلمات اس قدر لاتعداد لاتحصی ہیں کہ سمندر ختم ہو جائیں مگر وہ کلمات ختم نہ ہوں۔ تو کیا صاف ظاہر نہیں کہ اس لاانتہا تعداد میں سے جو اللہ تعالیٰ کے کلموں کی ہے ایک کلمہ مسیح بھی ہے۔ پس خصوصیت بھی کوئی نہ رہی۔ پھر ﴿كَلِمَةٍ مِّنْهُ﴾ کے معنی تو صرف اس قدر ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کا ایک کلام ہے۔

کلمہ یا قول کے آنے سے مراد: اب جب کوئی شخص کوئی بات کرے اور وہ بات پوری ہو جائے تو کہتے ہیں جَاءَ كَلَامُهُ یا جَاءَ قَوْلُهُ۔ اس کا کلام یا اس کا قول آ گیا۔ اس سے مراد یہ نہیں ہوتی کہ وہ کلام یا قول مجسم ہو کر آ گیا۔ بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ جو اس نے کہا تھا وہ پورا ہو گیا ہے۔ پس اس معنی میں مسیح کو کلمۃ اللہ کہہ سکتے ہیں کہ خدا نے ایک بات کہی تھی وہ مسیح کے آنے سے پوری ہو گئی۔ پس مسیح کے آنے میں گویا خدا کا کلام آ گیا۔ چنانچہ یہی توجیہ مفسرین نے پسند کی ہے۔ جیسا کہ امام رازی کہتے ہیں: [اِنَّهُ قَدْ وَرَدَتِ الْبَشَارَةُ فِيْ كُتُبِ الْاَنْبِيَاءِ الَّذِيْنَ كَانُوْا قَبْلَهُ فَلَمَّا جَاءَ قِيْلَ هٰذَا هُوَ تِلْكَ الْكَلِمَةُ] (تفسیر الرازی: جلد1، صفحہ 1139) یعنی ان نبیوں کی کتابوں میں جو اس سے یعنی مسیح سے پہلے گزر چکے تھے مسیح کے متعلق بشارت تھی۔ پس جب مسیح آیا تو کہا گیا کہ وہ کلمہ آ گیا۔ اسی طرح آنحضرت ﷺ اپنی نسبت فرماتے ہیں: [اَنَا دَعْوَةُ اَبِيْ اِبْرَاهِيْمَ] **میں اپنے باپ ابراہیم کی دعا ہوں۔** حالانکہ آپ کوئی دعائے مجسم تو نہ تھے۔ مگر چونکہ آپ کے وجود میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا پوری ہوئی اس لحاظ سے آپ نے اپنے آپ کو دعا کہہ دیا ہے۔

عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا (مبشر) کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہے(424) جو دنیا اور

کلمہ کی دوسری توجیہ:

دوسری توجیہ یہ ہے کہ ﴿يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ﴾ میں ''با'' ذریعہ کے لیے ہے یعنی معنی یہ ہیں کہ اے مریم! اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے ایک کلمہ کے ساتھ بشارت دیتا ہے اور یہ بعینہٖ اسی طرح ہے جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اسحاق علیہ السلام کی بشارت ملی تو آپ نے فرمایا: ﴿فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ﴾ [الحجر: 54:15] ''تو تم کاہے کی خوشخبری دیتے ہو۔'' تو جواب اس کا یوں دیا گیا ﴿بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ﴾ ہم تمہیں حق کے ساتھ بشارت دیتے ہیں۔ یہ مراد نہیں کہ الحق کی بشارت دیتے ہیں۔ اب ﴿يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ﴾ اور ﴿بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ﴾ بالکل ایک جیسی مثالیں ہیں۔ اگر ایک کے ذریعہ سے مسیح کلمۃ اللہ بن سکتا ہے تو دوسرے کے ذریعہ اسحاق الحق بن سکتا ہے۔ حالانکہ بات صرف اس قدر ہے کہ ایک جگہ تو یہ مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کلام کے ساتھ بشارت دیتا ہے اور دوسری جگہ مراد ہے کہ ہم تم کو حق کے ساتھ بشارت دیتے ہیں۔ اس صورت میں مفعول کو محذوف کر کے اس کی بجائے فرمادیا وَاسْمُهُ الْمَسِيْحُ وہ جس کی بشارت ہم دیتے ہیں اس کا نام مسیح ہے۔ تو ﴿كَلِمَةٍ مِّنْهُ﴾ سے مراد صرف اللہ تعالیٰ کی پیشگوئی ہے اور اسی کی مؤید یہ بات ہے کہ ﴿كَلِمَةٍ مِّنْهُ﴾ کے بعد فرمایا: اِسْمُهُ۔ حالانکہ كَلِمَةٌ مؤنث ہے۔ پس اِسْمُهُ میں ضمیر مُبَشَّرٌ بِهٖ کی طرف جائے گی یعنی اس کا نام جس کی بشارت دی جاتی ہے۔

424- اِسْمٌ وہ ہے جس سے ایک چیز کی ذات اور اس کا اصل پہچانا جائے۔ (غ) اسم سے مراد عَلَمٌ بھی ہوتا ہے اور اسم سے مراد بلحاظ معنی لغوی علامت ممیزہ بھی ہوتے ہیں۔ (ر) یہاں دونوں معنوں کو جمع کر دیا ہے۔ کیونکہ المسیح جس کو مقدم کیا ہے وہ لقب ہے جو بعد نبوت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ملتا ہے اور ابن مریم آپ کی کنیت ہے۔

اَلْمَسِيْحُ۔ مَسَحَ کے معنی کسی چیز پر ہاتھ کا پھیرنا اور اس سے اثر کا دور کر دینا ہے۔ (غ) اور پھر ان دونوں معنوں میں الگ الگ بھی استعمال ہوتا ہے: [وَعُبِّرَ عَنِ السَّيْرِ بِالْمَسْحِ]۔ (غ) اور سیر یعنی چلنے کو بھی مسح کہتے ہیں: [قِيْلَ سُمِّيَ عِيْسٰى مَسِيْحًا لِكَوْنِهٖ مَاسِحًا فِي الْاَرْضِ أَيْ ذَاهِبًا فِيْهَا] یعنی **حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام مسیح اس لیے رکھا گیا** کہ وہ زمین میں چلنے والے یا سیاحت کرنے والے تھے۔ اس سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ حضرت مسیح علاوہ ملک شام کے دوسرے ممالک میں بھی پھرتے رہے اور کہ وہ افغانستان اور **کشمیر میں آئے** اور اس کی مزید تائید اس سے ہوتی ہے کہ بنی اسرائیل زمانہ قید میں کچھ جلاوطن ہو کر افغانستان وغیرہ کی طرف چلے آئے تھے اور افغان اپنے آپ کو بنی اسرائیل کہتے ہیں اور افغانستان اور کشمیر کے شہروں کے ناموں میں اور افغانوں اور کشمیریوں کے رسم و رواج میں بھی اس کی شہادت ملتی ہے ضرور تھا کہ مسیح ان اسرائیلی اقوام کی طرف بھی آتے۔ دیگر وجوہات یہ دی ہیں کہ آپ کے ہاتھ لگانے سے بیمار اچھے ہو جاتے تھے یا آپ ماں کے پیٹ سے ممسوح بالدھن پیدا ہوئے تھے اور پھر لکھا ہے کہ بعض کہتے ہیں کہ مسیح وہ ہے جس کی ایک آنکھ ماری ہوئی ہو۔ [وَقَدْ رُوِيَ أَنَّ الدَّجَّالَ مَمْسُوْحُ الْيُمْنٰى وَعِيْسٰى مَمْسُوْحُ الْيُسْرٰى. قَالَ: وَيَعْنِي بِأَنَّ الدَّجَّالَ

وَ الْاٰخِرَةِ وَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۙ﴿۴۵﴾ آخرت میں وجاہت والا اور مقربوں میں سے ہوگا۔(425)

قَدْ مُسِحَتْ عَنْهُ الْقُوَّةُ الْمَحْمُوْدَةُ مِنَ الْعِلْمِ وَالْعَقْلِ وَالْحِلْمِ وَالْأَخْلَاقِ الْجَمِيْلَةِ، وَأَنَّ عِيْسٰى مُسِحَتْ عَنْهُ الْقُوَّةُ الذَّمِيْمَةُ مِنَ الْجَهْلِ وَالشَّرَهِ وَالْحِرْصِ وَسَائِرِ الْأَخْلَاقِ الذَّمِيْمَةِ]۔ (غ) اور روایت کی گئی ہے کہ **دجال کی دائیں آنکھ ماری ہوئی ہوگی اور عیسیٰ کی بائیں آنکھ ماری ہوئی ہوگی** اور مراد اس سے یہ ہے دجال سے علم اور عقل اور حلم اور اچھے اخلاق کی قابل تعریف قوت جاتی رہی ہوگی۔ اور عیسیٰ سے جہل اور لالچ اور حرص اور برے اخلاق کی قابل نفرت قوت جاتی رہی ہوگی۔ امام راغب کی اس تشریح سے معلوم ہوتا ہے کہ دجال کا کانا ہونا محض بلحاظ صفات ہے اور ان بزرگوں نے ان پیشگوئیوں کو مجاز اور استعارہ پر حمل کیا ہے۔

425- وَجِيْهٌ کے معنی ہیں ذُوْجَاهٍ یا ذُوْ وَجَاهَةٍ یعنی مرتبہ یا وجاہت والا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا: ﴿وَ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا﴾[الأحزاب: 69:33] ''اور وہ اللہ کے نزدیک مرتبے والا تھا۔'' اللہ تعالیٰ کے انبیاء سب ہی وجاہت والے ہوتے ہیں۔

مسیح کو وجیہ کہنے کی وجہ: یہاں اشارہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگ سمجھیں گے کہ یہ شخص ذلیل ہو گیا مگر ایسا نہ ہوگا بلکہ اسے دنیا میں بھی ضرور وجاہت حاصل ہوگی اور آخرت میں بھی۔ جس قدر تاریخ حضرت مسیح کی عیسائیوں کے ہاتھ میں ہے وہ بظاہر انہیں ایک ذلت کی حالت میں چھوڑتی ہے۔ کیونکہ ان کا خاتمہ چوروں کے ساتھ صلیب پر ہوتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ وہ انبیاء کو کچھ نہ کچھ کامیابی دے کر اٹھاتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ﴿وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا﴾ فرمانا یہی معنی رکھتا ہے کہ لوگ انہیں ناکام سمجھیں گے مگر فی الحقیقت وہ کامیابی کے بعد اٹھائے جائیں گے۔ یہ کامیابی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہود بیت المقدس میں حاصل نہیں ہوئی۔ ان الفاظ سے یہ خیال اور بھی قوت پکڑتا ہے کہ **حضرت عیسیٰ علیہ السلام واقعہ صلیب کے بعد بنی اسرائیل کی دوسری قوموں کی طرف چلے گئے** جو بخت النصر کے زمانہ میں جلاوطن ہو کر دوسرے ممالک میں آباد ہو چکی تھیں۔

﴿وَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ﴾ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے مقربوں میں سے ایک ہیں۔ کہتے ہیں ڈوبتا ہوا تنکے کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔ وہی حالت بعض وقت عیسائی مشنریوں کی ہو جاتی ہے۔ یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ چونکہ قرآن نے مسیح کو مقرب کہا اور مقرب ملائکہ ہوتے ہیں اس لیے مسیح کو بشر سے اوپر مانا ہے۔ چونکہ قرآن کریم سے محض بے خبر ہیں ان کو اتنا بھی پتا نہیں کہ جن مقربین میں سے مسیح کو کہا ہے ان مقربین میں امت محمدیہ کا ایک گروہ بھی داخل ہے: ﴿وَ السّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ۙ﴿۱۰﴾ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۚ﴿۱۱﴾﴾ [الواقعة: 56:10-11] ''اور آگے بڑھنے والے سب سے آگے ہی ہیں۔ وہی مقرب ہیں۔'' یعنی سابقین اس امت کے مقربین بارگاہ الٰہی ہیں۔ اور دوسری جگہ ہے: ﴿عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ﴾[المطففين: 83:28] ''وہ ایک چشمہ ہے جس سے مقرب پیتے ہیں۔'' وہاں بھی امت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک گروہ کو ہی مقرب قرار دیا ہے جیسا کہ اس سے پہلے الفاظ ﴿اِنَّ كِتٰبَ الْاَبْرَارِ﴾[المطففين: 83:18] ''نیکوں کے اعمال۔'' سے ظاہر ہے۔ پس جب صلحاء بھی مقربین بارگاہ الٰہی ہیں تو

وَ يُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَ كَهْلًا وَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۴۶﴾

اور وہ لوگوں سے جھولے میں اور ادھیڑ عمر میں باتیں کرے گا اور نیکوں میں سے ہوگا۔ (426)

حضرت مسیح کو خصوصیت سے **مقربوں میں سے ایک کہنے کی کیا ضرورت تھی؟** کیونکہ انبیاء بدرجہ اولیٰ مقرب ہوئے۔ سو بات یہ ہے کہ یہودیوں نے عداوت سے اور عیسائیوں نے بیوقوفی سے (ضلالت محبت میں) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نعوذ باللہ ملعون قرار دیا۔ کیونکہ دونوں ان کی صلیب پر موت مانتے ہیں۔ اور ملعون وہ ہے جو خدا سے دور کیا گیا ہو۔ اس لیے اس الزام لعنت سے صاف کرنے کے لیے قرآن کریم نے مسیح کو ﴿مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ﴾ کہا ہے اور دوسری جگہ اس قرب کو لفظ رفع سے ظاہر کیا ہے اور ﴿مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ﴾ خود بتاتا ہے کہ مسیح کے علاوہ اور بھی مقرب ہیں۔

426- اَلْمَهْد۔ مَهَدَ کے ایک معنی [نمبر: 265] میں بیان ہوئے ہیں۔ خصوصیت سے اس جگہ کو کہا جاتا ہے جو بچے کے لیے تیار کی جاتی ہے۔ یعنی جھولا۔

كَهْل ۔ كَهَلٌ کی عمر مختلف حدیں اہل لغت نے بیان کی ہیں مگر صحیح وہ ہے جو راغب نے لکھا ہے اور لسان العرب میں بھی ہے کہ کہل وہ ہے جس کے سیاہ بالوں کے اندر سفید مل گئے ہوں۔

اَلصَّالِحِيْنَ۔ صَالِحٌ۔ صَلَاحٌ سے ہے جو فساد کی ضد ہے اور ان دونوں کا اکثر استعمال افعال میں ہے۔ (غ) مگر خود قرآن شریف میں ﴿لَئِنْ اٰتَيْتَنَا صَالِحًا﴾ [الأعراف: 189:7] ''اگر تو ہمیں صحیح وسالم (بچہ) دے۔'' میں صالح سے مراد صحیح سالم ہے جیسا کہ اس سے اگلی آیت میں ﴿فَلَمَّآ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا﴾ [الأعراف: 190:7] ''پھر جب وہ ان کو صحیح وسالم (بچہ) دیتا ہے۔'' کہہ کر واضح کر دیا۔ کیونکہ جب بچہ پیدا ہو تو اس کی صلاحیت افعال کی فوراً معلوم نہیں ہوتی صلاحیت جسم کی معلوم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مفسرین نے وہاں صالحا کے معنی [وَلَدًا سَوِيًّا قَدْ صَلُحَ بَدَنُهُ] کیے ہیں۔ (ض) اور ابن جریر نے لکھا ہے کہ صلاح کبھی استوائے خلق یعنی صحیح سالم ہونے میں ہوتی ہے اور کبھی دین میں۔

اس آیت میں تین باتیں بیان کی ہیں۔ **حضرت مسیح کا جھولے میں باتیں کرنا، بڑھاپے میں باتیں کرنا، صالح ہونا۔** سب بچے عموماً جھولے میں ہی باتیں کرنا سیکھتے ہیں۔ کیونکہ دو سال کی عمر تک جھولے میں رہتے ہیں۔ لیکن حضرت مسیح کے متعلق جو یہ الفاظ آئے تو ان سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ آپ کا بچپن میں باتیں کرنا معجزہ تھا اور اس کی بشارت دی گئی ہے اور اس کے ساتھ چونکہ کہولت میں باتیں کرنے کا ذکر ہے۔ اس لیے اس کو بھی معمولی حالت سے الگ کر کے نزول ثانی میں باتیں کرنے پر محمول کیا گیا ہے۔ لیکن اس کی غلطی خود اسی سے ظاہر ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام کو یہ بشارت دینے کے کیا معنی؟ کیا ان کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول ثانی کا مسئلہ بھی بتا دیا گیا تھا؟ اور اگر بتانا ہی تھا تو یہ بتایا جاتا کہ اسے آسمان پر زندہ اٹھایا جائے گا۔ اور پھر آخری زمانہ میں نزول ہوگا۔ اتنی بات بتانے سے کہ وہ حالت کہولت میں لوگوں سے باتیں کرے گا ان کو یہ کس طرح پتہ لگ سکتا تھا کہ یہ کسی نزول ثانی کا ذکر ہے پھر یہ دو تو معجزے ہو گئے۔ تیسری بات آپ کا صالح ہونا آیا یہ بھی معجزہ تھا؟

قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّ لَمْ اس نے کہا میرے رب! میرے بیٹا کیوں کر ہوگا اور مجھے

جھولے کے کلام پر بحث:

انبیاء علیہم السلام کے معجزات کا انکار کوئی مسلمان نہیں کرسکتا۔لیکن مفسرین کو یہاں خود یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ حضرت مسیح کا جھولے میں باتیں کرنا کس کا معجزہ تھا؟ حضرت مسیح کا؟ تو وہ ابھی نبی نہیں بنے۔اس لیے اس کو ارہاص کہنا پڑا حضرت مریم کا،تو وہ نبی نہیں۔**یوں اللہ تعالیٰ قادر ہے کہ ایک بچہ کو چھوڑ کر خشک لکڑی سے بھی کلام کرادے**۔جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ٹیک لگانے کی لکڑی کی آواز آپ کے معجزات میں سے ہے۔سوال صرف یہ ہے کہ آیا قرآن وحدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ معجزہ ہے؟

1. اول: حضرت مریم علیہا السلام کو یہ تو بتایا نہیں گیا کہ یہ بچہ نبی ہوگا۔صرف یہ بتایا گیا کہ وجیہ ہوگا،مقرب ہوگا اور مقرب ہونے کے لیے نبی ہونا ضروری نہیں۔پھر آپ کے معجزات پر کیونکر ایک بے محل کلام شروع کر دیا۔
2. دوم: ماں کو بچہ کی بزرگی،دینی اور دنیوی اصلاح کی خبر سے تو خوشی پہنچتی ہے اور اس بشارت سے کیا حاصل ہے کہ وہ ایک معجزہ بھی دکھائے گا۔
3. سوم: اگر معجزات کی بشارت ہی مریم صدیقہ کو سنانی تھی تو جو اس سے بڑے بڑے معجزات تھے کا ذکر کیوں نہ کیا۔
4. چہارم: جو کلام اس سے مراد لیا گیا ہے۔وہ وہ ہے جس کا ذکر سورۃ مریم میں ہے:﴿قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ۖ اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَ جَعَلَنِيْ نَبِيًّا ۙ۝ وَّ جَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ ۪ وَ اَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ۙ۝ وَّ بَرًّۢا بِوَالِدَتِيْ﴾ [مریم: 19:30-32] ''(عیسیٰ نے) کہا میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب دی اور نبی بنایا۔اور مجھے برکت والا بنایا جہاں کہیں میں رہوں اور مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے جب تک میں زندہ رہوں۔اور اپنی ماں سے نیکی کرنے والا (ہوں)۔''

اس پر مفصل بحث تو اپنے موقعہ پر ہوگی۔لیکن اس قدر یہاں ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ کلام جھولے کے بچے کا نہیں ہوسکتا۔کیونکہ اس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ① مجھے کتاب دی ہے، ② مجھے نبی بنایا ہے، ③ مجھے بابرکت بنایا ہے۔جہاں کہیں جاؤں ④ مجھے نماز کا حکم دیا ہے اور ⑤ زکوٰۃ کا حکم دیا ہے۔جب تک میں زندہ ہوں ⑥ ماں سے نیکی کرنے والا بنایا ہے۔اب یہ سب کلام ایک بالغ انسان کا ہے جو نہ صرف مکلف ہو چکا ہے بلکہ جس کو کتاب ونبوت مل چکی ہے۔اور ظاہر ہے کہ کتاب ونبوت ملنے کے یہ معنی ہیں کہ انجیل آپ پر وحی ہوتی تھی اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سے پہلے فرما دیا تھا کہ ہم تم کو نبی بناتے ہیں اور یہ بالبداہت غلط ہے۔علاوہ ازیں ابھی آگے آتا ہے:﴿وَ يُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ﴾ جس سے معلوم ہوا کہ انجیل کے نزول سے پہلے آپ لکھنا بھی جانتے تھے اور حکمت کی باتوں سے بھی آگاہ ہو چکے تھے اور تورات بھی پڑھ چکے تھے۔آخر اس معمہ کو بھی حل کرنا چاہیے کہ ایک دن کا بچہ یہ سب کچھ سیکھ چکا تھا۔پھر اس کے ساتھ ہی اس پر نماز اور زکوٰۃ فرض ہو چکی تھی۔اور﴿مَا دُمْتُ حَيًّا﴾ کی شرط نے بتا دیا کہ اس وقت بھی فرض تھی جب یہ کلام کر رہے تھے۔اگر بچپن کا کلام ہوتا تو بجائے

يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ کسی انسان نے چھوا نہیں۔ فرمایا اسی طرح ہوگا اللہ جو

اس کے یوں ہوتا کہ مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے جب میں بلوغت کو پہنچ جاؤں۔

پھر ان الفاظ کا کیا مطلب ہے؟ تین باتیں بتائی ہیں۔ طفولیت میں کلام کرنا۔ کہولت کی حالت میں کلام کرنا۔ صالح ہونا۔ اب ظاہر ہے کہ یہاں صَالِحٌ سے مراد نیک کام کرنے والا نہیں بلکہ صحیح سالم تندرست بچہ مراد ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب اوپر آپ کو مقرب بارگاہ الٰہی کہہ دیا تو اب یہ بتانا کہ وہ نیک کام کرنے والا ہوگا تحصیل حاصل ہے۔ نیک کام کرنے والے ہی مقرب ہوا کرتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ یہاں حضرت مریم علیہا السلام کو جب فرزند کی خوشخبری دی تو فرزند کے متعلق جن باتوں کا خیال والدین کو ہوتا ہے وہ بھی بتا دیں۔ دنیا اور آخرت میں معزز ہوگا، مقرب بارگاہ الٰہی ہوگا یعنی کمال روحانی کو حاصل کرے گا۔ کوئی جسمانی نقص بھی اس میں نہ ہوگا اور وہ بڑھاپے کی عمر کو بھی پہنچے گا۔ یعنی لمبی عمر بھی پائے گا۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو اس کے قویٰ کے صحیح سالم ہونے کا علم تو فوراً ہو جاتا ہے مگر یہ بات کہ وہ باتیں بھی کرے کچھ مدت بعد ظاہر ہوتی ہے اس لیے اس کی الگ خوشخبری بھی سنا دی۔ پھر یہ بات کہ وہ عمر بھی پائے گا یہ بھی دیر میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس لیے اس کی خوش خبری بھی سنا دی۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ ساتھ ہی یہ بھی اشارہ ہو کہ بچپن میں اس کی باتیں معمولی بچوں سے بڑھ کر ذہانت کی باتیں ہوں گی اور بڑی عمر کو پہنچ کر اس کا کلام معمولی لوگوں سے بڑھ کر پُرحکمت کلام ہوگا۔

بشارت کے ذکر میں نفی الوہیت مسیح:

لیکن قرآن کریم ایک ایسا پُرحکمت کلام ہے کہ ایک ذکر کرنے سے کئی کئی باتیں بتا دیتا ہے۔ حضرت مریم علیہا السلام کو جو خوشخبری دی اس کا ذکر قرآن شریف میں آخر کیوں کیا؟ ظاہر ہے کہ اس سارے بیان کی اصل غرض تو عیسائیوں پر اتمام حجت ہے۔ اس لیے جب ﴿وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا﴾ کہا تو بتا دیا کہ عیسائیوں کا یہ عقیدہ درست نہیں کہ دنیوی طور پر حضرت مسیح کو کوئی عزت حاصل نہیں ہوئی بلکہ ان کا خاتمہ ماریں کھاتے کھاتے ہوگیا۔ اور آخرت میں وجیہ کہہ کر یہ بتا دیا کہ یہودی بھی غلطی پر ہیں۔ اور مقرب کہہ کر یہودیوں اور عیسائیوں کے اس خیال کی تردید کی کہ آپ نعوذ باللہ من ذلک ملعون ہوئے کیونکہ ملعون یعنی مطرود یا راندہ درگاہ کے مقابلہ پر مقرب بارگاہ الٰہی ہے اور عیسائی بھی آپ کو تین دن کے لیے ملعون قرار دیتے ہیں اور مھد اور کہولت کا ذکر کر کے یہ بتا دیا کہ آپ پر وہ تمام تغیرات جو بچوں پر جھولے کی حالت سے لے کر کہولت تک آتے ہیں۔ یعنی بڑھے، جوان ہوئے، پھر بڑھاپا یعنی انحطاط شروع ہوا اور یوں تردید الوہیت کی۔ اور اس کا اعتراف مفسرین کو بھی ہے: [وَذُكِرَ أَحْوَالُهُ الْمُخْتَلِفَةُ الْمُتَنَافِيَةُ إِرْشَادًا إِلٰى أَنَّهُ بِمَعْزِلٍ عَنِ الْأُلُوْهِيَةِ](تفسير البيضاوی: جلد1، صفحہ 40) (ض) جن لوگوں نے اس حقیقت پر غور نہیں کیا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان باتوں کو صرف بوجہ ان کے معجزہ ہونے کے ہی ذکر کیا۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم نے حضرت مسیح اور ان کی والدہ کے متعلق کھانا کھانے کا ذکر کیا ﴿كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ﴾ [المآئدۃ: 75:5] ''وہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔'' جس میں مراد نفی الوہیت ہے۔ ورنہ کھانا تو ساری دنیا کھاتی ہے۔ حضرت مریم علیہا السلام کے آپ کو حمل

مَا يَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۴۷﴾ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے جب کسی امر کا فیصلہ کر دیتا ہے تو اسے کہتا ہے ہو پس وہ ہو جاتا ہے۔(427)

میں لینے کا ذکر کیا۔ دردِ زِہ کے ساتھ جننے کا ذکر کیا۔ یہ سب کچھ عام طور پر ہوتا ہے۔ غرض یہ ہے کہ یہ خدا نہیں ہو سکتا اور مَھْدٌ اور کَھْوْلَتٌ کے ذکر کی اصل غرض ہے کہ خدا تعالیٰ پر یہ تغیرات نہیں آسکتے۔

427- جس طرح حضرت زکریا علیہ السلام کو باوجود دعا کے اور اس یقین کے کہ اس کی دعا رد نہ ہوگی بیٹے کی خوشخبری ملی تو ان کا خیال فوراً اس طرف گیا کہ اس قدر رکاوٹ کے باوجود کہ میں بڑھا ہو گیا اور میری عورت بانجھ ہے۔ بچہ کب ہوگا، کس طرح ہوگا۔ اسی طرح حضرت مریم علیہا السلام کو جب بیٹے کی بشارت ملتی ہے تو وہ متعجب ہوتی ہیں کہ بچہ کب پیدا ہوگا یا کس طرح ہوگا جب ابھی تک مرد کے ساتھ تعلق ہی نہیں ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں کو ایک ہی جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ جس طرح چاہتا ہے کرتا ہے یا جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔

حضرت مسیح کی بن باپ پیدائش اسلامی عقائد میں داخل نہیں۔ عیسائیت کا اصول ہے:

عیسائی حضرت مسیح کی پیدائش بن باپ مانتے ہیں اور مسلمان بھی عموماً ایسا ہی مانتے ہیں مگر عیسائیوں میں بھی ایسے لوگ ہیں جو بن باپ نہیں مانتے اور مسلمانوں میں بھی۔ ہاں ان دونوں میں ایک فرق ہے۔ اگر فی الواقع حضرت مسیح بن باپ پیدا نہیں ہوئے تو اس سے مسلمانوں کے کسی عقیدہ میں ذرہ بھر فرق نہیں آتا۔ کیونکہ ان کو بن باپ پیدا شدہ ماننا ان کے عقائد میں داخل نہیں۔ لیکن عیسائیت کی عمارت کی بنیاد ہی اکھڑ جاتی ہے۔ اگر یہ ثابت نہ ہو سکے کہ وہ بن باپ پیدا ہوئے تھے۔ کیونکہ اگر وہ باپ رکھتے تھے تو نہ روح القدس سے حضرت مریم حاملہ ہوئیں۔ نہ مسیح میں الوہیت تھی نہ کفارہ صحیح رہا۔ پس حضرت مسیح کا بن باپ پیدا نہ ہونا عیسائیت کو بیخ و بن سے اکھاڑتا ہے اور اسلام کا اس سے کچھ نہیں بگڑتا۔ ایک مسلمان حضرت مسیح کی نبوت کا اس صورت میں بھی قائل ہے کہ وہ بن باپ پیدا ہوئے ہوں اور اس صورت میں بھی کہ بن باپ پیدا نہ ہوئے ہوں۔ وہ صرف اس قدر دیکھ لے گا کہ قرآن کریم نے کیا فرمایا ہے یا نبی کریم ﷺ کی احادیث سے کیا ثابت ہے، اگر ان دونوں میں بن باپ پیدا ہونا مذکور ہو تو وہ مان لے گا ورنہ نہیں۔ نہ ہی اگر وہ بن باپ پیدا ہوئے ہوں تو اس سے ان کی کوئی فضیلت ان انبیاء پر ثابت ہوتی ہے جو باپ سے پیدا ہوئے۔ کیونکہ یوں تو حضرت آدم اور حوا بھی بن باپ پیدا ہوئے اور بائبل میں ملک صدق کا ذکر موجود ہے جو ''بے باپ بے ماں'' تھا۔ دیکھو [عبرانیوں: 3:7] تو اس صورت میں یہ تینوں حضرت مسیح سے بھی افضل ٹھہرے مگر یہ استدلال ہی غلط ہے کہ بن باپ پیدا شدہ انسان بڑا ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ایک **مسلمان یہ بھی نہیں مانتا کہ حضرت مریم علیہا السلام روح القدس سے حاملہ ہوئی تھیں**۔ اگر وہ بن باپ بھی پیدا ہوئے تو یہ محض ایک عجوبہ قدرت خالقیت ہے کہ حضرت مریم میں دونوں قسم کی طاقتیں رکھ دی تھیں بلکہ یہ معجزہ بھی کوئی نہیں اس لیے کہ معجزہ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس پر کسی کی شہادت ہو کوئی دیکھنے والا اس کا گواہ ہو مگر بغیر خاوند کے حمل ہونے کی گواہی سوائے مریم کے کوئی دوسرا دے ہی نہیں سکتا۔ یہ کرامت یا

معجزہ کیا ہوگا۔ پس ہم نے صرف اس قدر دیکھنا ہے کہ قرآن شریف یا احادیث نبوی سے اس بارہ میں کیا معلوم ہوتا ہے۔

نسل انسان کی پیدائش کے متعلق خدا کا بیان کردہ قانون:

اب اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ اس نے نسل انسانی کے لیے یہ قانون بنایا ہے: ﴿ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ﴾ [السجدة: 8:32] ''پھر اس کی نسل ایک نچوڑ سے ٹھہرائی (جو) کمزور پانی میں (آجاتا ہے)۔'' یعنی آفرینش اول کے بعد اس کی نسل کو نطفہ سے چلایا ہے اور فرماتا ہے: ﴿اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ﴾ [الدهر: 2:76] ہم انسان کو مرد و عورت کے ملے ہوئے نطفہ سے پیدا کرتے ہیں۔ پس جب تک اللہ تعالیٰ بالتصریح یہ نہ فرمائے کہ عیسیٰ کو ہم نے اپنے اس قانون کے خلاف یا الگ رنگ میں پیدا کیا تھا اس وقت تک یہی ماننا ہوگا کہ وہ اسباب جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیے وہ اسی رنگ کے تھے۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی قدرت پر کوئی سوال نہیں کہ اس کو ایسا کرنے کی قدرت ہے یا نہیں۔ اس کو بغیر باپ چھوڑ کر ماں باپ دونوں کے بغیر پیدا کرنے کی قدرت ہے۔ سوال صرف یہ ہے کہ قرآن شریف سے یا حدیث صحیح سے ثابت ہوتا ہے کہ اس نے حضرت عیسیٰ کو بغیر باپ کے پیدا کیا اور جب وہ خود ایک قانون بتاتا ہے تو جب تک خود ہی نہ فرمائے کہ فلاں معاملہ میں اس نے اس قانون کے خلاف اپنی قدرت کا اظہار کر دکھایا اس وقت تک خود بخود ہمارا کسی امر کو اس قانون کے خلاف سمجھ لینا جائز نہیں۔ پس اگر کوئی شخص قرآن کریم کے الفاظ سے یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کا بن باپ پیدا ہونا تسلیم کیا گیا ہے تو وہ ایسا مانے۔ میرے نزدیک یہ نتیجہ الفاظ قرآنی سے نہیں نکلتا۔ گو میں اس مسئلہ کو اس قدر اہمیت نہیں دیتا مگر تاہم میں سمجھتا ہوں کہ ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ نیک نیتی سے جو کچھ منشائے قرآن سمجھے اس کو ظاہر کر دے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو باپ والا یا بن باپ ماننے سے ہمارے دینی اعتقادات یا ہمارے عمل پر قطعاً کوئی اثر نہیں ہوتا۔

مس بشر:

کیا الفاظ ﴿لَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ﴾ سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ حضرت عیسیٰ بن باپ پیدا ہوئے۔ ﴿لَمْ يَمْسَسْنِيْ﴾ میں گزشتہ کا ذکر ہے کہ مجھے بشر نے نہیں چھوا؟ اس میں آئندہ کا کوئی ذکر نہیں۔ لیکن کہا جائے گا کہ ہر ایک عورت جانتی ہے کہ بیٹا خاوند سے ہوتا ہے۔ مریم کو یہ کہنے کی کیا ضرورت پیش آئی؟ یہ اس لیے کہ حضرت مریم علیہا السلام ہیکل میں رہتی تھیں اور انہیں ابھی علم بھی نہ تھا کہ ان کا نکاح ہونے والا ہے۔

توریت وانجیل کی تاریخی شہادت:

توریت وانجیل میں بے شک تحریف ہوئی لیکن آخر ان کی پیشگوئیوں میں بہت کچھ صداقت موجود رہی ہے۔ اسی طرح تاریخی واقعات میں جس بات کو قرآن کریم نہ جھٹلائے اس کے رد کرنے کی ہمارے پاس کوئی وجہ نہیں۔ اب اناجیل سے ثابت ہے کہ **حضرت مریمؑ کے ساتھ یوسف کا تعلق زوجیت کا تھا**۔ اور اسی تعلق سے آپ کے ہاں بہت سی اولاد بھی ہوئی۔

ذیل کی عبارتیں قابل غور ہیں:

''پس یوسف۔۔۔۔۔اپنی بیوی کو اپنے ہاں لے آیا اور اس کو نہ جانا جب تک وہ بیٹا نہ جنی۔'' [متی: 24:1, 25]

''جب وہ بھیڑ سے یہ کہہ رہا تھا تو دیکھو اس کی ماں اور بھائی باہر کھڑے تھے اور اس سے باتیں کرنی چاہتے تھے۔ کسی نے اس سے کہا دیکھ تیری ماں اور تیرے بھائی باہر کھڑے ہیں اور تجھ سے باتیں کرنی چاہتے ہیں۔''

[متی: 46:12, 47]

''کیا یہ بڑھئی کا بیٹا نہیں؟ اور اس کی ماں کا نام مریم اور اس کے بھائی یعقوب اور یوسف اور شمعون اور یہوداہ نہیں؟ اور کیا اس کی سب بہنیں ہمارے ہاں نہیں؟'' [متی: 55:13]

بہنوں کے لیے جمع کے صیغہ سے مفسرین بائبل نے یہ صاف استدلال کیا ہے کہ کم سے کم تین بہنیں آپ کی تھی۔ بعض مفسرین نے اس مصیبت کو یوں ٹالنا چاہا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ یہ یوسف کی پہلی بیوی کی اولاد تھی اور حضرت مریم علیہا السلام ان کی دوسری بیوی تھیں۔ مگر ایک طرف تعلق زوجیت کا حضرت مریم اور یوسف میں موجود ہونا خود اناجیل سے ظاہر ہے۔ دوسری طرف ماں کے ساتھ بھائیوں کا آنا صاف بتاتا ہے کہ یہ اسی ماں کی اولاد تھے۔ سوتیلے بھائی ہوتے تو مریم سے ان کا کیا تعلق تھا۔ تیسرے کہیں بھی سوتیلے بھائی کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا اور جب لفظ بھائی مطلقاً استعمال کیا جائے گا۔ تو اس سے مراد حقیقی بھائی لیا جائے گا۔ پس یہ انجیلی شہادت صاف بتاتی ہے کہ حضرت مریم کا تعلق زوجیت تو یوسف کے ساتھ ضرور ہوا اور اس تعلق سے اولاد بھی پیدا ہوئی اور اگر ایک طرف ﴿لَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ﴾ اس وقت کے بعد مس بشر سے مانع نہیں تو دوسری طرف تاریخی ثبوت کھلا کھلا موجود ہے کہ واقعی میاں بیوی کے تعلقات حضرت مریم اور آپ کے شوہر میں رہے۔

حدیث کی شہادت کہ حضرت مسیح معمولی حالات میں حمل میں آئے اور پیدا ہوئے:

﴿وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا﴾ [الأنبیآء: 91:21] ''اور وہ جس نے اپنی عصمت کو محفوظ کیا'' سے بھی اس کے خلاف دلیل نہیں پکڑی جاسکتی کیونکہ احصان کے معنی قید نکاح میں آنا ہے جیسا کہ اپنے موقعہ پر دکھایا جائے گا۔ حدیث ایک بھی ایسی نہیں ملتی کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہو کہ حضرت عیسیٰ بن باپ پیدا ہوئے بلکہ آپ کی جو گفتگو وفد نجران کے ساتھ لکھی ہے جس کو میں اوپر [نمبر: 368] میں نقل کر چکا ہوں۔ اس میں نبی کریم ﷺ کے یہ صاف الفاظ مروی ہیں: [اَلَسْتُمْ تَعْلَمُوْنَ اَنَّ عِيْسٰى حَمَلَتْهُ امْرَاَةٌ كَمَا تَحْمِلُ الْمَرْاَةُ] (روح المعانی: جلد3، صفحہ 75) کیا تم نہیں جانتے کہ عیسیٰ کو اس کی ماں نے حمل میں لیا جس طرح عورتیں بچوں کو حمل میں لیا کرتی ہیں۔ اور عورتیں بچوں کو اپنے خاوندوں سے ہی حمل میں لیتی ہیں بلکہ اس سے بھی بڑھ کر صفائی سے جب عیسائیوں نے یہ سوال کیا: [وَقَالُوْا لَهُ مَنْ اَبُوْهُ] یعنی اس کا باپ کون ہے؟ تو آپ نے یہ جواب نہیں دیا کہ اس کا باپ کوئی نہیں بلکہ جواب میں فرمایا: [اَلَسْتُمْ تَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ لَا يَكُوْنُ وَلَدٌ اِلَّا وَهُوَ يَشْبَهُ اَبَاهُ] کیا تم نہیں جانتے کہ کوئی بیٹا نہیں مگر وہ اپنے باپ سے مشابہ ہوتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ نے یہ بتادیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا باپ انسانوں میں سے ہی کوئی ہے کیونکہ اس کی شکل انسانوں سے ملتی ہے۔ اگر آنحضرت ﷺ نے اس بات کو ظاہر کرنا ہوتا کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوا تو جیسا کہ اکثر مفسرین نے لکھا ہے یوں فرماتے کہ وہ آدم کی طرح بن باپ ہے یا کلمہ کن سے پیدا ہوا ہے۔ پس یہ تمام امور اس بات پر دلیل ہیں کہ قرآن کریم حضرت عیسیٰ کی پیدائش بن باپ بیان نہیں کرتا

وَ يُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ ﴿۴۸﴾ | اور وہ اسے کتاب اور حکمت اور تورات اور انجیل سکھائے گا۔(428)

وَ رَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ اَنِّيْ قَدْ | اور وہ بنی اسرائیل کی طرف رسول ہوگا(429) کہ میں

اور ﴿وَّ لَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ﴾ آئندہ مس بشر سے مانع نہیں ہوا۔

428- ﴿وَ يُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ﴾ یہ کس پر عطف ہے؟ کسی نے کہا کہ ﴿يُبَشِّرُكِ﴾ پر عطف ہے۔ بعض نے کہا آیت سابقہ میں يَخْلُقُ پر عطف ہے یعنی ﴿كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ﴾ ﴿وَ يُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ﴾ ۔۔۔۔ مگر صحیح یہ ہے کہ یہ جملہ مستأنفہ ہے اور واوٗ استئناف کے لیے ہے جو ابتدائے کلام میں آجاتی ہے گویا یہ الگ کلام ہے۔

اَلْكِتَابُ سے یہاں مراد کتابت ہے یعنی ہاتھ سے لکھنا۔ (ر۔ش) حکمت کے معنی بھی پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ یہاں حضرت عیسیٰ کو چار چیزوں کے سکھانے کا ذکر فرمایا ہے۔ تعلیم کے معنی [نمبر: 81] میں بیان ہو چکے ہیں۔ جہاں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا انسان کو علم دینا دو طرح پر ہوتا ہے۔ ایک جو بذریعہ وحی دیا جاتا ہے۔ دوسرا جو اِن ذرائع سے انسان حاصل کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسے دیئے ہیں۔ اس طرح پر انبیاء کو بھی علم حاصل ہوتا ہے۔ یہاں کس قسم کی تعلیم مقصود ہے۔ بعض نے کہا بذریعہ وحی، بعض نے کہا بذریعہ توفیق وہدایت جو علم حاصل کرنے کے لیے دے دی۔ مگر صورت اول صحیح نہیں اس لیے کہ کتابت یعنی لکھنے کا علم تو معمولی طور پر حاصل کیا جاتا ہے اور اسی طرح توریت کا علم بذریعہ استاد کے حضرت مسیح نے حاصل کیا۔ جیسا کہ بعض روایات سے ثابت ہے۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ کتاب سے مراد جنس کتب الٰہی ہو۔ تو اس صورت میں کتاب اور حکمت اور توریت و انجیل کا علم دینے سے مراد ان کا فہم بذریعہ وحی خفی دینا مراد ہو۔ اس میں بھی کوئی حرج نہیں کہ ان چار چیزوں کا علم الگ الگ طریق پر دیا گیا ہو یعنی کتابت اور توریت کا علم تو اسباب معمولی سے ہوا اور حکمت یعنی فہم اور انجیل کا علم بذریعہ وحی دیا گیا ہو۔

429- ﴿وَ رَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾ اس کو يُعَلِّمُهُ پر عطف قرار دے کر يَجْعَلُهُ مقدر مانا گیا ہے یعنی [وَيَجْعَلُهُ رَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَاءِيْلَ] اور اللہ تعالیٰ اسے بنی اسرائیل کی طرف رسول بنائے گا اور وہ یوں یوں کہے گا۔ مگر اس کے بعد جو کچھ ذکر کیا گیا ہے وہ صاف بتاتا ہے کہ یہ حضرت مسیح علیہ السلام اپنی قوم سے خطاب کررہے ہیں۔ چنانچہ ان سب اقوال کے بعد ﴿فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ﴾ ہے جس سے صاف معلوم ہوا کہ درمیان میں سے ان تمام واقعات کو جو حضرت مریم علیہا السلام کے آپ کو حمل میں لینے، جننے، آپ کے بلوغ روحانی کو پہنچنے وغیرہ کے متعلق ہیں ترک کردیا گیا (اور بعض ان واقعات کا ذکر سورہ مریم میں جو اس سے پہلے کی نازل شدہ ہے آبھی چکا ہے) اور اس زمانہ کا ذکر شروع کردیا ہے، جب حضرت عیسیٰ کو بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا۔ اور تقدیر عبارت یوں سمجھی جائے گی [وَ جَعَلَ رَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَاءِيْلَ] یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب پیدا ہو کر بلوغ روحانی کو پہنچے تو انہیں بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا۔ اسی

وقت کو دیکھ کر بعض مفسرین نے بھی ﴿فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ﴾ کے نیچے لکھ دیا ہے کہ ﴿رَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾ سے نیا کلام شروع ہوتا ہے جو کلام ملائکہ میں داخل نہیں اور تقدیر عبارت یوں نکالی ہے: [فَجَاءَ عِيْسٰى كَمَا بَشَّرَ اللّٰهُ تَعَالٰى رَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَاءِيْلَ] یعنی جب عیسیٰ آ گئے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے بشارت دی تھی درآنحالیکہ وہ رسول تھے بنی اسرائیل کی طرف۔

اس موقعہ پر قرآن کریم نے یہ بھی فیصلہ کر دیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اصل میں صرف قوم اسرائیل کی طرف رسول تھے۔ جس زمانہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اس وقت عیسائی مذہب بہت سی قوموں میں پھیلا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ عیسائی بعض اقوام عرب کو بھی عیسائی کر چکے تھے اور باقی کو کرنے کی کوشش میں تھے۔ پس کوئی شخص عیسائی مذہب کی حالت کو دیکھ کر ہرگز یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام صرف بنی اسرائیل کی طرف رسول ہو کر آئے۔ لیکن جب اصلیت پر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اصل پیغام حضرت مسیح کا بنی اسرائیل تک ہی محدود تھا۔ چنانچہ متی میں ذیل کا قصہ جو ایک کنعانی عورت کے متعلق لکھا ہے صاف اسی نتیجہ پر پہنچاتا ہے:

> ''اور دیکھو ایک کنعانی عورت ان سرحدوں سے نکلی اور پکار کر کہا اے خداوند ابن داؤد مجھ پر رحم کر۔۔۔۔۔ اس نے جواب میں کہا کہ میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا۔ مگر اس نے آ کر اسے سجدہ کیا اور کہا: اے خداوند! میری مدد کر، اس نے جواب میں کہا کہ لڑکوں کی روٹی لے کر کتوں کو ڈال دینی اچھی نہیں۔ اس نے کہا ہاں خداوند کیونکہ کتے بھی ان ٹکڑوں میں سے کھاتے ہیں جو ان کے مالکوں کی میز سے گرتے ہیں۔ اس پر یسوع نے جواب میں اس سے کہا اے عورت تیرا بڑا ہی ایمان ہے جیسا چاہتی ہے تیرے لیے ویسا ہی ہو۔'' [متی: 15, 22-28]

اب اس واقعہ سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت مسیح سوائے بنی اسرائیل کے ''اور کسی کے پاس'' نہیں بھیجے گئے۔ ہاں دوسروں پر وہ اتنے مہربان ہو سکتے ہیں کہ جو روٹی بچے نہ کھائیں وہ کتوں کے آگے پھینک دی جائے۔ اس لیے جب یہودیوں نے آپ کے پیغام کو رد کر دیا تو دوسری قوموں کو معلوم ہوتا ہے اسی حیثیت سے جس کا اوپر ذکر ہوا حضرت مسیح کے حواریوں نے داخل کر لیا۔ چنانچہ پولوس کی تقریروں سے اس بات کا ثبوت بھی ملتا ہے کہ جب یہودیوں کی طرف سے مایوسی ہو گئی تو پھر دوسری قوموں کی طرف رخ شروع ہوا۔ مگر حضرت مسیح کا پیغام بلاشبہ فی الاصل صرف بنی اسرائیل تک محدود تھا۔ جب مذہب نے ایک دوسرا رنگ اختیار کر لیا اور اس کو بت پرستوں کی قبولیت کے قابل بنا دیا گیا۔ کیونکہ بت پرستی سے ملتے جلتے عقائد اس میں داخل ہو گئے تو پھر سارا رخ دوسری اقوام کی طرف ہو گیا۔

اور ایک امر جس کا یہ آیت فیصلہ کرتی ہے یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام امت محمدیہ کی اصلاح کے لیے نہیں آ سکتے۔ نہ ہی دین اسلام کی توسیع تمام اقوام میں ان کا کام ہو سکتا ہے اگر انہوں نے امت محمدیہ کے لیے بھی رسول ہونا ہوتا تو قرآن کریم میں یہ لفظ جو ان کے کام کی صریح حد بندی کرتے ہیں وارد نہ ہوتے۔ پس جس شخص پر یہ حکم لگ چکا ہے کہ وہ صرف بنی اسرائیل کے لیے رسول

جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّيْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ

تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک بات لایا ہوں(430) کہ میں تمہارے لیے کیچڑ سے پرند کی شکل کی مانند تجویز کرتا ہوں(431) پھر اس کے اندر پھونکتا

ہوگا۔اس کا ساری دنیا کی طرف رسول بننا محال ہے۔مسلمانوں کو آنحضرت ﷺ کے بعد کسی دوسرے نبی سے مستغنی کرنے کے لیے ہی یہ کلمات سکھائے تھے: [رَضِيتُ بِاللهِ رَبًّا، وَبِالْإِسْلَامِ دِينًا، وَبِمُحَمَّدٍ ﷺ نَبِيًّا] (صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب اسْتِحْبَابِ الْقَوْلِ مِثْلَ قَوْلِ الْمُؤَذِّنِ لِمَنْ سَمِعَهُ ثُمَّ يُصَلِّي عَلَى النَّبِيِّ: 877) محمد ﷺ کے بعد جو كَآفَّةَ النَّاسِ کی طرف مبعوث ہو گئے اور جن کا زمانہ نبوت قیامت تک ممتد ہے کسی دوسرے رسول یا نبی کا محتاج اپنے آپ کو سمجھنا اس نعمت عظمیٰ کی ناشکر گزاری ہے۔پس حدیث میں جو ابن مریم کے آنے کی پیشگوئی ہے اس کے معنی صرف یہی ہو سکتے ہیں کہ اس امت میں سے کوئی شخص ابن مریم کے رنگ میں آجائے جس طرح الیاس کے دوبارہ آنے کی پیشگوئی یوں پوری ہوئی کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام الیاس علیہ السلام کے رنگ میں آگئے [دیکھو نمبر: 414]۔حضرت عیسیٰ کو قرآن کریم کی یہ تصریح امت محمدیہ میں آنے سے روکتی ہے۔

430- ﴿اَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ﴾ بعض نے یہاں مُخْبِرًا یا نَاطِقًا مقدر سمجھا ہے۔مگر خود لفظ رسول میں پیغام کا مفہوم پایا جاتا ہے اس لیے جب رسول بنائے جانے کا ذکر آیا تو ساتھ ہی جو کچھ اس رسول کی بعثت کا عظیم الشان مقصد تھا وہ ظاہر کر دیا اور وہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک عظیم الشان بات لائے ہیں۔

431- اَخْلُقُ۔ خَلَقَ کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 33]۔ [وَالْخَلْقُ لَا يُسْتَعْمَلُ فِيْ كَافَّةِ النَّاسِ إِلَّا عَلٰى وَجْهَيْنِ أَحَدُهُمَا فِيْ مَعْنَى التَّقْدِيْرِ ..... وَالثَّانِي فِي الْكِذْبِ]۔ (غ) اور **کل لوگوں کے حق میں لفظ خَلَقَ** صرف دو معنی میں بولا جاتا ہے ایک اندازہ کرنے کے معنی میں اور دوسرا جھوٹ کے معنی میں۔اندازہ کے معنی کی مشہور مثال شاعر کا قول ہے: [وَلَا اَنْتَ تَفْرِيْ مَا خَلَقْتَ وَ بَعْضُ الْقَوْمِ يَخْلُقُ ثُمَّ لَا يَفْرِيْ] یعنی تو جو ارادہ یا اندازہ یا تجویز کرتا ہے اسے کر گزرتا ہے اور عمل میں لے آتا ہے۔لیکن بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو تجویزیں تو کرتے رہتے ہیں مگر ان کو عمل میں نہیں لاتے۔اسی طرح ضرب المثل ہے: [مَا خَلَقْتُ اِلَّا فَرَيْتُ وَمَا وَعَدتُّ اِلَّا وَفَيْتُ] یعنی میں نے کوئی تجویز نہیں کی مگر اسے عمل میں لا کر دکھایا اور میں نے کوئی وعدہ نہیں کیا مگر اسے پورا کر دکھایا۔جھوٹ کے معنی میں ﴿تَخْلُقُوْنَ اِفْكًا﴾ [العنكبوت: 17:29] ''جھوٹ بناتے ہو۔'' قرآن شریف میں آیا ہے ﴿اَحْسَنَ الْخَالِقِيْنَ﴾ [المؤمنون: 14:23] ''(جو) سب بنانے والوں سے بہتر (ہے)۔'' کے صحیح معنی اَحْسَنُ الْمُقَدِّرِيْنَ ہی ہیں کیونکہ جہاں یہ لفظ آتا ہے وہاں وقتاً بعد وقت مختلف حالتوں میں انسان کے رہنے کا سوال ہے یعنی حالت نطفہ، حالت علقہ، حالت مضغہ وغیرہ اور صحیح یہی ہے کہ **خلق کا لفظ پیدا کرنے کے معنی میں سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی دوسرے پر بولنا جائز نہیں**۔گو بعض نے یہ کہہ دیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے

فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے اڑنے والا ہو جاتا ہے۔(432)

لیے یہ لفظ بولا گیا ہے۔ مگر جیسا کہ میں آگے چل کر ثابت کروں گا، قرآن کریم اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔ اور یہ کہنا کہ چونکہ یہاں لفظ مِنَ الطِّيْنِ موجود ہے اس لیے مادہ سے خلق کرنے میں اللہ تعالیٰ کی صفت خلق سے امتیاز ہو گیا یہ بھی درست نہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ بھی دونوں طرح خلق کرتا ہے مادہ سے بھی اور بغیر مادہ بھی۔ جیسے کہ [نمبر: 33] میں دکھایا گیا۔ بیضاوی نے ﴿اَخْلُقُ لَكُمْ﴾ کے معنی کیے ہیں اُقَدِّرُ لَكُمْ اور یہی درست ہے۔

لَكُمْ میں 'ل'' انتفاع کے لیے ہے اور مراد ہے تمہاری بھلائی کے لیے۔

اَلطِّيْن۔ طِيْنٌ اس مٹی کو کہتے ہیں جس میں پانی ملا ہوا ہو۔ اور اگر اس سے پانی کا اثر جاتا بھی رہے تو بھی اس کو طین ہی کہا جاتا ہے۔ (غ) قرآن کریم میں خلق انسان کو طین سے قرار دیا گیا ہے۔ بالمقابل وہ ہستیاں جو جن کے نام سے موسوم ہیں ان کی پیدائش نار یعنی آگ سے بتائی گئی ہے۔ بہ نسبت دوسرے عناصر کے طین یا مٹی میں اثر کی قبولیت کی استعداد بہت زیادہ ہے۔

هَيْئَةٌ۔ هَيْئَةٌ اس حالت کا نام ہے جس پر کوئی چیز خواہ وہ حالت محسوس ہو یا معقول۔ (غ) یعنی حواس سے اس کا علم حاصل ہوتا ہو یا عقل سے۔ اسی مادہ سے ہے: ﴿وَّ هَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا﴾ [الكهف: 10:18] ''اور ہمارے کام میں ہمارے لیے بھلائی مہیا کر دے۔'' ﴿وَ يُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا﴾ [الكهف: 16:18] ''اور تمہارے کام میں سہولت مہیا کر دے۔''

اَلطَّيْرُ۔ طائر ہر ایک جانور کو کہتے ہیں جو پر رکھتا ہے اور ہوا میں اڑتا ہے اور طائر بمعنی عمل بھی قرآن مجید میں آیا ہے: ﴿وَ كُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ﴾ [بنی إسرائيل: 13:17] ''اور ہر انسان کے عملوں کو ہم نے اس کی گردن میں ڈالا۔'' (غ) اور طائر انسان کا وہ حظ ہے جو علم الٰہی میں اس کے لیے مقدر ہو [مَا حَصَلَ لَهُ فِيْ عِلْمِ اللّٰهِ مِمَّا قُدِّرَ لَهُ]۔ (ن) اور طَيْرٌ۔ طَائِرٌ کی جمع ہے اور واحد پر بولا جاتا ہے۔ (ل) اور طَيْرٌ کی جمع طُيُوْرٌ آتی ہے اور حدیث میں آتا ہے: [اَلرَّؤْيَا لِاَوَّلِ عَابِرٍ وَ هِيَ عَلٰى رَجُلِ طَائِرٍ] جہاں طائر کی تشریح یوں کی گئی ہے: [كُلُّ حَرْكَةٍ مِنْ كَلِمَةٍ اَوْ جَارٍ يَجْرِيْ فَهُوَ طَائِرٌ مَجَازًا اَرَادَ عَلٰى رِجْلِ قَدْرٍ جَارٍ وَ قَضَاءِ مَاضٍ مِنْ خَيْرٍ أَوْ شَرٍّ]۔ (ل) یعنی ہر ایک حرکت کسی کلام کی یا کسی جاری ہونے والے امر کی مجازاً طائر ہے اور حدیث میں [عَلٰى رِجْلِ طَائِرٍ] کہنے سے منشا یہ ہے کہ وہ ایک ایسے قدر یا انداز کے جو چلا جا رہا ہو اور ایسی قضاء کے جو گزر رہی ہو پاؤں پر ہے۔ قرآن کریم اور حدیث سے یہ مثالیں طائر کے معنی پر یہ دکھانے کے لیے بیان کی گئی ہیں کہ مجازاً اس لفظ کا استعمال ایسے معنوں پر کیا گیا ہے جو پہلے لغت میں موجود نہ تھے۔

432- اَنْفُخُ۔ نَفَخَ کے معنی پھونکنا ہیں۔ روح کے ساتھ بھی یہی لفظ نَفَخَ آتا ہے جیسے آدم کے متعلق ﴿وَ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ﴾ [الحجر: 28:15] ''اور اپنی روح اس میں پھونکوں۔'' ہر انسان کے متعلق ﴿وَ نَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ﴾ [السجدة: 9:32]

''اور اپنی روح اس میں پھونکی۔'' مریم کے متعلق ﴿فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا﴾[الأنبیآء: 91:21] ''سو ہم نے اپنا کلام اس میں پھونکا۔'' مگر جہاں بغیر روح کے لفظ نَفَخْ آیا ہے وہاں نفخ روح مراد نہیں بلکہ محض پھونکنا ہے خواہ حقیقی طور پر ہو یا بطور استعارہ جیسے: ﴿قَالَ انْفُخُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا﴾[الکھف: 96:18] ''کہا دھونکو، یہاں تک کہ جب اسے آگ (کی طرح) کر دیا۔'' جہاں آگ پر پھونکنا یا آگ کا جلانا مراد ہے۔ یا ﴿نُفِخَ فِي الصُّوْرِ﴾ میں جہاں بگل میں پھونکنا یا بگل بجانا مراد ہے اور لفظ نَفَخْ کا استعمال بطور حقیقت و بطور استعارہ احادیث میں بھی ہوا ہے۔ [اَنَّهٗ نَهٰى عَنِ النَّفْخِ فِي الشَّرَابِ] **پانی میں پھونک مارنے سے آپ نے منع فرمایا۔** کیونکہ اس کے اندر تھوک پانی کے اندر جاتا ہے اور کراہت کا موجب یا بعض امراض کا موجب ہوتا ہے اور ایک حدیث میں آتا ہے [أَعُوذُ بِاللهِ مِنْ نَفْخِهِ وَنَفْثِهِ] **جہاں نَفَخْ سے مراد شیطان کا حقیقی طور پر پھونکنا نہیں بلکہ روح شیطانی کا انسان کے اندر** آجانا ہے۔ اور وہ روح شیطانی استکبار ہے۔ چنانچہ نَفْخِهِ کی تشریح شارحین حدیث نے كِبْرُهٗ کی ہے۔ (ن) یعنی استکبار شیطانی۔ چونکہ لفظ نَفَخْ کے ساتھ روح نہیں اس لیے نفخ روح یہاں مراد لینا صحیح نہیں۔ یہ اسی قسم کا مگر پاک نَفَخْ ہے جیسے حدیث میں ایک نَفَخْ کا ذکر ہے گو وہ ناپاک شیطانی نَفَخْ ہے۔ شیطان کا نَفَخْ کرنا اپنی ناپاکی یا کبر کا دوسرے میں پھونکنا ہے اور نبی کا نَفَخْ کرنا اپنی پاکیزگی یا فرمانبرداری کا دوسرے میں نَفَخْ کرنا ہے۔

﴿بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ اِذْنٌ کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 123] گو اذن میں مشیت پائی جاتی ہے۔ مگر مشیت سے اس صورت میں کیا مراد ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ انسان کے ایمان لانے پر بھی باذن اللہ بولا گیا ہے جیسے: ﴿وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾[یونس: 100:10] ''اور کسی شخص کے لیے نہیں کہ سوائے اللہ کے اذن کے ایمان لائے۔'' اور نیکی میں ترقی کرنے پر بھی ﴿وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾[فاطر: 32:35] ''اور کوئی ان میں سے اللہ کے حکم سے نیکیوں میں سبقت کرنے والا ہے۔'' مشیت کے ہونے سے جیسا کہ راغب نے لکھا ہے مراد یہی ہے کہ چونکہ انسان کے قویٰ کا پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے پس جو کچھ اثر وہ قویٰ قبول کرتے ہیں وہ بھی باذن اللہ ہی ہوتا ہے۔ اس لیے جب ظالم کسی پر ظلم کرے اور اس کو دکھ پہنچے تو اس پر بھی باذن اللہ کہہ دیا جائے گا۔ گو اس کا یہ منشا نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس پر راضی ہوتا ہے کہ ایسا ہو۔ پس باذن اللہ سے یہ نتیجہ نکالنا کہ کوئی خاص امر ہے جو اصل میں اللہ تعالیٰ ہی کرتا تھا مگر حضرت مسیح کو اس نے اپنی طرف سے اجازت دے دی تھی اور اس لیے اس صفت میں وہ اللہ تعالیٰ کی خاص اجازت سے شریک ہو گئے درست نہیں۔ اذن کے لیے مشیت ضروری ہے اور اس کی مشیت کے یہ خلاف ہے کہ اس کی مخلوق اس کی کسی صفت میں کامل طور پر شریک ہو۔

مفسرین کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام واقعی پرند بنایا کرتے تھے اور مشہور یہ ہے کہ آپ نے سوائے چمگاڈر اور کوئی جانور پیدا نہیں کیا۔ (ر) اب یہاں آکر دو گروہ ہو گئے ہیں۔ ابن جریر کی ایک روایت میں تو ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام لڑکوں کے ساتھ کھیلتے تھے تو آپ نے کچھ گیلی مٹی لے کر کہا کہ میں اس سے پرندہ بنا دوں۔ تو انہوں نے کہا کیا تم ایسا کر سکتے ہو؟ عیسیٰ نے کہا ہاں۔ تب عیسیٰ نے ایک پرندہ کی شکل بنا کر اس میں پھونکا تو وہ پرندہ بن گیا۔ اور دوسری روایت کی رو سے یہ ایک اقتراحی معجزہ تھا اور بنی اسرائیل نے کہا تھا کہ چمگاڈر بنا کر بتاؤ تب ہم ایمان لائیں گے۔ اس لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے چمگاڈر کو

بنایا۔ مگر تعجب یہ ہے کہ اقتراحی معجزہ دیکھ کر بھی ایمان نہ لائے۔ حالانکہ دوسری طرف یہ بھی مذہب ہے کہ اقتراحی معجزات نہیں دکھائے جاتے۔ لیکن وہب کہتے ہیں: [كَانَ يَطِيْرَ مَا دَامَ النَّاسُ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْهِ فَاِذَا غَابَ عَنْ اَعْيُنِهِمْ سَقَطَ مَيِّتًا لِتُمَيِّزَ عَنْ خَلْقِ اللّٰهِ تَعَالٰى بِلَا وَاسِطَةٍ](روح المعانی:جلد3، صفحہ 168) (ر) یعنی وہ اڑتا تھا جب تک لوگ اسے دیکھتے رہتے تھے۔ جب نظر سے غائب ہوجاتا تو مردہ ہوکر گر جاتا تاکہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق بلاواسطہ میں اور اس خلق میں تمیز رہے۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ جب نظر سے غائب ہوکر گرا تو تمیز کہاں رہی۔ لوگوں کے نزدیک تو خدا کی خلق میں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خلق میں کوئی تمیز نہ رہی۔ پھر اگر یہ بچپن کا قصہ ہے تو معلوم نہیں بچپن میں جب ابھی دعویٰ نبوت نہیں اس معجزہ کو دکھانے سے حاصل کیا۔ اور معجزہ دکھایا بھی ہم عمر لڑکوں کو جاتا ہے۔ اب اگر حضرت عیسیٰ فی الواقع پرند بناتے تھے تو وہ دو حال سے خالی نہیں یا تو وہ پرند دوسرے پرندوں کی طرح جاندار بن کر ان میں مل جاتے ہوں گے اور یا محض پرندوں کی شکل تو بن جاتی ہوگی مگر ایک تماشہ کے طور پر ان کا اڑنا ایک آنی نظارہ ہوگا۔ اور پھر وہ مٹی کی مٹی رہ جاتی ہوگی۔ اس دوسرے خیال کی تائید میں وہب سے روایت ہے اور اسی کو حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی مجدد **صدی چہاردہم** نے بھی قریب قریب تسلیم کیا ہے۔ اب ہم اس کو ایک اصول کے ماتحت لاکر محکمات اور متشابہات کے قانون کے رنگ میں اس پر بحث کرتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ کیا کوئی شخص فی الواقع خدا کی مخلوق جیسی مخلوق بنا سکتا ہے گو وہ خدا کے اذن سے ہی ایسا کرے اور گو وہ نبی ہو اور یہ امر بطور ایک اعجاز کے ہو۔ اب جب ہم قرآن کریم کو دیکھتے ہیں تو خلق بمعنی پیدا کرنا صرف ذات باری کا خاصہ قرار دیا گیا ہے خواہ وہ خلق مادہ سے ہو یا بغیر مادہ۔ اس کے ثبوت میں اول یہ آیت ہے: ﴿اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ﴾[الرعد: 16:13] ''کیا انہوں نے اللہ کے کوئی ایسے شریک بنائے ہیں جنہوں نے (کچھ) پیدا کیا ہو۔'' جس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ اپنا ایک عام قانون بیان فرماتا ہے۔ ﴿قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ﴾ یعنی نہ صرف یہی غلط ہے کہ معبودان باطل نے کسی چیز کو پیدا کیا ہو۔ پھر وہ دونوں قسم کی مخلوق مل جل گئی ہو بلکہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی کسی چیز کا خالق نہیں۔ دوسری جگہ فرماتا ہے: ﴿خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا﴾ [الفرقان: 2:25] اسی نے ہر ایک چیز کو پیدا کیا۔ پھر اس کے لیے ایک قانون اور ایک حد بست مقرر کردی۔ پھر فرمایا: ﴿رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى﴾[طٰہٰ: 50:20] ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر ایک چیز کو اس کی پیدائش بھی عطا فرمائی پھر اس کو اس کا کمال حاصل کرنے کی راہ بھی بتائی۔ اور اس سے بڑھ کر ان لوگوں کے متعلق جن کو خدا بنالیا گیا ہے اور بھی صراحت فرمائی۔ جیسا کہ سب سے پہلی آیت میں ایسا ہی فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ۝ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ ۚ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۙ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ۝﴾[النحل: 16:20-21] ''اور وہ لوگ جنہیں (یہ کافر) سوائے اللہ کے پکارتے ہیں وہ کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے بلکہ وہ خود مخلوق ہیں اور وہ سب فوت بھی ہو چکے ہیں کوئی بھی ان میں سے زندہ نہیں اور ان کو یہ بھی معلوم نہیں کہ کب دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔'' اسی کے مطابق سورہ فرقان میں فرمایا۔ پس اللہ تعالیٰ نے خلق یا پیدا کرنے کے متعلق اپنا قانون اصولی رنگ میں یہ بیان فرمایا کہ ہر چیز کا خالق اللہ ہی ہے اور کہ اللہ کے سوائے کوئی خالق نہیں۔ اور جن لوگوں کو معبود بنایا گیا ہے انہوں نے کوئی خلق نہیں کی اور ایسا کبھی ہو نہیں سکتا کہ

انسان کی بنائی ہوئی چیز اور خدا کی خلق کی ہوئی چیز ایسی مل جل جائیں کہ ان میں امتیاز نہ رہے۔ ایسا ہی فرمایا: ﴿اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ﴾ [النحل: 17:16] ''کیا جو خلق کرتا ہے وہ اس جیسا ہوسکتا ہے جو خلق نہیں کرتا؟'' اب اگر مسیح کا خلق طیور مانا جائے تو مسیح مَنْ يَّخْلُقُ ہونے کی وجہ سے انسانوں جیسا نہ ہوا بلکہ خدا جیسا ہوا۔ تو چونکہ قرآن کریم میں اختلاف نہیں ہے: ﴿لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا﴾ [النسآء: 82:4] غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو اختلاف ہوتا۔ اس لیے یہ کسی صورت میں قابل تسلیم نہیں کہ بار بار یہ قانون باندھ کر کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی کسی چیز کا خالق نہیں اور پھر یہ بتا کر کہ جن لوگوں کو معبود بنایا گیا انہوں نے ہرگز ہرگز کسی چیز کو پیدا نہیں کیا۔ پھر خود ہی یہ کہہ دے کہ مسیح نے بھی کچھ پرند پیدا کیے تھے۔ اس طرح پر صورت اول یعنی مسیح کا سچ مچ کے پرند بنا دینا جن پر ظاہری لغوی معنی کی رو سے لفظ طیر کا صادق آسکے باطل ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ محکمات قرآنی اور تصریحات کلام ربانی کے خلاف ہے اور یہ اس کا جواب نہیں ہوسکتا کہ حضرت مسیح خدا کے اذن سے خلق کرتے تھے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنی صفات کے خلاف اذن نہیں دیتا۔ جب خلق کو اس نے اپنی صفات خاص میں بیان فرمایا ہے جس میں مخلوق کسی صورت میں شریک نہیں ہوسکتی تو اس کے خلاف اذن دینا گویا اپنی صفت کو ہی باطل کرنا ہے۔

طیر کی توجیہ کہ وہ جلد مٹی ہوجاتے تھے:

اب دوسری صورت یہ ہے کہ جو کچھ حضرت مسیح بناتے تھے وہ اصلی اور حقیقی پرند تو نہ تھے بلکہ محض پرند کی شکل ہوتی تھی جیسے مٹی کے کھلونے پرندوں کی شکل کے بنائے جاتے ہیں۔ بال و پر روح وغیرہ ان کے اندر کچھ چیز نہ تھی جس کی وجہ سے حقیقی طور پر لفظ پرند یا طیر کا ان کے لیے استعمال ہوسکے جیسے مٹی کے کھلونے پرندوں وغیرہ کی شکل میں بنے ہوئے بازار میں ملتے ہیں ایسے ہی وہ بھی ہوں گے۔ اور حضرت مسیح کے نفخ سے صرف ایک آنی نظارہ ان کے پرواز کا نظر آجاتا ہوگا جیسا کہ وہب نے بیان کیا ہے۔ تو اس صورت میں گو تشابہ فی الخلق واقع نہ ہونے کی وجہ سے محکمات مذکورہ بالا کے خلاف تو یہ امر نہیں ٹھہرتا مگر اس صورت میں اول تو لفظ طَيْرٌ کا استعمال مجاز کے رنگ کا ہوا نہ حقیقت کے طور پر؛ کیونکہ وہ واقعی پرند نہ تھے بلکہ ان کی شکل پرند سے مشابہ تھی۔ اور باوجود لفظ طَيْرٌ کے مجازی معنی لینے کے اس میں اعجاز کا رنگ یا نبی کی شان کے شایان کوئی کام نہ رہا۔ بلکہ زیادہ تر ایک کھیل اور تماشہ کی صورت رہی اور نبی کی شان سے یہ امر بعید ہے کہ ان لوگوں کی طبائع کو جن کی اصلاح کے لیے وہ آتا ہے ایسے کھیلوں کی طرف متوجہ کرے۔ کیا اس سے کسی پر اتمام حجت ہوسکتا ہے یا کوئی غرض اصلاح نفوس کی پوری ہوسکتی ہے؟ نہ تو یہ فعل مخالف کے لیے مسکت ہوسکتا ہے اور نہ مسیح کے پیرو خود اس سے کوئی روحانی فائدہ حاصل کرسکتے ہیں۔

اب بحث مذکورہ بالا سے یہ تو عیاں ہے کہ طَيْرٌ کے ظاہری لغوی معنی پرند مفہوم آیت محکمات قرآنی کے خلاف ٹھہراتے ہیں۔ **پس یہاں مجاز اور استعارہ کے رنگ کا کلام ماننا لازمی ہے۔** اور جب قرآن کریم میں مجاز اور استعارہ بہت مقامات پر پایا جاتا ہے اور اصول یہی ہے کہ جب قرائن یا محکمات ظاہر معنی لینے کے مانع ہوں تو مجاز ماننا پڑتا ہے۔ تو یہاں مجاز ماننے پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا۔ اور وہب نے جو صورت پیش کی ہے وہ درحقیقت طَيْرٌ کے استعمال کو برنگ مجاز اور استعارہ ہی قرار دیتی ہے نہ بطور حقیقت۔ علاوہ ازیں یہ بھی یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ **حضرت مسیح علیہ السلام کے کلام میں مجاز اور استعارہ کا استعمال بہت پایا جاتا ہے۔** چنانچہ ایک دفعہ شاگردوں نے یہ اعتراض بھی کیا کہ آپ تمثیلوں میں لوگوں سے باتیں کرتے ہیں جو ان کی سمجھ میں

نہیں آتیں۔تو مسیح نے کہا:

''اس لیے میں ان تمثیلوں میں بات کرتا ہوں کہ وے دیکھتے ہوئے نہیں دیکھتے اور سنتے ہوئے نہیں سنتے۔''[متی: 12:13]

حالانکہ یہ بھی تمثیل ہی ہے۔پھر لکھا ہے کہ

''یہ سب باتیں یسوع نے ان جماعتوں کو تمثیلوں میں کہیں اور بے تمثیل ان سے نہ بولتا تھا تا کہ جو نبی نے کہا تھا پورا ہو کہ میں تمثیلیں لا کر کلام کروں گا۔''[متی: 13:34, 35]

پس یہ وجہ ہے کہ کیوں مسیح کا کلام اللہ تعالیٰ نے بھی تمثیل کے رنگ میں بیان فرمایا ہے۔اب اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قرآن کریم اور کتب مقدسہ نے جہاں اس رنگ کے مجاز کو استعمال کیا ہے وہاں عموماً صورت یہی ہے کہ وہ جسمانیات سے اکثر روحانیات کی طرف لے جاتے ہیں۔مثلاً زمین کے مردہ ہونے کا ذکر ہے تو مراد اس سے روحانی موت ہے۔اندھوں اور بہروں کا ذکر ہے تو مراد وہ لوگ ہیں جو اپنی آنکھوں اور کانوں سے کام نہیں لیتے۔بارش کا ذکر ہے تو مراد وحی الٰہی کا نزول ہے۔تاریکی کا ذکر ہے تو جہالت مراد ہے۔دن اور روشنی کا ذکر ہے تو نور اور ایمان مراد ہے۔اسی طرح چار پایوں سے کسی قوم کو مشابہت دی تو مراد فہم سے کام نہ لینا یا زمینی باتوں پر جھکے رہنا ہے۔کسی کو گدھا کہا تو مراد یہ ہے کہ جو کتابیں اس نے پڑھی ہیں وہ ایک بوجھ کے طور پر تو ہیں لیکن انسان جوان سے فائدہ حاصل کرتا ہے وہ نہ ہوا۔کسی قوم کو بندر بنایا تو مراد یہ ہے کہ وہ اچھے افعال کی نقل کرتے ہیں مگر حقیقت ان میں کوئی نہیں۔

طیر کے مجازی معنی: اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ طَیْرٌ کو جو امتیاز دوسرے جانداروں پر حاصل ہے وہ پرواز کرنا یا زمین سے اوپر اڑنا ہے۔پس جب طَیْرٌ کا لفظ کسی نبی کے کلام میں بطور استعارہ استعمال ہو جیسا کہ میں اوپر ثابت کر چکا ہوں کہ یہاں سوائے استعارہ ماننے کے چارہ نہیں تو استعارہ میں اصل ذکر اسی مابہ الامتیاز امر کا ہوگا۔یعنی زمین سے اوپر اٹھ کر پرواز کرنا۔جیسا کسی کے متعلق فرمایا:[اَخْلَدَ اِلَی الْاَرْضِ] وہ زمین کے ساتھ لگ گیا۔مراد یہ ہے کہ زمینی چیزوں کی طرف مائل ہو گیا اور اوپر کی طرف اس کی توجہ نہ ہوئی۔پس برنگ استعارہ یہاں طَیْرٌ سے مراد ایسے لوگ ہیں جو زمین اور زمینی چیزوں سے اوپر اٹھ کر خدا کی طرف پرواز کر سکیں اور یہ بات آسانی سے سمجھ میں بھی آسکتی ہے کہ کس طرح نبی کے نَفَخْ سے انسان اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ زمینی خیالات کو ترک کر کے عالم روحانیت میں پرواز کرے۔

طیر کا استعمال بطور مجاز قرآن وحدیث میں:

لفظ طَیْرٌ کے اس مجازی استعمال پر ممکن ہے بعض طبائع میں خلش پیدا ہو۔لیکن جب ظاہری معنی ممتنع ہوئے تو سوائے مجاز کے چارہ نہیں اور لفظ طَیْرٌ بطور مجاز قرآن کریم میں بھی استعمال ہوا ہے اور حدیث میں بھی۔تو ان حالات کے اندر اس آیت کے معنی کرنے میں سوائے اس مجاز کو ماننے کے اور کوئی چارہ نہیں۔اور پھر یہ معنی بھی نرے قیاس پر ہی مبنی نہیں، بلکہ احادیث میں جو شہداء کو اعلیٰ سے اعلیٰ مقام روحانیت پر پہنچ چکے ہیں طیر یعنی پرندوں سے مشابہت دی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ وہ بہشت میں

وَ اُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَ الْاَبْرَصَ وَ وَ اُحْيِ اور اللہ کے حکم سے شب کور اور پھلبہری والے کو اچھا کرتا ہوں(433)

سبز پرندوں کی شکل میں پھر رہے ہیں۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہے:[إِنَّ أَرْوَاحَ الشُّهَدَاءِ فِي أَجْوَافِ طَيْرٍ خُضْرٍ](روح المعانی:جلد15، صفحہ 160) شہیدوں کی روحیں سبز پرندوں کے پیٹوں میں ہیں۔اور ابن ماجہ میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی ہی روایت سے ہے:[أَرْوَاحَ الشُّهَدَاءِ عِنْدَاللهِ تَعَالٰى كَطَيْرٍ خُضْرٍ](سنن الدارمي، كتاب الجهاد، باب مَا يَتَمَنَّى الشَّهِيدُ مِنَ الرَّجْعَةِ إِلَى الدُّنْيَا: 2410) یعنی شہیدوں کی روحیں اللہ تعالیٰ کے ہاں سبز پرندوں کی طرح ہیں اور بعض روایات میں ہے کہ شہیدوں کی روحیں سبز پرندے ہیں اور بعض میں ہے کہ سفید پرندے ہیں۔

پس احادیث میں اس صراحت کے ہوتے ہوئے یہاں طیر یا پرندوں سے مراد شہداء کی قسم کے لوگ لینا یعنی ایسے لوگ جو عالم روحانیت میں پرواز کرنے والے ہوں یا سفلی تعلقات سے بلند پرواز کرتے ہوں عین مطابق منشائے قرآن کریم معلوم ہوتا ہے۔

اس استعارہ کو مدنظر رکھتے ہوئے باقی الفاظ کی تشریح میں کچھ مشکل باقی نہیں رہتی۔خلق کے معنی اندازہ کرنا نہ پیدا کرنا انسان کے لیے آتے ہیں۔ اور وہی یہاں مراد ہیں۔ طِیْن کا لفظ استعارہ کے رنگ میں فرمانبرداری کو چاہتا ہے گویا طینی مخلوق میں فرمانبرداری کی استعداد زیادہ ہے۔نَفْخ سے مراد نفخ روحانی ہونے پر بھی اوپر دلائل دی جا چکی ہیں۔ پس اب اس سارے کلام ﴿اَنِّیْۤ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّیْنِ كَهَیْـَٔةِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْهِ فَیَكُوْنُ طَیْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ سے مراد استعارہ کے رنگ میں یہ ہوئی کہ حضرت مسیح اپنے اس نفخ روحانی کا ذکر کرتے ہیں جس سے وہ استعدادیں جو طینی ہونے کی وجہ سے قبولیت کی استعداد زیادہ رکھتی ہیں۔ان کا وہ طیر کی ہیئت پر اندازہ کرتے ہیں اور ان کے اندر بلند خیالی پیدا کرنے کی تجویز کرتے ہیں اور زمین سے ان کے تعلقات کم کرنا چاہتے ہیں۔پس وہ ان کے اندر ایک نفخ روحانی کرتے ہیں۔ کیونکہ خدا کے نبی درحقیقت نفخ روحانی ہی کرنے آتے ہیں اور نفخ روحانی سے قابل استعدادوں کو اعلیٰ مقام پر پہنچا دیتے ہیں۔

433- اَكْمَهَ۔ سورج کے متعلق كَمِهَتْ کہا جاتا ہے تو مراد یہ ہوتی ہے کہ اس کے سامنے غبار آ گیا۔پس وہ تاریک ہو گیا۔اسی سے كَمِهَ بَصَرُهٗ ہے اور اَكْمَهُ اس اندھے کو بھی کہتے ہیں جو ماں کے پیٹ سے اندھا پیدا ہوا اور بعد میں جس کی بصارت پر تاریکی آ جائے اس کو بھی کہتے ہیں اور اس معنی میں یہ لفظ اشعار میں بہت آیا ہے اور ابن الاعرابی کہتے ہیں کہ اَكْمَهُ وہ ہے جو دن کو دیکھتا ہے اور رات کو نہیں دیکھتا۔(ل) اور روحانی رنگ میں ایسے لوگ جو سورج کی تیز روشنی میں تو حق کو دیکھ لیتے ہیں مگر ذرا سی مشکلات سامنے آتی ہیں تو کچھ نہیں دیکھتے۔

اَبْرَصُ۔ بَرَصٌ اس سفیدی کو کہتے ہیں جو جسم میں نمودار ہوتی ہے جسے پھلبہری کہا جاتا ہے اور روحانی رنگ میں ایسی بدی جو ظاہر میں نیکی معلوم ہو۔

حضرت مسیح کے کلام میں بیماریوں سے مراد روحانی بیماریاں ہیں:

حضرت مسیح کا معمولی بیماریوں کا علاج کرنا ان کی نبوت کے متعلق کوئی خاص امر نہیں۔ حالانکہ یہاں نشان کے طور پر اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور پھر یہاں کتاب اور حکمت اور توریت اور انجیل کے علم کے بعد ان باتوں کو بیان کیا گیا ہے جن میں خلق طیر اور اکمہ اور ابرص کے علاج کا ذکر ہے۔ حالانکہ یہ دونوں باتیں کتاب وحکمت اور توریت اور انجیل کی تعلیم سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں۔ کیونکہ حکمت سے مراد یہاں علم طب نہیں۔ بلکہ حقیقت تک پہنچنا اور اصل بات کا فہم حاصل کرنا ہے۔ پس قرینہ چاہتا ہے کہ یہاں روحانی بیماریوں کے علاج کا ذکر ہے کیونکہ تورات وانجیل روحانی بیماریوں کے علاج کے لیے نازل ہوئی تھیں نہ جسمانی بیماریوں کے علاج کے لیے۔ اور خود انجیل میں حضرت مسیح کے اقوال اسی کے مؤید ہیں۔ [متی: 13:15] میں یہودیوں کی حالت کا ذکر کرتے ہوئے حضرت مسیح فرماتے ہیں:

''کیونکہ اس قوم کا دل موٹا ہوا اور وے اپنے کانوں سے اونچا سنتے ہیں اور انہوں نے اپنی آنکھیں موند لیں تا ایسا نہ ہو کہ وے آنکھوں سے دیکھیں اور کانوں سے سنیں اور دل سے سمجھیں اور رجوع لاویں اور میں انہیں چنگا کروں۔''

اب یہاں سب روحانی حالت اور روحانی بیماریوں کا ذکر کر کے آخر پر یہ الفاظ ہیں کہ میں انہیں چنگا کروں گا جو ﴿اُبْرِئُ الْاَکْمَهَ وَ الْاَبْرَصَ﴾ کے بالکل مطابق ہے۔ اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ چنگا کرنے سے آپ کا منشا یہ تھا کہ روحانی بیماریوں سے شفا دوں۔ پھر [متی: 9-12] میں فرماتے ہیں: ''بھلے چنگوں کو حکیم درکار نہیں بلکہ بیماروں کو۔'' اب یہاں تینوں لفظ یعنی بھلے چنگے حکیم اور بیمار ظاہری معنی کے لحاظ سے استعمال نہیں کیے گئے۔ بلکہ روحانی صحت، روحانی طبیب اور روحانی بیمار مراد ہیں۔ پھر اس سے بھی بڑھ کر صفائی اس سوال وجواب سے معلوم ہوتی ہے جو [متی: 11:3-5] میں مذکور ہے جہاں یہ ذکر ہے کہ یوحنا نے دو آدمیوں کو مسیح کے پاس بھیجا تھا کہ دریافت کریں کہ وہ وہی مسیح ہے جس کی ان کو انتظار تھی۔ تو اس کے جواب میں حضرت مسیح نے یوں فرمایا:

''یسوع نے جواب میں انہیں کہا کہ جو کچھ تم سنتے اور دیکھتے ہو جا کے یوحنا سے بیان کرو کہ اندھے دیکھتے اور لنگڑے چلتے۔ کوڑھی پاک صاف ہوتے اور بہرے سنتے اور مردے جی اٹھتے ہیں اور غریبوں کو خوشخبری سنائی جاتی ہے۔''

اب ظاہر ہے کہ یہاں آخری فقرہ میں غریبوں سے مراد مال و دولت سے محروم نہیں بلکہ دل کے غریب ہیں اور خوشخبری کا لفظ گاسپل یا انجیل کا ترجمہ ہے اس ایک فقرہ نے درحقیقت پہلے تمام فقروں کے معنوں پر روشنی ڈال دی ہے کہ یہاں بھی مراد روحانی بیماریاں ہی ہیں۔ ورنہ جسمانی بیماریوں کے ذکر میں غریبوں کو انجیل کا سنایا جانا ایک بے معنی بات ہے۔ پس ان تمام حوالہ جات سے ثابت ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے اپنے کلام میں جیسا کہ وہ انجیل میں اب ملتا ہے بیماریوں کو شفا دینے سے مراد روحانی بیماریوں کا دور کرنا ہے۔

قرآن کریم میں بیماریوں اور شفا سے مراد:

اب ہم دوسری طرف قرآن کریم پر غور کرتے ہیں تو یہاں بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں روحانی بیماریوں کو شفا دینا ہی

الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَ اُنَبِّئُكُمْ بِمَا اور اللہ کے حکم سے مردوں کو زندہ کرتا ہوں(434) اور جو

نبیوں کا کام لکھا ہے۔ وہ جن اندھوں، بہروں اور گونگوں کو اچھا کرتے ہیں ان کے متعلق فرماتا ہے: ﴿فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَ لٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ﴾ [الحج: 46:22] آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ اندھے وہ دل ہیں جو سینوں کے اندر ہیں اور اسی نابینائی کا ذکر قرآن کریم بار بار فرماتا ہے: ﴿صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ﴾ [البقرة: 18:2] ''بہرے، گونگے، اندھے ہیں، سو وہ نہیں لوٹتے۔'' یہ ان کافروں کی حالت ہے جو انذار کی پروا نہیں کرتے۔ نہ باتیں سنتے ہیں، نہ ان پر غور کرتے ہیں، نہ منہ سے کلمہ حق کہتے ہیں، نہ خدا کے نشانات کو دیکھتے ہیں اس لیے حق کی طرف رجوع نہیں کرتے اور یہی نہیں کہ روحانی امراض کا ذکر ہی بار بار فرمایا ہے بلکہ شفا کا ذکر بھی اسی رنگ میں فرمایا۔ چنانچہ قرآن کریم کے متعلق ایک جگہ فرمایا: ﴿هُدًى وَّ شِفَآءٌ﴾ [حٰمٓ السجدة: 44:41] وہ ہدایت بھی ہے اور شفا بھی۔ لفظ شفا کو ہدایت کے ساتھ لگا کر بتا دیا کہ روحانی بیماریوں کی شفا مراد ہے نہ جسمانی بیماریوں کی۔ اور پھر فرمایا: ﴿شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ﴾ [يونس: 57:10] یہ سینوں کے اندر کی بیماریوں کے لیے شفا ہے۔

عیسائیوں کی لفظ پرستی:

پس انجیل اور قرآن کریم دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ انبیاء کا کام اور ان کی تعلیم روحانی بیماریوں سے نجات دینے کے لیے ہوتے ہیں اور کتب مقدسہ میں جن بیماریوں کا ذکر اکثر آتا ہے وہ روحانی بیماریاں ہوتی ہیں اور اسی قسم کی بیماریوں کا علاج حضرت مسیح کرتے تھے۔ عیسائیوں نے لفظ پرستی کی اور آپ کے کلام میں جو مجاز اور استعارہ تھا اسے حقیقت پر محمول کیا اور عجیب بات یہ ہے کہ ہمارے نبی کریم ﷺ کو جو مریض دیئے گئے کہ ان کا علاج کرو ان کا مرض مسیح کے مریضوں کے مرض سے بہت بڑھ کر ہے۔ یہاں تو شکور اور برص والے ہیں۔ مگر آنحضرت ﷺ کو اندھے اور گونگے اور بہرے دیئے جاتے ہیں۔ گونگا اور بہرہ صفات حسنہ سے محروم ہو جاتا ہے اور پھر وہ ساتھ اندھا بھی ہو تو کوئی ذریعہ اس کے علوم حاصل کرنے کا باقی نہیں رہتا۔ اس میں درحقیقت یہ بتایا ہے کہ مسیح کے وقت کی بیماری ایسی خطرناک نہ تھی جیسے نبی کریم ﷺ کے زمانہ کی بیماری اور جس قدر بیماریاں خطرناک ہوں اسی قدر فاضل طبیب بھی بکار ہوتا ہے۔ **پس دنیا کا سب سے بڑا طبیب** ہی اس قابل تھا کہ ایسے لوگوں کو بھی شفا دے جو اندھے بھی ہیں اور گونگے بھی ہیں اور بہرے بھی ہیں۔

434- موت اور حیات کے معنی [نمبر: 79] میں بیان ہو چکے ہیں۔ قوت نامیہ، قوت حاسہ، قوت عاقلہ ہر ایک کے زوال کا نام عربی میں موت ہی ہے۔ یہاں کون سے مردے مراد ہیں؟ سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ قرآن کریم مردوں کے اس دنیا میں دوبارہ واپس آنے کے متعلق اصولی رنگ میں کیا تعلیم دیتا ہے؟

مُردوں کا اس دنیا میں واپس آنا بروئے تصریح قرآنی ممنوع ہے:

قبض روح کے متعلق اللہ تعالیٰ اپنا عام قانون ان الفاظ میں بیان فرماتا ہے: ﴿اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَ الَّتِيْ لَمْ

تَاْكُلُوْنَ وَ مَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ؕ تم کھاؤ اور جو اپنے گھروں میں ذخیرہ رکھو اس کی خبر دیتا ہوں

تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۚ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَ يُرْسِلُ الْاُخْرٰۤى اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى﴾ [الزمر: 42:39] ''اللہ تعالیٰ قبض کرتا ہے روحوں کو ان کی موت کے وقت اور جو مرتے نہیں ان کی نیند میں پھر روک رکھتا ہے اس کو جس پر موت وارد کر دی اور واپس بھیجتا ہے۔ دوسرے کو ایک وقت مقرر تک۔'' اس آیت کریمہ کی رو سے قبض روح دو طرح پر ہوتا ہے۔ ایک موت کی حالت میں اور دوسرے نیند کی حالت میں۔ گویا ان دونوں حالتوں پر قبض روح کا لفظ بولا جاتا ہے۔ قبض روح کی تیسری کوئی طرز بیان نہیں فرمائی اور ان دونوں طرزوں میں سے بھی ایک کے متعلق فیصلہ قطعی صادر فرما دیا کہ جس پر موت وارد کر دے اس کو پھر اس دنیا میں واپس نہیں بھیجتا۔ ان کے زندہ ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ نے قیامت کا وقت مقرر فرمایا ہے۔ پس اس آیت کی رو سے کوئی شخص جس پر موت وارد ہو چکی ہے زندہ ہو کر اس دنیا میں نہیں آ سکتا۔

پھر یہی اصول ایک اور آیت میں بیان کیا گیا ہے: ﴿حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ۙ﴿۹۹﴾ لَعَلِّيْۤ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ؕ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ؕ وَ مِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ﴿۱۰۰﴾﴾ [المؤمنون: 23:99-100] ''یہاں تک کہ جب ان میں سے ایک پر موت آ جاتی ہے تو پھر وہ کہتا ہے میرے رب مجھے لوٹاؤ تا کہ میں جو کچھ چھوڑ آیا ہوں اس میں نیک عمل کروں۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک بات ہے جو وہ کہتا ہے اور ان کے ادھر (یعنی بعد موت) ایک حالت برزخ ہے۔ اس دن تک کہ ان کو اٹھایا جائے۔'' اب اس آیت میں بھی یہی اصول بیان فرمایا کہ موت کے بعد اس دنیا میں واپس آنا ممنوع ہے اور ایسی خواہش پوری نہیں کی جا سکتی بلکہ یَوْمُ الْبَعْثِ یعنی قیامت کے دن تک حالت برزخ میں رہنا ہوگا۔ پس اس آیت کی رو سے بھی مردوں کا قبل از بعثت اس دنیا میں واپس آنا باطل ثابت ہوتا ہے۔

تیسری آیت جو اس پر شاہد ہے وہ ذیل کی آیت قرآنی ہے: ﴿وَ حَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَاۤ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ﴾ [الأنبیآء: 95:21] ''اور جس بستی کو ہم نے ہلاک کر دیا ان کے لیے یہ قطعی ہو چکا کہ وہ کبھی لوٹ کر نہیں آئیں گے۔'' قَرْيَةٌ سے مراد بستی کے لوگ ہیں یعنی جو لوگ مر جاتے ہیں وہ لوٹ کر اس دنیا میں نہیں آیا کرتے۔ اس آیت کی تفسیر میں ایک حدیث نسائی اور ابن ماجہ میں مذکور ہے: [عَنْ جَابِرِ بْنِ عُبْدُ اللهِ قَالَ: لَقِيَنِي رَسُولُ اللهِ ﷺ فَقَالَ لِي: "يَا جَابِرُ! مَا لِي أَرَاكَ مُنْكَسِرًا". قُلْتُ يَا رَسُولَ اللهِ اسْتُشْهِدَ أَبِي قُتِلَ يَوْمَ أُحُدٍ وَتَرَكَ عِيَالاً وَدَيْنًا. قَالَ: "أَفَلاَ أُبَشِّرُكَ بِمَا لَقِيَ اللهُ بِهِ أَبَاكَ؟" قَالَ: قُلْتُ بَلَى..... فَقَالَ يَا عَبْدِي تَمَنَّ عَلَيَّ أُعْطِكَ. قَالَ يَا رَبِّ تُحْيِينِي فَأُقْتَلَ فِيكَ ثَانِيةً. قَالَ الرَّبُّ عَزَّ وَجَلَّ إِنَّهُ قَدْ سَبَقَ مِنِّي أَنَّهُمْ لاَ يُرْجَعُونَ] (جامع الترمذي، كتاب تفسير القرآن، باب وَمِنْ سُورَةِ آلِ عِمْرَانَ: 3010) یعنی جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ مجھے رسول اللہ ﷺ ملے اور فرمایا اے جابر! کیا وجہ ہے میں تم کو غمگین پاتا ہوں۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میرا باپ شہید ہو گیا اور عیال اور قرضہ پیچھے چھوڑ گیا۔ فرمایا میں تم کو خوش خبری دوں کہ تیرے باپ کو اللہ تعالیٰ کے حضور کیا معاملہ پیش آیا۔ عرض کیا فرمائیے (یہاں حدیث کا درمیانی ٹکڑا چھوڑ دیا گیا ہے)۔۔۔ اللہ تعالیٰ نے (جابر رضی اللہ عنہما کے والد کو) فرمایا اے میرے بندے تو میرے

سامنے کوئی خواہش کرتا کہ میں تجھے دوں۔اس نے عرض کیا اے میرے رب مجھے زندہ کر دیجیے تا کہ میں دوبارہ تیری راہ میں مارا جاؤں۔رب تعالیٰ نے فرمایا یہ میں پہلے وعدہ کر چکا ہوں کہ (جو مر جائیں گے) وہ لوٹ کر (اس دنیا میں) نہیں جائیں گے۔اب یہ حدیث قطعی طور پر اس کا فیصلہ کرتی ہے کہ مردہ کبھی اس دنیا میں واپس نہیں آ سکتا۔اور مردہ کا واپس آنا قانون الٰہی کے خلاف ہے۔کیونکہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود جابر رضی اللہ عنہما کے والد کو یہ کہا تھا کہ جو چاہتے ہو مانگو میں دوں گا۔مگر جب اس نے دوبارہ دنیا میں بھیجا جانے کی خواہش ظاہر کی تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ نہیں ہوسکتا۔کیونکہ یہ میرے وعدہ کے خلاف ہے۔اب یہاں ایک طرف اللہ تعالیٰ کا فرمانا کہ جو مانگو دوں گا۔دوسری طرف مسلمانوں میں اس وقت ایسے آدمیوں کی سخت ترین ضرورت ہونا جو خدا کی راہ میں اپنی جانیں قربان کریں۔یہ دونوں باتیں اس امر کی مقتضی تھیں کہ اگر خدا کے قانون میں کوئی مردہ اس دنیا میں واپس آ سکتا ہے تو جابر رضی اللہ عنہما کا والد سب سے بڑھ کر واپسی کا مستحق تھا۔مگر اللہ تعالیٰ نے باوجود یہ فرمانے کے جو مانگو میں تم کو دوں گا۔پھر بھی دوبارہ دنیا میں اس کے آنے کی خواہش کو پورا نہیں کیا۔اس بنا پر کہ یہ میرے وعدہ کے خلاف ہے۔تو کیا یہ وعدہ خدا تعالیٰ نے حضرت مسیح کے زمانہ کے بعد کیا تھا کہ اب میں مردوں کو زندہ نہیں کیا کروں گا۔پھر ہم پوچھتے ہیں کہ اگر خدا مسیح کے ذریعہ سے مردوں کو زندہ کرتا تھا تو خود ایک مردہ کو زندہ کر کے کیوں واپس نہ بھیج دیا۔قریباً اسی مضمون کی ایک حدیث صحیح مسلم میں بھی ہے جہاں اللہ تعالیٰ شہداء کی ارواح کو فرماتا ہے:[مَاذَا تَبْغُونَ] تم کیا چاہتے ہو؟ وہ عرض کرتے ہیں کہ ہمیں کچھ حاجت نہیں۔پھر یہ سوال ہوتا ہے یہاں تک کہ [فَلَمَّا رَأَوْا أَنَّهُمْ لَا يُتْرَكُونَ مِنْ أَنْ يَسْأَلُوا قَالُوْا نُرِيْدُ أَنْ تَرُدَّنَا إِلَى الدَارِ الدُّنْيَا فَنُقَاتِلَ فِيْ سَبِيلِكَ حَتّٰى نُقْتَلَ فِيْكَ مَرَّةً أُخْرٰى لِمَا يَرَوْنَ مِنْ ثَوَابِ الشَّهَادَةِ فَيَقُوْلُ الرَّبُّ جَلَّ جَلَالُهُ: إِنِّيْ كَتَبْتُ أَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُونَ] (سنن ابن ماجه، كتاب الجهاد، بَاب فَضْلِ الشَّهَادَةِ فِي سَبِيلِ اللهِ: 2801) جب وہ دیکھیں گے کہ ان سے بار بار سوال کیا جاتا ہے تو کہیں گے کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ آپ ہمیں دار دنیا کی طرف واپس لوٹا دیں تب ہم تیری راہ میں جنگ کریں یہاں تک کہ تیری راہ میں دوسری مرتبہ قتل کیے جائیں کیونکہ وہ شہادت کا اس قدر ثواب دیکھ چکے ہوں گے۔تو رب جل جلالہ فرمائے گا میں یہ لکھ چکا ہوں کہ اس دنیا کی طرف پھر ان کو نہیں لوٹایا جائے گا۔ہم کہتے ہیں کہ اگر کوئی مردہ دنیا میں زندہ ہو کر آ سکتا ہے تو شہداء سب سے بڑھ کر حقدار ہیں۔کیونکہ ان کی زندگیاں محض اللہ کے لیے ہیں۔پھر اللہ تعالیٰ خود ان کو فرماتا بھی ہے کہ تم جو کچھ مانگو میں دوں گا۔لیکن بایں بھی دوبارہ ان کو دنیا میں نہیں بھیجتا کیوں؟ اس لیے کہ فرماتا ہے یہ میرے وعدہ کے خلاف ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قوانین اصول کے رنگ میں کیسے محکم ہیں۔

قرآن کریم میں روحانی مردوں کے احیاء کا ذکر:

پس یہ آیتیں اور حدیثیں اس بات پر شاہد ہیں کہ مردے ہرگز اس دنیا میں واپس نہیں آیا کرتے اور اب سوائے اس کے چارہ نہیں کہ یہاں بھی روحانی مردوں کا احیاء مراد لیا جائے اور قرآن کریم میں روحانی مردوں کے احیاء کا ذکر بھی کثرت کے ساتھ بار بار آتا ہے۔چنانچہ ایک جگہ فرمایا:﴿ اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَ جَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا﴾[الأنعام: 122:6] ”کیا وہ شخص جو مردہ ہو، پھر اسے ہم زندہ کریں اور اس کو ایک روشنی دے

دیں جس کے ساتھ وہ لوگوں کے اندر چلے اس شخص کی مثل ہوسکتا ہے جو تاریکیوں کے اندر ہی رہے۔ان میں سے باہر نکلنے والا نہ ہو۔'' اب یہاں ایک مردہ کا ذکر ہے اور اس کے زندہ کرنے کا بھی ذکر ہے۔مگر یہ کس قسم کا مردہ ہے اور اس کا احیاء کیا ہے۔اس مردہ کو جب اللہ تعالیٰ اپنی جناب سے نور ایمان عطا فرماتا ہے تو اس نور کے ذریعہ سے پھر وہ لوگوں میں چلتا ہے۔اور اس زندگی کے مقابل اس مردہ کی حالت ہے جو تاریکیوں میں ہی رہتا ہے۔پھر فرمایا: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ﴾ [الأنفال: 24:8] ''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! فرمانبرداری کرو اللہ کی اور رسول کی جب وہ تم کو بلائے اس کے لیے جو تم کو زندہ کرے۔'' پھر فرمایا: ﴿ وَ مَا يَسْتَوِي الْاَحْيَآءُ وَ لَا الْاَمْوَاتُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَ مَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ ۝ ﴾ [فاطر: 22:35] ''زندے اور مردے یکساں نہیں۔اللہ جسے چاہتا ہے سناتا ہے اور جو قبروں میں پڑے ہوئے ہیں تم ان کو نہیں سنا سکتے۔'' یہاں نہ صرف روحانی زندوں کو احیاء اور روحانی مردوں کو اموات کے نام سے پکارا ہے۔بلکہ ان کو ﴿ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ﴾ بھی قرار دیا ہے۔یعنی ایسے لوگ جو قبروں میں پڑے ہوئے ہیں۔

مسیح کے احیائے موتی سے روحانی مردوں کی زندگی مراد ہے:

پس قرآن کریم مُردوں کے اس دنیا میں واپس آنے کا دروازہ قطعاً بند کرتا ہے اور روحانی مردوں کو قرآن کریم میں مردے ہی کہا گیا ہے۔بلکہ انبیاء کا یہ کام بتایا گیا ہے کہ وہ روحانی مردوں کو زندہ کریں۔تو ہم ﴿ اُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ کے ایک ہی معنی لے سکتے ہیں کہ اللہ کے اذن سے میں روحانی مردوں کو زندگی دیتا ہوں۔

نبی کی قوت قدسی کا اظہار دو رنگوں میں:

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ دراصل یہ تینوں فقرے یعنی اول خَلْقُ طَيْرٍ۔دوم اَكْمَهُ اور اَبْرَصُ کو شفا دینا۔سوم مردوں کو زندہ کرنا ایک ہی مطلب کے ظاہر کرنے والے ہیں۔یعنی نبی کے نفخ روح سے ایک انقلاب پیدا ہوتا ہے۔پھر وہ مختلف صورتیں اختیار کرتا ہے جو طینی فطرت کے لوگ ہیں یعنی بوجہ فرمانبرداری کے مادہ کے استعداد قبولیت زیادہ رکھتے ہیں۔ان میں تو نفخ روح کا اثر اس قدر ہوتا ہے کہ ان کے زمینی تعلقات منقطع ہوکر وہ بالکل خدا کے لیے ہی ہوجاتے ہیں۔اس سے ادنیٰ حالت ان لوگوں کی حالت ہے جن کو بیمار کہا یعنی اَكْمَهُ اور اَبْرَصُ ان کی بیماریاں دور ہوکر وہ بھلے چنگے ہوجاتے ہیں۔مگر سب سے ردی حالت ان لوگوں کی ہے جن میں سے روحانی زندگی مفقود ہوچکی ہے اور وہ مردوں کے حکم میں داخل ہوچکے ہیں۔مگر ان پر بھی نبی کی قوت قدسی کا اثر ہوتا ہے اور ان کو از سر نو زندگی دی جاتی ہے۔اصل غرض بہر حال ایک ہی ہے یعنی انسانوں میں نفخ روح کرنا اور تین مختلف پیرائے اس کے صرف اس لیے بیان فرمائے کہ تا انسانوں کے تین مراتب پر یعنی اس حالت پر جس میں نبی ان کو پاتا ہے شاہد ہوں۔یہی وجہ ہے کہ یہاں ان تینوں کو ایک ہی آیت قرار دیا ہے اور یوں فرمایا ہے: ﴿ اَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ﴾ ''میں تمہارے رب کی طرف سے ایک بات لایا ہوں۔'' حالانکہ آگے ذکر تین باتوں کا ہے۔اس سے اسی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ درحقیقت یہ تینوں باتیں ایک ہی مطلب کو ظاہر کرنے والی ہیں اور نبی کی قوت قدسی کا فیضان ہی وہ بات ہے جس کا یہاں ذکر مطلوب ہے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۴۹﴾	یقیناً اس میں تمہارے لیے نشان ہے اگر تم مومن ہو۔(435)
وَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ	اور اس کی تصدیق کرنے والا جو توریت میں سے مجھ سے پہلے ہے(436)

435- ﴿بِمَا تَاْكُلُوْنَ﴾ یہاں یا تو ''مَا'' مصدر یہ ہے اور مراد یہ ہے کہ تمہارے کھانے اور تمہارے ذخیرہ کرنے کی خبر دیتا ہوں۔ یعنی اس امر کی کہ کیا کھانا ہے اور کیا ذخیرہ کرنا ہے اور یا ''مَا'' موصولہ ہے اور اس صورت میں خبر بمعنی امر ہے یعنی اس امر کی خبر دیتا ہوں کہ کیا کھاؤ اور کیا ذخیرہ کرو۔

تَدَّخِرُوْنَ۔ اِدِّخَارٌ اصل میں اِذْتِخَارٌ ہے جو ذُخْرٌ سے ہے اور اِدَّخَرْتُهُ کے معنی ہیں: [اَعْدَدْتُهُ لِلْعُقْبٰی] (غ) یعنی آئندہ کے لیے اسے سامان بنا کر رکھا، ذخیرہ کیا۔

مسیح کے متعلق غلط قصے:

اس موقعہ پر جو قصے لکھے گئے ہیں کہ حضرت مسیح چھوٹے ہوتے باہر لڑکوں میں کھیلا کرتے تھے تو لڑکوں کو بتا دیا کرتے تھے کہ تمہاری ماں نے فلاں چیز فلاں جگہ چھپا کر رکھی ہے۔ اور اس طرح لڑ کے گھر میں جا کر ماؤں کو تنگ کیا کرتے تھے۔ پھر لکھا ہے کہ ایک دن محلہ والوں نے سارے لڑکوں کو ایک مکان میں بند کر دیا اور جب مسیح ان کو بلاتے ہوئے آئے تو ان کے متولیوں نے کہہ دیا کہ وہ یہاں نہیں ہیں اور جب مسیح نے اس مکان کی طرف جہاں وہ لڑکے بند تھے اشارہ کر کے کہا کہ یہاں کون ہے؟ تو انہوں نے کہہ دیا کہ سور۔ تو وہ سب لڑکے سور بن گئے۔ یہ بے سروپا قصے گھڑ لیے گئے ہیں جن کی غرض صرف مسیح کی ہر بات کو عجوبہ بنانا ہے؛ حالانکہ مسیح میں دیگر انبیاء بنی اسرائیل سے بڑھ کر کوئی بات نہ تھی۔ اس آیت کے معنی صاف اس قدر ہیں کہ <u>حضرت مسیح ان کو بتاتے ہیں کہ کیا چیزیں کھاؤ اور کس قدر ذخیرہ کرو</u>۔ گویا حلال وحرام کے متعلق بھی کچھ احکام دیتے تھے اور زیادہ تر ان کی تعلیم کا زور اس بات پر تھا کہ دنیا کے مال و دولت کا زیادہ ذخیرہ مت کرو اور اپنے لیے زمین پر خزانے مت جمع کرو۔ گو آپ کے پیروؤں نے آپ کی ہر ایک تعلیم کی خلاف ورزی ہی کی ہے۔ یورپ اور امریکہ کے پیروانِ مسیح کی حالت دیکھو جو دن رات دولت جمع کرنے کی فکر میں ہیں اور جن کا خدا ہی اب سیم وزر ہے اور حضرت مسیح کی اس تعلیم کو دیکھو:

> ''اپنے واسطے زمین پر مال جمع نہ کرو جہاں کیڑا اور زنگ خراب کرتا ہے اور جہاں چور نقب لگاتے اور چراتے ہیں۔ بلکہ اپنے لیے آسمان پر مال جمع کرو جہاں نہ کیڑا خراب کرتا ہے نہ زنگ۔ اور نہ وہاں چور نقب لگاتے اور چراتے ہیں کیونکہ جہاں تیرا مال ہے وہیں تیرا دل بھی لگا رہے گا۔'' [متی: 6:19-21]

436- وَمُصَدِّقًا عطف ہے بِاٰیَةٍ پر یعنی ﴿قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰیَةٍ﴾۔ وَجِئْتُكُمْ مُصَدِّقًا۔

وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ اور تا کہ اس کا کچھ حصہ تمہارے لیے حلال ٹھہراؤں جو تم پر حرام کیا گیا ہے۔ (437)

حضرت مسیح کا توریت کا مصدق ہونے سے منشا اس کی کمی کو پورا کرنا ہے:

یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے آپ کو توریت کا مصداق قرار دیتے ہیں۔ اس تصدیق کا منشا کیا ہے اس پر مفصل بحث [نمبر: 63] میں گزر چکی ہے۔ جہاں دکھایا گیا ہے کہ اس تصدیق سے جس کا صلہ لام آئے مراد یہ ہوتی ہے کہ پہلی کتاب اس بات کو چاہتی تھی کہ اس کی کسی کمی کو پورا کرنے کے لیے یا اس کی پیشگوئی کو پورا کرنے کے لیے کوئی دوسرا نبی آئے۔ پس جب وہ دوسرا نبی آتا ہے تو اس پہلی کتاب کی تصدیق کرتا ہے یعنی اس کا منجانب اللہ ہونا بھی تسلیم کرتا ہے اور اس کی اس کمی یا نقص کو بھی پورا کرتا ہے۔

توریت اور انبیائے بنی اسرائیل: توریت کی تعلیم جس طرح بعض پہلوؤں کی رو سے مختص القوم تھی یعنی صرف بنی اسرائیل کے لیے تھی۔ اسی طرح اس کی تعلیم کے بعض پہلو مختص الزمان بھی تھے۔ اور انبیائے بنی اسرائیل وقتاً فوقتاً ظاہر ہو کر ایسی کمی کو پورا کرتے رہے اس لیے شریعت توریت ان میں بطور ایک بنیاد کے رہی اور باقی انبیاء کی تعلیم اپنے اپنے زمانہ تک محدود رہی۔ وہ اپنے اپنے وقت میں تعلیم توریت کی کمی کو پورا کرتے رہے۔ اس لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام دنیا کی ساری کتابوں کے یا سارے رسولوں کے مصدق نہیں ہوئے بلکہ صرف توریت کے مصدق ہوئے کیونکہ ان کی بعثت کی غرض توریت کی تعلیم کی کسی کمی کو ہی پورا کرنا تھا اور اس تصدیق سے یہ نتیجہ قطعاً نہیں نکلتا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وقت تک توریت میں کوئی تحریف نہ ہوئی تھی۔ ہاں اللہ تعالیٰ انبیاء کو اس لیے مامور نہیں کرتا کہ وہ پرانی کتابوں کے ایک ایک حرف کو درست کر دیں۔ بلکہ اصل غرض اصلاح نفوس ہوتی ہے اس کے لیے موٹی موٹی ہدایات وہ انہیں دے دیتا ہے۔

یہ امر کہ حضرت مسیح نے توریت کی تعلیم کی کمی کو پورا کیا، خود قرآن کریم کے اگلے الفاظ سے ظاہر ہے اور بعثت انبیاء کی اصل غرض چونکہ بروئے قرآن کریم ہدایت کا لانا ہے جیسا کہ ﴿فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى﴾ [البقرة: 38:2] ''پھر اگر میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آئے۔'' سے ظاہر ہے اس لیے ہر نبی کوئی نئی ہدایت لاتا ہے خواہ وہ برنگ شریعت ہو یا برنگ نصیحت یا برنگ نمونہ عمل۔

437- **حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بعض احکام توریت کو منسوخ کرنا:** ﴿بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ﴾ یعنی بعض اس کا جو موسوی شریعت میں تم پر حرام کیا گیا ہے۔ اور یہ روایت قتادہ سے ابن جریر نے دی ہے: [كَانَ الَّذِي جَاءَ بِهِ عِيسٰى أَلْيَنَ مِمَّا جَاءَ بِهِ مُوسٰى] (روح المعانی، جلد3، صفحہ171) یعنی جو کچھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام لائے اس میں نرمی کا پہلو تھا۔ بہ نسبت اس کے جو موسیٰ لائے۔ بعض مفسرین نے اس کے یوں معنی کیے ہیں کہ بعض وہ باتیں جو تم نے غلطی سے اپنے اوپر حرام کر رکھی تھیں ان کو حلال کرتا ہوں اور اس لیے انہوں نے کہا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے توریت کے کسی حکم کو منسوخ نہیں کیا، مگر یہ صحیح نہیں۔ اس لیے کہ اس وقت بھی اناجیل میں باوجود اس اقرار کے کہ میں توریت کو منسوخ کرنے نہیں آیا توریت کے بعض احکام کے خلاف احکام موجود

وَ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۫ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ۝۵۰

اور میں تمہارے پاس تمہارے رب سے ایک پیغام لایا ہوں۔ پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو۔ (438)

ہیں۔ اور ان الفاظ سے کہ توریت کو منسوخ کرنے نہیں آیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہی منشاء تھا کہ بطور بنیاد وہ قائم رہے گی۔ **لیکن کچھ تغیر وتبدل یا ترمیم اس میں ضرورت زمانہ کے لحاظ سے ہوگی**۔ اس سے شریعت توریت منسوخ نہیں ہوتی جیسا کہ انجیل کی اس قسم کی عبارات سے ظاہر ہے۔ مثلاً تکمیل کے رنگ میں:

''تم سن چکے ہو کہ اگلوں سے کہا گیا تھا کہ خون نہ کر۔۔۔۔ لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ جو کوئی اپنے بھائی پر غصے ہوگا وہ عدالت کی سزا کے لائق ہوگا اور جو کوئی اپنے بھائی کو پاگل کہے گا وہ صدر عدالت کی سزا کے لائق ہوگا اور جو اس کو احمق کہے گا وہ آگ کی جہنم کا سزاوار ہوگا۔'' [متی: 5:21, 22]

اس سے حکم توریت کہ ''خون نہ کر'' منسوخ نہیں ہوتا بلکہ اس کی تکمیل ہوتی ہے۔ ایسا ہی:

''تم سن چکے ہو گے کہ کہا گیا تھا کہ زنا نہ کر۔ لیکن میں تم سے کہتا یہ ہوں کہ جس کسی نے بری نظر سے کسی عورت پر نگاہ کی وہ اپنے دل میں اس کے ساتھ زنا کر چکا۔'' [متی: 5:27, 28]

یا مثلاً ترمیم کے رنگ میں:

''یہ بھی کہا گیا تھا کہ جو کوئی اپنی بیوی کو چھوڑے، اسے طلاق نامہ لکھ دے۔ لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ جو کوئی اپنی بیوی کو حرام کاری کے سوا کسی اور سبب سے چھوڑ دے وہ اس سے زنا کراتا ہے۔'' [متی: 5:31, 32]

یا تنسیخ کے رنگ میں:

''تم سن چکے ہو گے کہ کہا گیا تھا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت۔ لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ شریر کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے۔''

[متی: 5:38, 39]

اب یہ جس قدر باتیں ''کہا گیا تھا'' میں حضرت مسیح نے بیان کی ہیں وہ توریت کے احکام ہیں جس سے صاف معلوم ہوا کہ انبیائے بنی اسرائیل اس اختیار کے ساتھ آتے تھے کہ وہ توریت کو بطور بنیاد شریعت تسلیم کرتے ہوئے ان ہدایات کی تکمیل کریں یا ان میں ترمیم تنسیخ کریں۔

438- **حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اپنی اطاعت کی طرف بلانا اور اس کی غرض:** اَطِيْعُوْنِ۔ میری اطاعت کرو۔ یہ تعلیم ہر ایک نبی دیتا ہے۔ چنانچہ سورہ شعراء میں جہاں بہت سے انبیاء علیہم السلام کا ذکر کیا ہے قریباً ہر ایک نبی کی تعلیم میں یہ حصہ بھی پایا جاتا ہے ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ﴾ ''اللہ کا تقویٰ کرو اور میری اطاعت کرو۔'' باوجودیکہ شریعت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تھی جس پر مسیح نے بھی عمل

اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ﴿۵۱﴾

اللہ ہی میرا رب اور تمہارا رب ہے۔ پس اس کی عبادت کرو یہی سیدھا رستہ ہے۔(439)

فَلَمَّاۤ اَحَسَّ عِیْسٰی مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَی اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ

پھر جب عیسیٰ نے ان سے کفر محسوس کیا تو کہا کون اللہ (کے دین) میں میرے مددگار ہیں؟(440) حواریوں نے کہا

کرنا اور کرانا تھا مگر وہ یہ نہیں کہتے کہ موسیٰ کی اطاعت کرو۔ اس لیے کہ وہ خود مطاع ہیں اور کسی دوسرے کے مطیع نہیں بلکہ جو کچھ پاتے ہیں براہ راست اللہ تعالیٰ سے پاتے ہیں۔ گویا ہر نبی بمنزلہ ایک بادشاہ کے ہوتا ہے۔ اس کو بڑی صراحت سے دوسری جگہ بیان فرمایا ہے: ﴿وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ [النسآء: 64:4] ''اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ اللہ کے اذن سے اس کی اطاعت کی جائے۔'' یہاں حضرت مسیح کا اپنی اطاعت کے لیے حکم دینا یہی سمجھانے کو ہے کہ اگر وہ احکام توریت میں کسی قسم کا تغیر وتبدل کریں تو ان کی بات ماننی ہوگی اور وہ اس بنا پر رد نہیں ہوسکتی کہ توریت کے خلاف ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ **نبی کی اطاعت جزو دین ہے۔**

439- **اناجیل میں توحید کی تعلیم:** قرآن کریم نے جو کچھ حضرت مسیح کی تعلیم کا یہاں خلاصہ بیان کیا ہے وہ اب بھی اناجیل میں باوجود ان کی خطرناک تحریف کے موجود ہے۔ ''تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر۔'' [متی: 10:4] یہ کسی قائل تثلیث کی تعلیم نہیں ہوسکتی۔ اللہ تعالیٰ نے عیسائیوں پر اتمام حجت کے لیے اس قسم کے فقروں کو ان کی کتابوں میں باقی رہنے دیا ہے۔

440- اَحَسَّ۔ اِحْسَاسٌ کے معنی ہیں حواس ظاہری سے کسی چیز کا معلوم کر لینا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ان سے احساس کفر کر لینا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کا کفر اس حد تک ظاہر ہو چکا تھا کہ فہم کے لیے اس کا ظاہر ہونا تو ایک طرف رہا حواس کے لیے بھی وہ ظاہر تھا۔ (غ) دوسرے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 538]۔

﴿مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَی اللّٰهِ﴾ اَنْصَارٌ، نَصِیْرٌ کی جمع ہے بمعنی مددگار۔ ابن جریر نے ﴿مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَی اللّٰهِ﴾ کی تشریح یوں کی ہے: [مَنْ أَعْوَانِيْ عَلَى الْمُكَذِّبِيْنَ بِحُجَّةِ اللهِ] یعنی کون تکذیب کرنے والوں کے خلاف اللہ کی حجت کے ساتھ میرا مددگار ہوگا اور وہ کہتے ہیں ﴿اِلَی اللّٰهِ﴾ یہاں بمعنی مَعَ اللهِ ہے اور بعض نے اس کے معنی کیے ہیں: [مُلْتَجِأً اِلَى اللهِ أَوْ ذَاهِبًا أَوْ ضَامًّا إِلَيْهِ] (ص) یعنی میرا مددگار کون ہے؟ اس حال میں کہ میں اللہ کی طرف پناہ ڈھونڈنے والا یا اس کی طرف جانے والا یا اس کے ساتھ تعلق کرنے والا ہوں۔ اور آگے جو انصار اللہ آتا ہے تو اس سے مراد انصار دین اللہ ہے یا انصار رسول اللہ یعنی اللہ کے دین یا اللہ کے رسول کے مددگار۔

نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَ اشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۵۲﴾

ہم اللہ (کے دین) میں مددگار ہیں۔ ہم اللہ پر ایمان لائے اور گواہ رہ کہ ہم فرمانبردار ہیں۔ (441)

441- اَلْحَوَارِيُّوْنَ۔ حَوَارِيٌّ کی جمع ہے اور یہ حَوْرٌ سے مشتق ہے۔ حَوْرٌ کے معنی ہیں ایک چیز سے لوٹ کر آنا یا ایک چیز کی طرف لوٹ کر جانا اور اسی سے یَحُوْرُ ہے ﴿اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ﴾ [الانشقاق: 14:84] ''اس کا خیال تھا کہ وہ لوٹ کر نہیں آئے گا۔'' اور تَحَاوُرٍ جو ایک دوسرے کی طرف کلام کو لوٹانے کا نام ہے: ﴿وَاللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا﴾ [المجادلة: 1:58] ''اور اللہ تم دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔'' اور حَوْرٌ اصل میں بیاض یعنی سفیدی کو کہتے ہیں۔ اور حَوْرَاءُ اس عورت کو کہا جاتا ہے جس کی آنکھ کی سفیدی اعلیٰ درجہ کی سفید اور سیاہی شدت سے سیاہ ہو اور جس کا رنگ بھی سفید ہو۔ اسی وجہ سے اعراب یعنی بادیہ نشین لوگ شہروں کی عورتوں کو حَوَارِيَاتٌ کہتے تھے۔ کیونکہ ان کے رنگ اعراب کے مقابلہ میں اعلیٰ درجہ کے سفید تھے۔ (ل) اور تَحْوِيْرٌ کے معنی تَبْيِيْضٌ آتے ہیں یعنی سفید کرنا۔

حواری نام کی وجہ: ابن اثیر، راغب وغیرہ کے نزدیک لفظ حواری اسی سے مشتق ہے اور یہ لفظ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے برگزیدہ احباب پر کیوں بولا گیا ہے؟ اس کی وجہ اکثر نے یہی دی ہے کہ حواری قَصَّارٌ کو کہتے ہیں یعنی جو کپڑے دھو کر ان کو سفید کرتا ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خاص احباب کو حواری کا خطاب اس لیے دیا گیا کہ وہ دھوبی کا کام کرتے تھے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں پر یہ نام آکر ہر ایک ناصر اور پسندیدہ دوست پر بولا جانے لگا۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے: [اَلزُّبَيْرُ ابْنُ عَمَّتِي وَحَوَارِيَّ مِنْ أُمَّتِي] (مسند أحمد: جلد22، صفحہ 272) یعنی ''زبیر میری پھوپھی کا بیٹا اور میری امت سے میرا حواری ہے۔'' اور زجاج کا قول لسان العرب میں منقول ہے کہ [اَلْحَوَارِيُّوْنَ خُلْصَانُ الْاَنْبِيَاءِ وَصَفْوَتُهُمْ] (جلد4، صفحہ 217) یعنی نبیوں کے خالص اور برگزیدہ دوست حواری کہلاتے ہیں جس کی وجہ بعض نے یہ دی ہے کہ وہ اپنی خلوص نیت اور سیرت کی پاکیزگی کی وجہ سے حواری کہلائے۔ بعض نے کہا ہے اس لیے کہ وہ لوگوں کو گناہوں کی میل سے صاف کرتے تھے۔

بارہ حواریوں کے نام:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری بارہ تھے جن کے نام اناجیل میں حسب ذیل دیئے گئے ہیں۔ [لوقا: 6-14] [مرقس: 3:10]

① شمعون جو پطرس کہلاتا ہے	② اس کا بھائی اندریاس	③ زبدی کا بیٹا یعقوب
④ اس کا بھائی یوحنا	⑤ فلپس	⑥ برتلمائی
⑦ توما	⑧ متی محصول لینے والا	⑨ حلفیٰ کا بیٹا یعقوب
⑩ تدی	⑪ شمعون قنانی	⑫ یہودا اسکریوطی۔ (جس نے حضرت مسیح کو پکڑوا بھی دیا)

رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَ اتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ اے ہمارے رب! ہم اس پر ایمان لائے جو تو نے

ان بارہ کو یہ حکم دیا گیا:

''اور ان کو حکم تھا کہ غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا اور چلتے چلتے یہ منادی کرنا کہ آسمان کی بادشاہت نزدیک آ گئی ہے۔''

ان کا کام یہ قرار دیا گیا:

''بیماروں کو اچھا کرنا، مردوں کو جلانا، کوڑھیوں کو پاک صاف کرنا، بدروحوں کو نکالنا۔''

اور ان کو حکم تھا کہ اپنے پاس کچھ نہ رکھیں:

''نہ سونا اپنے کمر بند میں رکھنا۔ نہ چاندی نہ پیسے راستے کے لیے نہ جھولی لینا نہ دو دو کرتے نہ جوتیاں نہ لاٹھی۔''

[متی: 10:10-5]

ان بارہ کی ایمانی حالت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ ایسے سخت الفاظ ہیں کہ یہ تسلیم کرنا مشکل نظر آتا ہے کہ واقعی ان کی حالت ایسی ہو۔ کہیں ان کو ''کم اعتقاد'' کہا گیا ہے۔[متی: 8:16] کہیں ''بے اعتقاد اور کجرو قوم''[متی: 17:17] کہیں ان کو ''رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان'' سے محروم قرار دیا گیا ہے۔[متی: 20:17] کہیں پطرس کو جو ان سب کا سردار تھا شیطان کے نام سے پکارا گیا ہے۔ ان میں سے ایک یہوداسکریوطی آخر صرف تیس روپے لے کر حضرت مسیح کو پکڑوا دیتا ہے اور بارہ کے گیارہ رہ جاتے ہیں۔ مگر الفاظ کو پورا کرنے کے لیے پیچھے پولوس کو داخل کر کے بارہ کی تعداد پھر بنائی جاتی ہے۔ مگر باقی کی کمزوری کا بھی یہ حال ہے کہ پطرس جس پر مسیح نے کلیسیا کی بنیاد رکھی تھی۔[متی: 18:16] تین دفعہ مسیح کا انکار کرتا ہے اور جب لوگ کہتے ہیں کہ یہ اس کے ساتھ تھا تو جھوٹ بول کر اپنی جان چھڑاتا ہے کہ میں نہیں تھا۔[لوقا: 22:57-62] اور باقی حواری حضرت مسیح کی گرفتاری کے وقت بھاگ جاتے ہیں۔ حالانکہ ان کے ساتھ جو وعدے کیے گئے تھے وہ بڑے عظیم الشان تھے۔

حواریوں کے ساتھ وعدے:

چنانچہ پطرس کو کہا:

''میں آسمان کی بادشاہت کی کنجیاں تجھے دوں گا اور جو کچھ تو زمین پر باندھے گا وہ آسمان پر بندھے گا اور جو کچھ تو زمین پر کھولے وہ آسمان پر کھلے گا۔'' [متی: 19:16]

اور بارہ حواریوں کے لیے یہ وعدہ تھا:

''میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب ابن آدم نئی پیدائش میں اپنے جلال کے تخت پر بیٹھے گا تو تم بھی جو میرے پیچھے ہو لیے ہو بارہ تختوں پر بیٹھ کر اسرائیل کے بارہ قبیلوں کا انصاف کرو گے۔'' [متی: 28:19]

فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۵۳﴾

نازل کیا اور رسول کی پیروی کی پس تو ہمیں گواہی دینے والوں کے ساتھ لکھ۔ (442)

وَ مَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَ اللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿۵۴﴾ ع

اور (کافروں نے) تدبیر کی اور اللہ نے بھی تدبیر کی اور اللہ سب تدبیر کرنے والوں سے اچھا ہے۔ (443)

قرآن کریم نے حواریوں کی ان کمزوریوں کا ذکر نہیں کیا صرف ان کی خوبیوں کا ذکر کیا ہے یہ ان کی خدمت اور نصرت کی عزت کی ہے۔ یہ **قرآن شریف کا احسان عیسائیوں پر تھا** کہ ان کے رسول کو چھوڑ کر رسول کے اصحاب کی بھی خوبیوں کا ذکر کیا، کمزوریوں کا نام تک نہیں لیا۔ مگر اس احسان فراموش قوم نے سارا زور اس محسن کی عیب شماری پر لگا دیا اور وہ بھی سب جھوٹ۔

442- اَلشَّاهِدِيْنَ یہاں شَاهِدِيْنَ کی تفسیر میں کئی قول ہیں میرے نزدیک زجاج کا قول سب سے بہتر ہے۔ [هُمُ الشَّاهِدُوْنَ لِلْاَنْبِيَاءِ بِالتَّصْدِيْقِ]۔ (ر) یعنی یہ وہ لوگ ہیں جو انبیاء کی سچائی پر ایمان لا کر ان کے لیے بمنزلہ گواہوں کے ہو جاتے ہیں۔ یہ معنی اس لیے بھی چسپاں ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی قوت قدسی کے یہ لوگ گواہ بن جاتے ہیں کیونکہ وہ عملی رنگ میں پاک ہو کر بمنزلہ گواہوں کے ہو جاتے ہیں۔

443- مَكَرُوْا- [اَلْمَكْرُ اِحْتِيَالٌ فِيْ خُفْيَةٍ]۔ (ل) یعنی مَکْر خفیہ طور پر احتیال کو کہتے ہیں اور احتیال کیا ہے۔ [اَلْحَوْلُ وَالْحِيَلُ وَالْحَوْلُ وَالْحِلْيَةُ وَالْاِحْتِيَالُ كُلُّ ذٰلِكَ الْحَذَقُ وَجُوْدَةُ النَّظْرِ وَالْقُدْرَةُ عَلٰى دِقَّةِ التَّصَرُّفِ] (ل) یعنی حَوْلٌ۔ حِيَلٌ۔ حِوَلٌ۔ حِيْلَةٌ۔ اِحْتِيَالٌ ان سب الفاظ کے معنی دانائی اور نظر کی ذہانت اور باریک تصرفات پر قدرت رکھنا ہے گویا احتیال یا حِيْلَةٌ باریک مضبوط تدبیر کو کہتے ہیں۔ پس مکر کے معنی ہوئے مخفی طور پر باریک مضبوط تدبیر کرنا۔ اور مفردات راغب میں مکر کے معنی دیئے ہیں [صَرْفُ الْغَيْرِ عَمَّا يَقْصُدُهُ بِحِيْلَةٍ] یعنی کسی غیر کا اس سے جس کا وہ قصد کرتا ہے باریک مضبوط تدبیر سے پھیر دینا اور پھر لکھا ہے کہ مکر دو طرح پر ہے۔

① ایک محمود یعنی قابل تعریف اور وہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ کوئی اچھا کام کرنے کا ارادہ کیا جائے اور اس کی مثال دی ہے: ﴿وَ مَكَرَ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ﴾

③ اور دوسرا مذموم جس کے ساتھ فعل قبیح کا قصد کیا جائے اور اس کی مثال دی ہے: ﴿وَ اِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾

پس خیر اور شر دونوں پر مکر کا استعمال ہوتا ہے اور تفسیر کبیر میں بھی اس پر بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ مکر وہ رائے محکم اور مضبوط ہے جو نقص و فتور سے محفوظ ہو۔ پس اس قدر تصریح کے ہوتے ہوئے معترضین اسلام کا اپنے ذہن میں اس مفہوم مکر کو رکھ کر جو زبان اردو میں اس لفظ نے اختیار کر لیا ہے قرآن کریم پر یہ اعتراض کرنا کہ اللہ تعالیٰ کا نام مکار ہے کم فہمی یا شرارت کی وجہ سے ہے۔ بسا اوقات ایک زبان کا لفظ دوسری زبان میں آ کر ایک خاص مفہوم کو اختیار کر لیتا ہے۔ پس اگر لفظ مکر اردو زبان میں

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ جب اللہ نے کہا اے عیسیٰ میں تجھے وفات دینے والا ہوں (444)

برے معنی میں استعمال ہوتا ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ عربی زبان میں یہ لفظ برے معنی میں استعمال ہوتا ہے، صریح غلطی ہے اور قرآن کریم نے تو ایک جگہ لفظ مَکْر کے ساتھ خیر کا لفظ لگا کر جیسا ﴿وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ﴾ اور دوسری جگہ سَيِّئٌ کا لفظ لگا کر جیسا ﴿وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ﴾ [فاطر: 43:35] ''اور بری تدبیر کا وبال صرف اس کے کرنے والے پر ہی پڑتا ہے۔'' میں یہ بتا دیا ہے کہ اصل لفظ مکر میں بدی کا مفہوم نہیں کیونکہ جو فعل فی نفسہٖ برا ہو اس کے ساتھ خیر یا بھلے کا لفظ تو لگ ہی نہیں سکتا اور اس کے ساتھ ذم کا لفظ لگانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وَمَكَرُوْا میں ضمیر ان لوگوں کی طرف ہے جن کا ذکر ان الفاظ میں ہے: ﴿فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ﴾ یعنی اعدائے مسیح کی طرف۔

اعدائے مسیح کے جس مکر یا باریک تدبیر کا یہاں ذکر ہے وہ یہ تھی کہ انہوں نے حضرت مسیح کو جھٹلانے پر کفایت نہیں کی اور نہ صرف انہوں نے یہ کافی سمجھا کہ اس کو مروا دیں۔ بلکہ انہوں نے باریک تدبیر کے ذریعہ اسے حکام وقت سے صلیب پر کھچوانے کی تدبیر کی جیسا کہ دوسری جگہ اس کی طرف اشارہ آتا ہے اور جیسا اناجیل میں مفصل مذکور ہے۔

مسیح کو آسمان پر اٹھانا مخفی تدبیر نہیں کہلا سکتا:

﴿وَمَكَرَ اللّٰهُ﴾ اللہ تعالیٰ نے بھی کوئی باریک تدبیر کی۔ یہ باریک تدبیر کیا تھی؟ عام طور پر یہ خیال ہے کہ حضرت مسیح کو آسمان پر اٹھا لینا اور آپ کا ہمشکل ایک حواری کو بنا کر اس کو مصلوب کرا دینا یہ خدائی تدبیر تھی۔ لیکن اس پر تین اعتراض پیدا ہوتے ہیں۔

اوّل یہ کہ ایک شخص کو یوں دشمنوں کے تصرف سے نکال لینا کہ آسمان پر اٹھا لیا جائے یہ کوئی باریک مخفی تدبیر نہ ہوئی۔

دوسرا یہ کہ مکر تو اس تدبیر مخفی کو کہا جاتا ہے جو جہات نقص وفتور سے خالی ہو۔ جب ایک حواری مارا گیا اور اسی صلیب کی موت سے مارا گیا تو یہ تدبیر تو سخت ناقص ہے۔ مسیح تو لعنتی موت سے بچے لیکن ان کی جگہ ایک حواری جو انصار اللہ میں سے تھا اسی لعنتی موت میں گرفتار ہوا۔

تیسرا اور سب سے بڑا اعتراض اس پر یہ ہے کہ یہودیوں کی غرض تو پوری ہوگئی کہ مسیح کے کاروبار کا اور تبلیغ کا خاتمہ ہو گیا اور بنی اسرائیل اس ہدایت سے محروم رہ گئے۔ پھر یہ کیسی ناقص تدبیر ہوئی۔ ﴿وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ﴾ کا لفظ اس پر نہیں بولا جا سکتا۔

الٰہی تدبیر جیسا کہ دوسری جگہ دکھایا جائے گا یہ تھی کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو ایک نہایت مخفی باریک تدبیر سے موت صلیب سے بچا کر باقی بنی اسرائیل کی طرف بھیج دیا اور اس طرح پر یہود کی کوشش دونوں طرح پر ناکام ہوئی۔ حضرت مسیح اپنی نبوت کا کام بھی کرتے رہے اور باریک رنگ میں صلیب کی موت سے بھی بچا دیئے گئے۔

444- مُتَوَفِّيْكَ۔ [تَوَفَّاهُ اللّٰهُ اِذْ قَبَضَ نَفْسَهُ]۔ (ل) قَبَضَ رُوْحَهُ۔ (ت) یعنی محاورہ تَوَفَّاهُ اللّٰهُ کے معنی قبض نفس یا

قبض روح ہیں۔ تَوَفَّاهُ اللّٰهُ کوئی معنی سوائے قبض نفس یا روح کے کسی لغت میں نہیں آئے۔ چونکہ یہاں زیر بحث خالی لفظ توفی نہیں بلکہ مُتَوَفِّيْكَ زیر بحث ہے جس میں اللہ تعالیٰ فاعل اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام بطور مخاطب مفعول ہیں اس لیے مُتَوَفِّيْكَ پر صرف تَوَفَّاهُ اللّٰهُ کے معنی سے ہی سند لائی جاسکتی ہے۔ اور تمام اہل لغت نے تَوَفَّاهُ اللّٰهُ کے محاورہ کو تسلیم کر کے الگ لکھا اور اس کے خاص معنی قبض یا روح یا قبض نفس دیئے ہیں اور یہ معنی نہ صرف لغت سے ثابت ہیں بلکہ خود قرآن کریم نے بھی صراحت فرمائی ہے: ﴿ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَ الَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا﴾ [الزمر: 42:39] ''اللہ روحوں کو قبض کرتا ہے ان کی موت کے وقت اور جو مرے نہیں ان کی نیند میں۔'' اللہ کا نفوس کا توفی کرنا یا موت کے وقت ہوتا ہے اور جو مرتے نہیں ان کی نیند میں بھی توفی نفس کرتا ہے تیسری کوئی صورت نہیں۔ پس مُتَوَفِّيْكَ کے معنی سوائے تیری روح قبض کرنے والا کے اور کچھ نہیں ہو سکتے۔ ہاں یہ سوال رہ جاتا ہے کہ یہاں مراد نیند میں قبض نفس ہے یا موت کے وقت۔ سو اس پر آگے بحث ہوگی۔

اس میں شک نہیں کہ تَوَفّٰى وَفٰى سے ہے جس کے معنی پورا کرنا ہیں۔ مگر خاص ابواب میں یا خاص محاورات میں جا کر جو معنی ایک لفظ اختیار کرتا ہے ان کا مدار قیاس پر نہیں بلکہ سماع پر ہے۔ اگر لغت کا مدار بجائے سمع کے قیاس پر رکھا جائے تو آج سب الفاظ کے معانی سے امن اٹھ جاتا ہے۔ پس وَفٰى نے جو معنی باب تفعل میں اور اس باب کے اس خاص محاورہ تَوَفَّاهُ اللّٰهُ میں آخر اختیار کر لیے ہیں ان پر سماع کی شہادت سوائے قبض روح کے چونکہ اور کچھ نہیں اس لیے قیاس سے ہم نہیں کہہ سکتے کہ چونکہ وَفٰى کے معنی پورا کرنا ہیں اس لیے تَوَفَّاهُ اللّٰهُ کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اللہ نے اسے مع جسم لے لیا۔ تَوَفَّاهُ اللّٰهُ میں صرف نفس یا روح کا لینا اہل لغت کا فیصلہ ہے اور اشعار جاہلیت کی، قرآن کریم کی، حدیث کی، علم ادب کی ایک بھی مثال اس کے خلاف پیش نہیں کی جاسکتی۔

اور تَوَفَّاهُ اللّٰهُ صرف انسانوں پر بولا جاتا ہے نہ دوسرے حیوانات پر اور صرف نیند ہی پر یا موت پر ہی بول سکیں گے اور جس طرح مجنون پر باوجود اس کی قوت عاقلہ ممیزہ کے جاتے رہنے کے تَوَفَّاهُ اللّٰهُ کا استعمال جائز نہیں حالانکہ نیند پر توفی کے استعمال کی یہی وجہ بیان کی گئی ہے کہ قوت ممیزہ عاقلہ جاتی رہتی ہے۔ اسی طرح پر اگر یہ ممکن ہے کہ ایک شخص مع جسد عنصری آسمان پر چلا جائے تو اس پر بروئے لغت عرب تَوَفَّاهُ اللّٰهُ کا محاورہ بولنا جائز نہیں۔ اس کے لیے کوئی اور لفظ چاہیے اور لغت اور قرآن کریم کی اس شہادت کے مطابق ہی امام المفسرین حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے مُتَوَفِّيْكَ کے معنی خود بخاری میں مُمِيْتُكَ مروی ہیں یعنی تجھے موت دینے والا ہوں۔

متوفیک پر مفسرین کے خیالات:

چونکہ یہ معنی اس عقیدہ کے خلاف تھے جو عیسائیوں میں مروج ہونے کی وجہ سے غلطی سے مسلمانوں میں بھی پیدا ہو گیا کہ حضرت مسیح علیہ السلام زندہ ہیں۔ اور دوسری طرف اس کو نزول ابن مریم کی پیشگوئی کی حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے قوت مل گئی اس لیے ان معنوں کی کسی نے تو یوں توجیہ کر دی کہ موت کے بعد پھر زندہ کر دیا جو احیائے موتی کے اصول کے خلاف ہے۔ جس کا ذکر [نمبر: 434] میں ہو چکا اور بعض نے کہا تقدیم و تاخیر ہے اور یہ بات حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف بعض روایات میں منسوب کر دی

گئی ہے۔حالانکہ امام بخاری رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مُتَوَفِّيْكَ کے معنی مُمِيْتُكَ روایت کرتے ہوئے تقدیم وتاخیر کو قبول نہیں کیا اور اسی لیے روایت کے اس حصہ کو غلط سمجھ کر چھوڑ دیا ہے۔پس قرآن وحدیث،لغت اور امام المفسرین کی شہادت سب اس بات پر ہے کہ یہاں مُتَوَفِّيْكَ کے معنی موت دینے والا ہیں اور جن لوگوں نے مُتَوَفِّيْكَ کے معنی [مُسْتَوْفِّ شَخْصَكَ مِنَ الْاَرْضِ] کیے ہیں یعنی تیرے وجود کو زمین سے پورا لینے والا ہوں یا [اٰخِذُكَ وَافِيًا بِرُوْحِكَ] کیے ہیں تجھے تیری روح کے ساتھ پورا لینے والا ہوں یا موت قوائے شہوانیہ مراد لیے ہیں انہوں نے لغت میں قیاس کو دخل دے کر خود معنی بنا لیے ہیں۔جن پر کوئی شہادت لغت کی قطعاً نہیں۔اسی لیے محتاط مفسرین کو باوجود اس خیال کے بھی اسی طرف جانا پڑا کہ مُتَوَفِّيْكَ کے معنی موت دینے والا ہوں ہی ہیں۔ہاں انہوں نے اپنے خیال کے قائم رکھنے کو یہ بات بڑھادی ہے کہ کچھ وقت وفات پا کر پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہو گئے تھے۔جیسا کہ ابن جریر نے وہب سے یہ روایت کی ہے: [قَالَ تَوَفَّى اللّٰهُ عِيْسٰى ثَلَاثَ سَاعَاتٍ مِنَ النَّهَارِ] (الکشف والبیان: جلد3، صفحہ 81) یعنی انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کو تین گھڑی دن کی مردہ رکھا اور حاکم نے ان ہی سے روایت کی ہے: [اِنَّ اللّٰهَ تَوَفَّى عِيْسٰى سَبْعَ سَاعَاتٍ ثُمَّ اَحْيَاهُ] (الدر المنثور:جلد2، صفحہ 225) کہ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو سات گھڑی مردہ رکھا پھر زندہ کیا اور بعض نے کہا یہاں مُتَوَفِّيْكَ سے مراد ہے تجھے سلانے والا ہوں اور پھر اس کی وجہ یہ بتائی [اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى رَفَعَ عِيْسٰى اِلَى السَّمَاءِ وَهُوَ نَائِمٌ رِفْقًا بِهٖ] (الکشف والبیان:جلد10، صفحہ 170) کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے نرم معاملہ کرنے کے لیے ان کو آسمان پر نیند کی حالت میں اٹھایا۔پھر اتارتے وقت ایک اور توفی وارد کرنی ہوگی اس کا بھی کہیں ذکر ہونا چاہیے تھا۔مگر قرآن شریف نے ایسا ذکر نہیں کیا نہ کسی حدیث میں ہے۔اور بعض نے کہہ دیا کہ یہاں ترتیب مراد نہیں یعنی توفی پہلے نہیں بلکہ رفع کے بعد ہے۔

مگر یہاں چار باتیں ہیں: توفی،رفع،تطہیر،فوقیت متبعین۔مُتَوَفِّيْكَ کو اگر اپنی جگہ سے اٹھایا جائے تو پھر اس کے لیے کوئی بھی موزوں جگہ نہیں۔رفع کے بعد تطہیر سے پہلے اسے نہیں رکھا جا سکتا کیونکہ تطہیر تو ہو چکی اور توفی قائلین حیات کے نزدیک ابھی ہوئی نہیں۔تطہیر کے بعد اور فوقیت سے پہلے بھی اسے نہیں رکھا جا سکتا۔کیونکہ فوقیت بھی ہو چکی اور فوقیت کے بعد بھی نہیں رکھا جا سکتا۔اس لیے کہ اس کا زمانہ قیامت تک ممتد ہے۔تو اس صورت میں وفات گویا بعد قیامت ہوئی۔جو بالبداہت باطل ہے۔پس حق یہی ہے کہ جو ترتیب قرآن کریم نے رکھی ہے وہی درست ہے۔پہلے توفی ہے،پھر رفع،پھر تطہیر،پھر فوقیت۔

<u>حضرت مسیح کی وفات</u> کے نام پر بعض لوگ باوجود اس تشریح جو قرآن شریف میں موجود ہے بہت گھبراتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ یہ کوئی نیا عقیدہ ہے جو اسلام میں داخل کیا جا رہا ہے اور سمجھتے ہیں کہ قرآن شریف اور احادیث میں حضرت عیسیٰ کے زندہ برآسمان ہونے کا ذکر ہے۔حالانکہ نہ صرف قرآن شریف وحدیث میں حیات مسیح کا مطلق کوئی ذکر نہیں بلکہ دونوں جگہ آپ کی وفات کا ذکر ہے۔اور حیات مسیح پر جو اجماع امت سمجھا جاتا ہے اس کا یہ حال ہے کہ چار آئمہ میں سے ایک امام مالک کھلے طور پر وفات مسیح کے قائل ہیں۔چنانچہ یہ ان کا عقیدہ عنبسیہ اور مجمع البحار میں صاف الفاظ میں لکھا ہوا موجود ہے،[قَالَ مَالِكٌ مَاتَ]۔اور باقی تین اماموں میں سے صراحت سے کوئی حیات مسیح کا قائل نہیں۔پس اصل عقیدہ اہل سنت والجماعت کا

وَ رَافِعُكَ اِلَيَّ وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ اور تجھے اپنی طرف بلند کرنے والا ہوں(445) اور تجھے

وفات مسیح ہے نہ حیات مسیح۔ پھر یہ بھی غور نہیں کیا جاتا کہ اس وقت عیسائی کس قدر مسلمانوں کے اس شہرت یافتہ خیال سے کہ حضرت مسیح علیہ السلام زندہ آسمان پر ہیں فائدہ اٹھا رہے ہیں اور ناواقف مسلمانوں کو یہ کہہ کر گمراہ کر رہے ہیں کہ تمام رسول بروئے قرآن کھانے کے محتاج تھے۔ مگر مسیح علیہ السلام کا جسم ایسا ہے کہ وہ دو ہزار سال سے زندہ آسمان پر موجود ہیں مگر اس طرح کھانے پینے کے محتاج نہیں جس طرح تمام بشر حتی کے رسول بھی اس جسم عنصری کی زندگی میں ہوتے ہیں اور اس سے جو نتیجہ نکلتا ہے اس کا انکار نہیں ہوسکتا کہ اس صورت میں مسیح اَلْاٰنَ كَمَا كَانَ کے مصداق ہوئے۔ ان کی جسم خاکی میں کوئی تغیر نہیں آتا اور یہ مخلوق کی نہیں بلکہ خالق کی صفت لازم ہے۔ اس لیے مسیح بشر سے نرالا اور خالق کی صفات میں شریک ہے۔ اس طرح پر مسیح کی خدائی کو جس کے لیے ایک بھی دلیل کسی عیسائی کے ہاتھ میں نہیں، ثابت کرنے کے لیے مسلمانوں کا حیات مسیح کا عقیدہ کافی ہے۔ قرآن کریم کی بہت سے آیات ہیں جن سے حضرت مسیح کا وفات یافتہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔ مگر ان پر اپنے اپنے موقعہ پر بحث آئے گی۔ آیت زیر بحث اکیلی بھی اس کو ثابت کر رہی ہے۔ کیونکہ اگر مُتَوَفِّيْكَ کا وعدہ پورا نہیں ہوا تو باقی وعدے جو اس کے بعد آتے ہیں وہ بھی پورے نہیں ہوئے اور یہ بالبداہت باطل ہے۔ اور یہ درحقیقت پچھلے رکوع کی آخری آیت کا جواب بھی ہے کہ دشمن تو تم کو صلیب کی موت مارنا چاہتے ہیں جو لعنتی موت ہے میں باریک تدبیر سے تمہیں بچاؤں گا اور طبعی موت ماروں گا۔ احادیث میں جہاں کوئی حدیث مرفوع حضرت مسیح کے زندہ ہونے یا آسمان پر مع جسد عنصری اٹھائے جانے پر نہیں ہے۔ <u>بہت سی احادیث سے حضرت مسیح کی وفات ثابت ہوتی ہے</u>۔ مثلاً مشہور حدیث معراج جس میں آپ نے حضرت عیسیٰ اور حضرت یحییٰ کو ایک ہی جگہ پر دیکھا۔ حالانکہ اگر حضرت عیسیٰ زندہ تھے تو وفات یافتہ انبیاء میں ان کا کیا کام تھا۔ پھر وہ حدیث جس میں صاف یہ لفظ آتے ہیں: [لَوْ كَانَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى حَيَّيْنِ لَمَا وَسِعَهُمَا إِلَّا اِتِّبَاعِيْ] (تفسیر ابن کثیر: جلد2، صفحہ 68) اگر موسیٰ وعیسیٰ زندہ ہوتے تو انہیں میرا اتباع کرنا پڑتا۔ اور وہ حدیث جس میں ہے: [أَنَّ عِيْسٰى عَاشَ عِشْرِيْنَ وَمِائَةَ سَنَةٍ] عیسیٰ ایک سو بیس برس زندہ رہے اور یہ وہ بات ہے جو نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں جبریل نے مجھے بتائی۔ پس وفات مسیح کا عقیدہ نہ صرف قرآن وحدیث سے ثابت ہے بلکہ آئمہ اہل سنت والجماعت کے چار آئمہ میں سے ایک امام کا کھلا مذہب ہے اور باقی تین خاموش ہیں۔ اور آج وفات مسیح کو مان کر مسلمان عیسائی مذہب کی قوت کو ایسا توڑ سکتے ہیں کہ پھر یہ سر اٹھانے کے قابل نہیں رہتا۔

445- ﴿رَافِعُكَ اِلَيَّ﴾ رَفَعَ کے چہار گونہ استعمال پر [دیکھو نمبر: 93] اور انسان کے رفع سے مراد بلندی درجات ہونے پر [دیکھو نمبر: 325] لسان العرب میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں الرافع ہے جس سے مراد ہے وہ جو مومن کو سعید بنا کر اور اپنے اولیاء کو قرب عطا کر کے رفع فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء میں اس لفظ کا آنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جہاں اللہ تعالیٰ کے انسانوں کو رفع کرنے کا ذکر ہو وہاں مراد بلندی درجات اور قرب کا عطا کرنا ہوتا ہے نہ ایک نیچی جگہ سے اٹھا کر کسی بلند جگہ پر ان کو رکھ دینا۔ پس امام راغب نے جو چار معنی رفع کے دیئے ہیں ان میں سے چوتھے معنی یعنی مرتبہ کی بلندی یہاں صادق آئیں گے کیونکہ یہ انسان کا

رفع ہے جو اللہ تعالیٰ کرتا ہے اور یہ رفع اس کے اسم الرافع کے ماتحت ہی ہوگا۔ رفع کے یہ معنی عام طور پر زبان عرب میں مروج ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں: [نِسَاءٌ مَرْفُوْعَاتٌ] جس کے معنی لسان العرب میں دیئے ہیں [نِسَاءٌ مُكَرَّمَاتٌ] یعنی معزز عورتیں۔ اور ﴿وَّ فُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ﴾ [الواقعة: 34:56] ''اور بلند فرش۔'' قرآن کریم میں آتا ہے اس کے معنی دیئے ہیں [اَیْ مَقْرَبَةٌ لَهُمْ] یعنی جو ان کے قریب کیے جائیں گے۔ ایسا ہی قیامت کے متعلق قرآن شریف میں آتا ہے: ﴿خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ﴾ [الواقعة: 3:56] جس کے معنی زجاج نے یوں کیے ہیں: ''گنہگاروں کو ذلیل کر دے گی اور فرمانبرداروں کا رفع کرے گی۔'' یعنی ان کے مراتب بلند کرے گی اور ﴿فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ﴾ [النور: 36:24] ''یہ نور ان گھروں میں ہے جو اللہ نے حکم دیا ہے کہ بلند کیے جائیں۔'' میں تُرْفَعَ کے معنی لکھے ہیں تُعَظَّمَ۔ (ل) ان کو عظمت دی جائے۔ اور قرآن کریم میں جہاں جہاں اللہ تعالیٰ کے انسانوں کو رفع کرنے کا ذکر آتا ہے وہاں رفع کے معنی صرف قرب ہیں نہ جسم کا بلند کرنا۔ ﴿وَ لَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا﴾ [الأعراف: 176:7] ''اور اگر ہم چاہتے تو ان کے ذریعے اس کا مرتبہ بلند کرتے۔'' جہاں تفاسیر میں بھی [رَفَعَ اِلٰی مَنَازِلِ الْاَبْرَارِ۔ (ض) یا [اِلٰی مَنَازِلِ الْعُلَمَاءِ اِلَی الْجَنَّةِ۔ (ف) وغیرہ لکھا ہے۔ یعنی نیکوں یا علماء کے مقام کی طرف یا جنت کی طرف اور اسی آیت کے نیچے ابن جریر لکھتے ہیں: [وَالرَّفَعَ یَعُمُّ مَعَانِیْ كَثِیْرَةً مِنْهَا الرَّفْعُ فِی الْمَنْزِلَةِ عِنْدَهُ وَ مِنْهَا الرَّفْعُ فِیْ شَرَفِ الدُّنْیَا وَ مَكَارِمِهَا وَ مِنْهَا الرَّفْعُ فِی الذِّكْرِ الْجَمِیْلِ وَالثَّنَاءِ الرَّفِیْعِ]۔ (تفسیر الطبری: جلد13، صفحہ 269) یعنی ''رفع بہت سے معنوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے اللہ تعالیٰ کے حضور بلندی مرتبہ ہے۔ ان میں سے دنیا میں عزت اور مکرمت کا مقام ہے اور ان میں سے اچھے ذکر اور ثنائے بلند میں رفع ہے۔'' لیکن اللہ تعالیٰ کا انسان کو رفع کرنا صرف ایک ہی معنی یعنی بلندی درجات میں آتا ہے اور کبھی کسی دوسرے معنی میں نہیں آیا۔

احادیث رفع کے معنی کا قطعی فیصلہ کر دیتی ہے، سب سے زیادہ قابل غور وہ دعا ہے جو بین السجدتین کی جاتی ہے جس میں یہ لفظ آتے ہیں وَارْفَعْنِیْ اے خدا مجھے رفع دے۔ کیا آج تک کسی مسلمان کے وہم میں یہ گزرا ہے کہ اس دعا کا منشا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں جسم سمیت آسمان پر اٹھالے۔ بلکہ اگر اللہ کے انسان کو رفع کرنے کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں تو یہ دعا تو آج تک کسی مسلمان کی قبول نہ ہوئی۔ کیونکہ کوئی مع جسم آسمان پر نہ گیا۔ ترمذی میں ایک حدیث میں ہے: [یُرِیدُ النَّاسُ أَنْ یَضَعُوْهُمْ وَیَأْبَی اللّٰهُ إِلَّا أَنْ یَرْفَعَهُمْ] (جامع الترمذي، كتاب المنافق، باب في فضل اليمن : 3937) ''لوگ چاہتے ہیں کہ ان کو ذلیل کریں اور اللہ تعالیٰ ان کے رفع کے سوائے اور کچھ نہیں چاہتا۔'' یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو مع جسم آسمان پر اٹھالے جانا چاہتا ہے۔ پھر احادیث تواضع میں بار بار آتا ہے کہ جو تواضع کرے اللہ تعالیٰ اس کا رفع کرتا ہے: [فَتَوَاضَعُوا یَرْفَعُكُمُ اللّٰهُ] (كنز العمال:جلد3، صفحہ110، حدیث: 5719) اور ایک حدیث میں آتا ہے: [فَإِذَا تَوَاضَعَ رَفَعَهُ اللّٰهُ بِالسِّلْسِلَةِ إِلَی السَّمَاءِ السَّابِعَةِ] (كنز العمال: جلد3، صفحہ115، حدیث: 5745) جب بندہ تواضع کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے زنجیر کے ساتھ ساتویں آسمان پر رفع کرتا ہے۔ یہاں رفع بھی ہے، ساتواں آسمان بھی ہے، زنجیر بھی ہے مگر پھر بھی رفع جسم مراد نہیں بلکہ قرب مراد ہے۔ پس لغت، قرآن شریف، حدیث سب اس بات پر متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے انسان کو رفع کرنے سے ہمیشہ اور ہر حال میں مراد قرب عطا کرنا ہوتا ہے خواہ کتنے بھی قرائن اس کے خلاف ہوں۔ اور ایک بھی نظیر نہیں جہاں اللہ کے

كَفَرُوْا وَ جَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ ان (کے الزام) سے پاک کرنے والا ہوں جو کافر ہیں،(446) اور جنہوں نے تیری پیروی کی انہیں ان

انسان کو رفع کرنے کے معنی سوائے اس کے کچھ اور آتے ہوں۔

خدا کی طرف جانا یا رفع سے مراد:

اسی معنی پر ایک قرینہ ﴿رَافِعُكَ اِلَيَّ﴾ میں لفظ اِلَيَّ بھی ہے۔ کیونکہ یہ رفع اللہ تعالیٰ کی طرف ہے آسمان کی طرف رفع کا ذکر قرآن کریم میں کہیں نہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کوئی جسم نہیں جو آسمان پر ہو اور اس پر اتفاق ہے کہ اللہ کا مکان میں ہونا ممتنع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں جہاں اللہ کی طرف یا رب کی طرف جانے کا ذکر ہو کبھی بھی مراد انتقال جسمانی نہیں ہوتا بلکہ قرب روحانی مراد ہوتا ہے۔ جیسے: ﴿ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ﴾ [الفجر: 28:89] ''اپنے رب کی طرف لوٹ آ'' ﴿اِنَّآ اِلَيْهِ لَرٰجِعُوْنَ﴾ [البقرة: 156:2] ''اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔'' ﴿اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ﴾ [الصّٰفّٰت: 99:37] ''میں اپنے رب کی طرف جانے والا ہوں۔'' ﴿اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا﴾ [المزمل: 19:73] ''اپنے رب کی طرف رستہ اختیار کرے۔'' امام رازی نے تفسیر کبیر میں صفائی سے لکھ دیا ہے: [رَفَعَهُ فِيْ قَوْلِهِ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ هُوَالرِّفْعَةُ بِالدَّرَجَةِ وَالْمُنْقَبَةِ، لَا بِالْمَكَانِ وَالْجِهَةِ] (تفسیر رازی: جلد1، صفحہ 1158) یعنی رَافِعُكَ إِلَيَّ میں رفع سے مراد درجہ اور مرتبہ میں بلندی ہے نہ مکان اور جہت کی بلندی۔

446- **حضرت عیسیٰؑ کی تطہیر:** ﴿مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ طہارت دو طرح پر ہے ایک طہارت جسم اور دوسرا طہارت نفس۔ طہارت جسمانی تو یہاں مراد ہی نہیں ہو سکتی۔ طہارت نفس کے معنی عموماً مفسرین نے لیے ہیں اور معنی یوں کیے ہیں: [مُخْرِجُكَ مِنْ جُمْلَتِهِمْ وَ مُنَزِّهُكَ اَنْ تَفْعَلَ فِعْلَهُمْ] (غ) یعنی ان کی (یعنی کافروں کی) جماعت سے باہر نکالنے والا اور تمہاری تنزیہ کرنے والا اس امر سے کہ تم ان کے افعال کرو مگر ظاہر ہے کہ یہ معنی یہاں نہیں لگتے اس لیے کہ کافروں کے فعل کرنے سے پاک کرنا تو نبوت سے پہلے کا واقعہ ہے، نہ نبی بنایا جانے کے بعد کا؛ بلکہ نبی تو فطرتاً ہی گناہ سے پاک کیا جاتا ہے۔ پھر ایسا وعدہ دینے کی ضرورت کیا تھی اور بعض نے کہا: [تَطْهِيْرُهٗ عَلَيْهِ السَّلَامُ بِتَبْعِيْدِهٖ مِنْهُمْ بِالرَّفْعِ] (ر) یعنی رفع کر کے ان سے دور کر دینا ہی تطہیر تھی مگر یہ بھی تحصیل حاصل ہے اس تَبْعِيْد کا ذکر تو رافع میں آ چکا دوبارہ اس کے کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ ﴿مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ میں درحقیقت ایک اور قسم کی تطہیر مراد ہے۔ انبیاء ویسے تو مطہر ہی ہوتے ہیں مگر لوگ ان پر جھوٹے الزامات لگا کر ان کو نعوذ باللہ ناپاک مشہور کرتے ہیں۔ **ان جھوٹے الزامات کی قرار واقعی تردید بھی درحقیقت ایک تطہیر ہے۔** اور یہ بعینہٖ اسی طرح ہے جس طرح ہمارے نبی کریم ﷺ کے متعلق فرمایا: ﴿لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ﴾ [الفتح: 2:48] ''تاکہ اللہ ان قصوروں سے تیری حفاظت کرے جو تیرے ذمے پہلے لگائے گئے اور جو پیچھے لگائے جائیں گے۔'' جہاں مراد وہ ذنوب ہیں جو دوسرے لوگ آپ کی طرف منسوب

الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا

ان پر جنہوں نے انکار کیا قیامت کے دن تک فوقیت دینے والا ہوں۔ (447) پھر میری ہی طرف تمہارا لوٹ آنا ہے۔ پس میں تمہارے درمیان ان باتوں میں فیصلہ

کرتے تھے۔ پس انبیاء کی تطہیر اور غفر تو پہلے سے ہو چکا ہوتا ہے آئندہ جس تطہیر اور غفر کا وعدہ ہوتا ہے وہ ان امور سے تطہیر اور غفر ہے جو دشمن ان کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

447- اِتَّبَعُوْكَ۔ تَبِعَ اور اِتَّبَعَ کے معنی ہیں اس کے نقش قدم پر چلا۔ (غ) حقیقی معنی تو یہی ہیں۔ مگر چونکہ ہر ایک متبع کامل طور پر نقش قدم پر چلنے والا نہیں ہوسکتا، اس لیے ﴿الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ﴾ میں وہ لوگ بھی داخل ہو سکتے ہیں جو صرف نقش قدم پر چلنے کا دعویٰ کرتے ہوں۔ **جن مفسرین نے اس سے مراد مسلمانوں کو لیا ہے سخت غلطی کھائی ہے** اس سے مراد صرف عیسائی ہیں اور مسلمان حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متبع نہیں بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متبع ہیں۔ ابھی حدیث نقل ہو چکی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اگر موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو وہ میرے متبع ہوتے۔ پس مسلمان حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متبع نہیں اور اسی کی طرف قرآن کریم نے خود بھی رہنمائی فرمائی ہے۔ کیونکہ دوسری جگہ صاف فرمایا: ﴿فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَ كَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ ۚ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ﴾ [الصف: 14:61] ''سو بنی اسرائیل سے ایک گروہ ایمان لایا اور ایک گروہ نے انکار کیا۔ سو ہم نے مومنوں کی ان کے دشمنوں کے مقابلہ میں تائید کی سو وہ غالب ہو گئے۔''

فوق کا استعمال بلحاظ مکان اور زمانہ اور جسم اور عدد اور مرتبہ کے ہوتا ہے۔ یہاں مفسرین کو بالاتفاق تسلیم کرنا پڑا ہے کہ فوقیت مکانی مراد نہیں اور یہاں فوقیت سے غلبہ بلحاظ دلائل مراد لیا ہے یا ظاہری غلبہ یعنی حاکم ومحکوم کا۔ [يَعْلُوْنَهُمْ بِالْحُجَّةِ اَوِ السَّيْفِ]۔ (ض)

﴿الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ سے مراد کل غیر عیسائی یا غیر مسلم نہیں بلکہ صرف وہ لوگ **جو بالخصوص حضرت مسیح کا کفر کریں** اور اس لیے ان الفاظ میں صرف یہود کا ذکر مقصود ہے کہ وہ کل انبیائے بنی اسرائیل کو مانتے چلے آئے مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کر دیا۔

یہاں حضرت مسیح کو کل چار وعدے دیئے گئے ہیں۔ جو بجواب تدابیر کفار ہیں جن کا ذکر پچھلی آیت میں الفاظ مَكَرُوا میں صاف طور پر فرمایا ہے۔ ان چار وعدوں میں سے پہلا وعدہ ہے کہ تمہیں طبعی موت سے وفات دوں گا۔ دوسرا وعدہ ہے کہ تمہارا اپنی طرف رفع کروں گا یعنی اپنا قرب عطا فرماؤں گا۔ تیسرا وعدہ کہ ان الزامات سے جو تم پر لگائے جائیں گے تم کو پاک وصاف کروں گا اور چوتھا وعدہ ہے فوقیت یعنی حضرت مسیح کے نام لیوا آپ کے منکروں پر بذریعہ دلائل یا قہری طور پر غالب رہیں گے۔ قرآن کریم کا لفظ لفظ اپنے اندر اعجاز رکھتا ہے۔ یہودیوں کی تدبیر کا ذکر تھا۔ وہ تدبیر کیا تھی؟ حضرت عیسیٰ کو بذریعہ صلیب مارنا۔ تو اول تو بذریعہ صلیب مارنے کی نفی کی اور اس کا جواب دیا مُتَوَفِّيْكَ بذریعہ صلیب تمہیں نہیں مار سکیں گے۔ بلکہ تم اپنی طبعی موت سے مرو گے۔ پھر صلیب پر مارنے کا نتیجہ تھا کہ ایسا شخص ملعون ہو۔ کیونکہ [استثناء: 22:21, 23] میں صلیب کا

كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۵۵﴾

کروں گا جن میں تم اختلاف کرتے تھے۔ (448)

فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۫ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۵۶﴾

سو وہ جنہوں نے انکار کیا ان کو دنیا اور آخرت میں سخت دکھ کا عذاب دوں گا، اور ان کے لیے کوئی بھی مددگار نہ ہوگا۔ (449)

ذکر کر کے لکھا ہے: ''کیونکہ وہ جو پھانسی دیا جاتا ہے خدا کا ملعون ہے۔'' اور [گلیتون: 13:3] میں پولوس کہتا ہے: ''کیونکہ لکھا ہے جو کوئی کاٹھ پر لٹکایا گیا سو لعنتی ہے۔'' اور ملعون کے معنی ہیں خدا سے دور۔ اس لیے اس نتیجہ کی نفی کی کہ وہ خدا سے دور نہیں بلکہ مرفوع یعنی خدا کا مقرب ہوگا۔ پھر صلیب پر مار کر اور کذاب مشہور کر کے غلط الزامات کا آپ پر لگانا تھا۔ جیسے مثلاً یہ کہ آپ ناجائز تعلق سے پیدا ہوئے جیسا کہ ﴿قَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا﴾ [النساء: 156:4] ''ان کے مریم پر بڑا بہتان باندھنے کی وجہ سے۔'' سے ظاہر ہے۔ اس کی نفی ﴿مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ میں کی۔ یعنی فرمایا کہ تم پر سے یہ الزامات بھی دور کروں گا۔ یا یہ کہ تم پر سے ملعون ہونے کے الزام کو بھی دور کروں گا جو دوسرا نتیجہ صلیب کا ہے اور پھر وہ مصلوب کر کے تم کو ناکام کرنا چاہتے ہیں۔ سو میں تمہارے پیروؤں کو تمہارے منکروں پر قیامت تک غالب رکھوں گا۔

اور چاروں وعدوں میں ایک اور بھی لطیف ترتیب ہے۔ رفع یعنی حقیقی قرب کا مقام بعد وفات ہی حاصل ہوتا ہے۔ جب سارے حجاب دور ہو جاتے ہیں۔ پس توفی کے بعد رفع فرمایا تو جب مقام قرب عطا ہوتا ہے تو دوسری طرف مخلوق میں بھی محبت اور عزت بڑھتی ہے۔ یہی آپ کی تطہیر یعنی الزامات سے پاک کیا جانا ہے اور عزت اور محبت کے بعد متبعین کی کثرت اور غلبہ کا ہونا لازمی امر ہے۔ اس آیت سے یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ خیال کہ کبھی حضرت عیسیٰ پھر آئیں گے تو سارے اہل کتاب ان پر ایمان لے آئیں گے، قرآن کریم کے خلاف ہے۔ اس لیے کہ **قرآن شریف قیامت تک مسیح کے پیروؤں اور مسیح کے منکروں کا وجود ضروری قرار دیتا ہے۔**

448- ان الفاظ میں یہ بتایا ہے کہ اختلاف عقائد کا فیصلہ قیامت کے دن ہی ہوگا۔ یعنی دنیا میں اختلاف عقائد کا فیصلہ کبھی نہیں ہوتا اور اختلاف عقائد قیامت تک رہے گا۔ اس سے بھی ان لوگوں کا خیال باطل ثابت ہوتا ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پھر آئیں گے تو اختلاف عقائد دنیا سے مٹ جائے گا اور اس دنیا میں ہی سب فیصلے ہو جائیں گے۔

449- **مسیح کے منکروں کے لیے عذاب دنیا:** جس اختلاف پر فیصلہ کا ذکر پچھلی آیت میں کیا تھا، اب اس کی تفصیل فرماتا ہے کہ اختلاف کرنے والوں میں سے ایک گروہ تو حضرت عیسیٰ کے منکروں کا ہے ان کو دونوں جگہ سزا ملے گی، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ سو یہود کی دنیا کی سزا اظہر من الشمس ہے۔ یہ قوم باوجود مالدار ہونے کے ہمیشہ دنیا میں ذلیل رہی ہے اور جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو کوئی ان کا یار و مددگار نہیں بنتا۔ ذلت سے بڑھ کر کوئی دکھ کا عذاب نہیں۔

وَ اَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝۵۷

اور جولوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے سو ان کے اجر اُن کو پورے دے گا، اور اللہ ظالموں سے محبت نہیں کرتا۔ (450)

ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَ الذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ۝۵۸

یہ ہم آیتوں اور حکمت والے ذکر سے تجھ پر پڑھتے ہیں۔ (451)

450- اَلظَّالِمِيْنَ۔ ظُلْمٌ کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 55] جہاں دکھایا گیا ہے کہ شرک بھی ایک ظلم ہے اور قرآن کریم میں ہے: ﴿اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ﴾ [لقمان: 13:31] سب سے بڑا ظلم شرک ہے اور وہی یہاں مراد ہے اس لیے کہ یہ مسیح کو خدا بنانے والوں کا ذکر ہے۔

عیسائیوں کے دو گروہ:

یہ ماننے والوں کا گروہ ہے جس کے یہاں دو حصے کر دیئے ہیں۔ ایک حصہ ﴿الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ والوں کا ہے یعنی وہ جو عقیدہ بھی صحیح رکھتے تھے اور عمل بھی اچھے کرتے تھے اور دوسرا حصہ اَلظّٰلِمِيْنَ کا ہے جس سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا ماننے والے ہیں اور ﴿لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ﴾ میں اسی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ وہ خدا کی محبت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اسی لیے فرمایا کہ وہ مشرک ہیں ان کا دعویٰ محبت جھوٹا ہے، خدا ان سے محبت نہیں کرتا۔ اس لیے بھی پہلے گروہ کے ساتھ جو حضرت مسیح کے صحیح معنی میں متبع تھے ﴿عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ کی شرط لگا دی ہے کہ یہ دوسرا گروہ کفارہ کو اصل بنیاد قرار دے کر اعمال صالحہ سے محروم ہو گیا ہے۔

451- اَلْاٰيٰتُ سے مراد یہاں حجج یا دلائل ہیں جو اوپر گزر چکی ہیں جن کی طرف لفظ ذٰلِكَ میں اشارہ بھی کیا ہے کیونکہ اٰيَةٌ کا استعمال محسوسات اور معقولات دونوں میں ہوتا ہے۔

اَلذِّكْرُ۔ اصل میں یاد کرنے یا یاد دلانے کو کہا جاتا ہے اور یہاں ذکر سے مراد قرآن کریم ہے کیونکہ ذکر قرآن شریف کے ناموں میں سے ایک نام ہے اور ذکر اس کو اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ ان تمام باتوں کو جو فطرت انسانی میں مرکوز ہیں یاد دلاتا ہے۔ یا اس لیے کہ وہ انسان کو شرف اور بزرگی کے مقام پر پہنچاتا ہے۔

اَلْحَكِيْمُ۔ یہاں ذکر یا قرآن شریف کی صفت ہے اور یہ لفظ قرآن شریف کی وصف میں اور جگہ بھی آیا ہے: ﴿يٰسٓ ۚ وَ الْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۙ﴾ [يٰسٓ: 36:1-2] ''اے انسان (کامل)۔ حکمت والا قرآن گواہ ہے۔'' قرآن حکیم کو اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں اعلیٰ درجہ کی حکمت کی باتیں ہیں۔ (غ) جس پر قرآن کریم بھی شاہد ہے۔ ﴿وَ لَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْۢبَآءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ ۙ حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ﴾ [القمر: 54:4-5] ''اور یقیناً انہیں وہ باتیں پہنچ چکی ہیں، جن میں تنبیہ ہے۔ کامل دانائی

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۵۹﴾

بیشک عیسیٰ کی حالت اللہ کے نزدیک آدم کی حالت کی مانند ہے اسے مٹی سے پیدا کیا، پھر اسے کہا ہو جا پس وہ ہو جاتا ہے۔ (452)

(کی باتیں)۔''

حضرت مسیح کے حالات ان کی الوہیت کے خلاف دلیل ہیں:

یہاں بالخصوص آیات یعنی دلائل کا لفظ لانا اور پھر ان باتوں کو پُرحکمت قرار دینا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو کچھ اوپر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق کہا گیا ہے وہ دعویٰ نہیں بلکہ دلائل ہیں اور پرحکمت باتیں ہیں۔ ان کی پیدائش، ان کا بچپن، ان کی وفات کے حالات، ان کی تعلیم، ان کے نشانات یہ سب کچھ دلائل ہیں جو عیسائیت کے بطلان پر دی گئی ہیں۔ جو لوگ ان باتوں کو محض قصوں کہانیوں کی حد تک سمجھتے ہیں وہ یہاں لفظ حکیم کے لانے پر غور کریں۔

452- مَثَلَ کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 38]۔ یہاں مراد صفت یا حالت ہے اور فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی حالت اللہ کے نزدیک آدم کی حالت کی طرح ہے۔ اسے مٹی سے پیدا کیا۔ پھر اسے کہا ہو، سو وہ ہو گیا۔ آدم کا ذکر قرآن کریم میں دو رنگ میں آیا ہے۔ ابوالبشر ہونے کے لحاظ سے یعنی بشریت کے لوازمات تامہ اس میں پائے جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں میں سے ایک ہونے کے لحاظ سے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق جو کچھ اوپر ذکر ہوا اس میں بھی انہی دو باتوں کا ذکر ہے۔ یعنی حضرت عیسیٰ میں بشر ہونے کی ساری صفات پائی جاتی ہیں۔ اور دوسرے وہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں میں سے ایک ہیں۔ چنانچہ بشریت کے لحاظ سے آپ کی پیدائش، طفولیت، کہولت، وفات کا ذکر فرمایا۔ کیونکہ یہی باتیں بشر کو خدا سے الگ کرتی ہیں۔ بشریت کے تقاضوں میں سے ہی پیدا ہونا اور مرنا اور اس دنیا کی زندگی میں ان تغیرات کے ماتحت آنا ہے جو طفولیت سے لے کر کہولت تک انسان پر آتے ہیں۔ خدا نہ پیدا ہوتا ہے، نہ مرتا ہے، نہ اس پر تغیرات آتے ہیں کہ بچپن کی حالت سے ترقی کرتا کرتا ترقی کے آخری مرتبہ پر پہنچ کر پھر اس کے قویٰ میں تنزل واقع ہونا شروع ہو؛ اور برگزیدگی کے لحاظ سے آپ کے رسول ہونے اور دنیا میں ایک روحانی انقلاب پیدا کرنے اور رفعت مرتبہ وغیرہ کا ذکر ہے۔ پس جو کمال آدم میں اللہ تعالیٰ نے رکھا تھا وہ کمال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی دیا اور اس طرح پر عیسائیوں پر اتمام حجت کی اور اس اتمام حجت کا خلاصہ اس آیت میں ہے۔ یہ یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ اس سورت کے صدر میں عیسائیوں کے ساتھ ہی بحث ہے اور غرض اس سارے بیان کی حضرت مسیح میں لوازمات بشریت کا ثابت کرنا اور یہ ظاہر کرنا ہے کہ وہ خدا نہ تھا۔ پس ساری بحث کو اب بطور خلاصہ ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ جو کچھ باتیں آدم میں پائی جاتی ہیں یعنی بشریت اور برگزیدگی وہی عیسیٰ میں پائی جاتی ہیں۔ خدا تم اس کو کس بنا پر بناتے ہو؟ مماثلت کے لیے تو یہی دو امر کافی ہیں۔ بشریت اور برگزیدگی۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ صورت پیدائش میں مشابہت ہے۔ تو کوئی مشابہت فی الواقع نہیں آدم کو جس طرح بنایا۔ مسیح کو اس طرح نہیں بنایا۔ مسیح کو ماں کے پیٹ میں رکھا، پھر بچہ بنایا، پھر

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۶۰﴾

حق تیرے رب کی طرف سے ہے، پس تو جھگڑا کرنے والوں میں سے نہ ہو۔

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَ اَبْنَآءَكُمْ وَ نِسَآءَنَا وَ نِسَآءَكُمْ وَ اَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَكُمْ ۟ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ

پھر اگر کوئی اس کے بعد جو تیرے پاس علم آچکا اس کے بارے میں تجھ سے جھگڑا کرے، تو کہہ، آؤ ہم اپنے بیٹوں اور تمہارے بیٹوں کو اور اپنی عورتوں اور تمہاری عورتوں کو اور اپنے لوگوں اور تمہارے لوگوں کو بلائیں، پھر گڑگڑا کر

بڑھایا۔ آدم کی خلق کے متعلق جو کچھ صورت سمجھی جاتی ہے اس کی رو سے آدم پر یہ حالات نہیں گزرے۔ پس مشابہت صورت خلق میں نہیں نہ صورت خلق کا یہاں ذکر ہے۔ بلکہ بشریت اور برگزیدگی میں مشابہت ہے۔ اس لیے ﴿اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ﴾ بطور تمہید بھی اس سے پہلے بیان کیا ہے۔ ﴿كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ کا استعمال بھی یہی بتاتا ہے یعنی ہوجاتا ہے، کہا گیا نہ ہوگیا۔ جس سے استمرار پایا جاتا ہے۔ یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون رہا ہے کہ وہ انسانوں کو برگزیدگی کے مقام پر کھڑا کرتا رہا ہے۔

﴿خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ میں بھی انہی دو مذکورہ بالا باتوں کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے یعنی ﴿خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ﴾ یا مٹی سے پیدا کرنے میں بشریت کی طرف اشارہ ہے اور ﴿كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ میں برگزیدہ کیا جانے کی طرف کیونکہ خلق کے بعد کن کا امر یہی معنی رکھ سکتا ہے کہ اس کو ایک دوسری زندگی عطا فرمائی یعنی روحانی زندگی یا اپنا کلام اس میں نفخ کیا۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ مٹی سے پیدا کیا جانا کوئی آدم اور عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مخصوص امر نہیں۔ **بلکہ ہر فرد بشر کو اللہ تعالیٰ مٹی سے ہی پیدا کرتا ہے۔** چنانچہ سورہ کہف میں مومن اور کافر کے مکالمہ میں مومن کافر کو مخاطب کر کے کہتا ہے: ﴿اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا﴾ [الکھف: 37:18] تو اس ذات پاک کا انکار کرتا ہے جس نے تجھے مٹی سے پیدا کیا۔ پھر نطفہ سے پھر تجھے ٹھیک مرد بنایا۔ ایسا ہی سورۃ الحج میں فرمایا ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ﴾ [الحج: 22:5] ''اے لوگو! اگر تم بعثت کے بارے میں شک میں ہو تو غور کرو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ پس مٹی سے ہی سب نوع بشر پیدا ہوئی ہے۔'' ہاں پھر بعض کو اللہ تعالیٰ چن لیتا ہے اور ایک روحانی زندگی عطا فرماتا ہے۔ بن باپ پیدائش کا نہ یہاں کوئی ذکر ہے، نہ کوئی ایسا اعتراض موجود ہے جس کا جواب دیا ہو۔ کیونکہ اس کا ذکر اگر ہوتا تو وہاں ہوتا جہاں پیدائش کے حالات کا ذکر تھا۔ یہاں تو حضرت عیسیٰ کی وفات کے تذکرہ کے ساتھ ساری بحث کو ختم کر کے اس کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان فرماتا ہے۔ بلکہ فَيَكُوْنُ کا لفظ آخر پر مضارع لا کر بتا دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قانون ہر حال میں جاری ہے۔ صرف دو مخصوص مثالوں پر محدود نہیں۔

اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ﴿۶۱﴾ دعا کریں اور جھوٹوں پر اللہ کی لعنت کریں۔ (453)

453- تَعَالَوْا۔ اصل میں یہ لفظ (عَلُوٌّ سے مشتق ہونے کی وجہ سے) کسی بلند مکان کی طرف بلانے کے لیے آتا ہے۔ پھر ایک مکان کی طرف بلانے کے لیے یہاں مراد ہے۔ رائے اور عزم کو پختہ کر کے آؤ۔

نَبْتَهِلْ۔ [اَلْبَهْلُ وَالْاِبْتِهَالُ فِي الدُّعَاءِ الْاِسْتِرْسَالُ فِيْهِ وَالتَّضَرُّعُ] (غ) یعنی بہل اور ابتہال دعا میں ٹھہر ٹھہر کر مانگنا اور تضرع کرنا ہے۔ اور آگے لکھا ہے کہ جن لوگوں نے ابتہال کی تفسیر لعنت سے کی ہے وہ اس لیے ہے کہ اس میں ٹھہرنا لعنت کی غرض سے ہے۔ اور لسان العرب میں بھی ہے۔ [اِبْتَهَلَ فِي الدُّعَاءِ اِذَا اجْتَهَدَ] یعنی ابتہال دعا میں اجتہاد یا زور سے دعا کرنا ہے۔

دعوت مباہلہ عیسائیوں پر اتمام حجت کے لیے:

اس مضمون کو ان الفاظ سے شروع کیا ہے کہ اس کے بعد جو تیرے پاس علم آچکا یعنی دلائل جو اوپر دی گئیں ہیں، دلائل کی رو سے اتمام حجت کر دیا اور عیسائیوں نے دلائل کے قبول کرنے سے انکار کر دیا تو پھر مباہلہ کے لیے بلا یا یعنی بالمقابل دعا کرنے کے لیے اور دعا پر پورا زور لگانے کے لیے۔ یہ گویا ایک دوسرے رنگ کا اتمام حجت تھا۔ دعا کی قبولیت کے عیسائی بھی قائل ہیں اور انجیل میں ہے کہ متقی کی دعا سنی جاتی ہے۔ چنانچہ [عبرانیوں: 7:5] میں جہاں مسیح کے صلیب کی موت سے بچنے کے لیے رو رو کر دعائیں کرنے کا ذکر ہے: ''بہت رو رو اور آنسو بہا بہا کے اس سے جو اس کو موت سے بچا سکتا تھا دعائیں اور منتیں کیں۔'' وہاں اس دعا کی قبولیت کا ذکر ان الفاظ میں ہے: [وَسَمِعَ لَهُ مِنْ اَجْلَ تَقْوَاهُ] یعنی اس کے تقویٰ اور پرہیز گاری کی وجہ سے اس کی دعا سنی گئی۔ پس جب عیسائیوں کا یہ دعویٰ تھا کہ ساری دنیا گنہگار ہے اور ہم ہی کفارہ پر ایمان لا کر متقی بنے ہیں تو ضرور تھا کہ اس پہلو سے بھی ان پر اتمام حجت کیا جاتا اور یہی اس آیت میں ذکر ہے۔

واقعہ مباہلہ وفد نجران سے:

بخاری، مسلم، ترمذی وغیرہ میں روایت ہے: [جَاءَ الْعَاقِبُ وَالسَّيِّدُ صَاحِبَا نَجْرَانَ إِلَى رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ يُرِيدَانِ أَنْ يُلاَعِنَاهُ، قَالَ فَقَالَ أَحَدُهُمَا لِصَاحِبِهِ لاَ تَفْعَلْ، فَوَاللّٰهِ لَئِنْ كَانَ نَبِيًّا فَلاَعَنَّا، لاَ نُفْلِحُ نَحْنُ وَلاَ عَقِبُنَا مِنْ بَعْدِنَا] (صحيح البخاری، كتاب المغازي، باب قِصَّةُ أَهْلِ نَجْرَانَ: 4380) یعنی عاقب اور سید نجران کے قائمقام رسول اللہ ﷺ کی طرف آئے کہ تا آپ سے ملاعنہ کریں۔ راوی (حذیفہ رضی اللہ عنہ) کہتا ہے پھر ان میں سے ایک نے اپنے ساتھی کو کہا ایسا مت کرو خدا کی قسم اگر یہ نبی ہو اور ہم نے اس سے ملاعنہ کیا تو نہ ہم اور نہ ہماری نسل ہمارے بعد کامیاب ہوں گے۔

اور محمد بن اسحاق نے سیرۃ میں لکھا ہے کہ وفد نجران (جو عیسائی تھے) ساٹھ سوار رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے ان میں سے چودہ ان کی قوم کے سردار تھے۔ جن میں عاقب (جس کا نام عبدالمسیح تھا) اور سید (ایہم) کا نام بھی لیا ہے اور عاقب

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَ مَا مِنْ یقیناً یہی سچا بیان ہے اور اللہ کے سوا کوئی بھی معبود نہیں

ان کا سردار تھا اور سید ان کا لاٹ پادری تھا۔ ان لوگوں کا ڈیرہ نبی کریم ﷺ نے مسجد نبوی میں کرایا۔ اور جب ان کی نماز کا وقت آیا تو مسجد میں ہی انہوں نے مشرق کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی۔ (اس سے نبی کریم ﷺ کی وسعت قلبی کا اندازہ کرو کہ اپنی مسجد میں عیسائیوں کو نہ صرف ٹھہراتے ہیں بلکہ ان کو اپنی طرز پر عبادت کرنے کی بھی اجازت دیتے ہیں۔) پس جب انہوں نے دلائل کو نہ مانا اور الوہیت مسیح کے عقیدہ پر اصرار کیا تو نبی کریم ﷺ نے ان کو مباہلہ کے لیے بلایا۔ محمد بن اسحاق کہتے ہیں انہوں نے کہا کہ ہم کو مہلت دیجیے کہ ہم مشورہ کر لیں۔ سو جب انہوں نے مشورہ کیا تو یہی مشورہ قرار پایا کہ مباہلہ کرنے میں ہماری خیر نہیں۔ اس لیے انہوں نے مباہلہ سے انکار کر دیا اور جیسا کہ بخاری کی روایت میں آیا ہے جزیہ قبول کیا اور ابوعبیدہ ان کے ساتھ گئے۔ اور ابن مردویہ کی روایت میں ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے ان کو مباہلہ کے لیے بلایا تو انہوں نے کہا ہم کل کریں گے۔ سو اگلے دن رسول اللہ ﷺ، علی، فاطمہ، حسن، حسین رضی اللہ عنہم کو ساتھ لیے نکلے اور ان کو بلایا مگر انہوں نے انکار کر دیا۔

پس اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وفد نجران نے مباہلہ سے انکار کر دیا۔ ان کے عیسائی حمایتی کہتے ہیں کہ وہ بددعا کرنا نہ چاہتے تھے۔ یہ وکالت اس لیے بھی بے سود ہے کہ عیسائی تو اب تک نعوذ باللہ آنحضرت ﷺ کو دجال کہتے ہیں۔ وہ کون سے ان کے بزرگ تھے جو دجال کے لیے بددعا کرنا جائز نہ سمجھتے تھے۔ احادیث صحیحہ سے صاف ثابت ہے کہ وہ ڈر گئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے یہ علم دیا تھا کہ **عیسیٰ پرستی کا عقیدہ دنیا میں بہت زور پکڑنے والا ہے اس لیے اس کے خلاف ہر رنگ میں اتمام حجت کیا ہے**۔ اول دلائل کی رو سے، پھر بارگاہ الٰہی میں بالمقابل دعا سے فیصلہ کے طریق سے اور سب سے آخر ایک اور طریق پر ان کو بلایا ہے جس کا ذکر اگلے رکوع میں آتا ہے۔

مباہلہ میں حضرت علیؑ کا نکلنا اور اہل تشیع:

شیعہ کہتے ہیں علی، فاطمہ، حسن، حسین رضی اللہ عنہم کے ساتھ لانے میں آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت کی طرف اشارہ کیا ہے حالانکہ بات تو صاف ہے۔ اَبْنَآءَ میں حسن، حسین بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ داخل ہیں کیونکہ داماد بھی بیٹا ہی ہوتا ہے اور نِسَآءَ میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور اَنْفُسَنَا میں خود نبی کریم ﷺ۔ مراد تو صرف یہ تھی کہ جو شخص جھوٹا ہے اللہ تعالیٰ اس کا ایسا استیصال کر دے کہ اس کے بچے بھی تباہ ہو جائیں اور سلسلہ نسل منقطع ہو جائے۔ یہاں فضیلت کا کوئی سوال نہیں۔ دوسرے ایک روایت میں یہ لفظ بھی آتے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور ان کے بیٹے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ان کے بیٹے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کے بیٹے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے بیٹے بھی نکلے تھے۔ (ر) بہرحال یہ تو ظاہر ہے کہ ابھی آنحضرت ﷺ گھر سے ہی نکلے تھے اور اگر فی الواقع مباہلہ ہوتا تو شاید بڑے بڑے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو مع ان کی اولاد اور بیبیوں کے بھی بلاتے۔ لیکن عیسائیوں نے پہلے ہی انکار کر دیا۔ پس اس روایت سے تو کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا۔

اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۶۲﴾

اور یقیناً اللہ ہی غالب حکمت والا ہے۔(454)

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿۶۳﴾ ع 6 9 14

اور اگر وہ پھر جائیں، تو اللہ فساد کرنے والوں کو جانتا ہے۔

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾

کہہ، اے اہل کتاب اس بات کی طرف آؤ جو ہمارے درمیان اور تمہارے درمیان یکساں ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک بنائیں اور نہ ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب بنائے، اور اگر وہ پھر جائیں، تو تم کہو گواہ رہو کہ ہم فرماں بردار ہیں۔(455)

مباہلہ کب جائز ہے:

ایک اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا مباہلہ اب بھی جائز ہے؟ نبی کریم ﷺ نے بغیر امر الٰہی مباہلہ نہیں کیا اور جب امر ہوا تو صرف انہی لوگوں کو مباہلہ کے لیے بلایا جن کے ساتھ مباہلہ کرنے کا صراحت سے حکم آچکا تھا۔ اس لیے بدون امر الٰہی مباہلہ کرنا جائز معلوم نہیں ہوتا۔ جس شخص کو اللہ تعالیٰ اصلاح کے لیے مامور کرے وہ اپنے اعداء سے خدا کی طرف سے حکم پانے پر مباہلہ کر سکتا ہے۔ ہاں ابن عباس رضی اللہ عنہما کے متعلق ایک روایت عبد حمید نے بیان کی ہے کہ آپ کا کسی کے ساتھ کوئی جھگڑا ہو گیا تھا تو آپ نے اسے مباہلہ کے لیے بلایا۔ (ر) مگر اول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا فعل کوئی حجت شرعی نہیں۔ دوسرے اگر باہمی جھگڑوں پر مباہلہ ہونے لگے تو دن رات مسلمانوں کے باہم مباہلے ہی ہوتے رہیں اور بجائے اخوت اور محبت کے جس کا پیدا کرنا اسلام کی اصل غرض ہے ایک دوسرے کی بیخ کنی اور استیصال کے درپے ہی رہیں۔

454- قَصَصُ کے معنی اثر یعنی نقش قدم بھی ہیں۔ اور قصص اَخْبَارٌ مُتَتَبَّعَةٌ کو بھی کہتے ہیں یعنی خبر جس کا تتبع کیا جائے۔ اَلْحَقُّ قصص کی صفت ہے۔

آیت کے اخیر پر عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ کی صفات لانے کا اشارہ کرنا مقصود معلوم ہوتا ہے کہ نصرانیت کا غلبہ آخر دنیا سے دور ہو جائے گا۔ اور ﴿مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ﴾ یعنی ایک ہی خدا کی عبادت رہ جائے گی۔

455- سَوَاءٌ کے معنی وسط ہیں جب مکان سے تعلق ہو اور كَلِمَةٌ سَوَاءٌ سے مراد امام راغب [عَدْلٌ مِنَ الْحُكْمِ] لیتے ہیں یعنی

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَ مَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَ

اے اہل کتاب! تم ابراہیم کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو۔ حالانکہ توریت اور انجیل اس کے بعد

انصاف کی بات۔ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی عدل معنی مروی ہیں۔ مگر سَوَاءٌ مصدر بمعنی مُسْتَوِيَةٌ بھی ہوسکتا ہے: [أَوْ لَا يَخْتَلِفُ فِيْهِ التَّوْرَاةُ وَالْاِنْجِيْلُ وَالْقُرْاٰنُ]۔ (ر) یعنی مشترک بات جس میں تورات انجیل اور قرآن اختلاف نہیں کرتے۔ [اَوْ لَا اخْتِلَافَ فِيْهَا بِكُلِّ الشَّرَائِعِ]۔ (ر) یعنی تمام شریعتیں اس پر متفق ہوں۔

شرک فی الصفات:

﴿لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا﴾ شرک کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 121] ۔ یہاں مراد شرک عظیم ہی ہے۔ یعنی کسی چیز کو باری تعالیٰ کا شریک ٹھہرانا اور یہ اس طرح پر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کسی صفت میں کسی دوسرے کو کامل شریک ٹھہرایا جائے۔ جیسے مجوسیوں کا دو خالق تجویز کرنا یا عیسائیوں کا مسیح کو صفات کاملہ باری تعالیٰ ازلیت، ابدیت، قدرت وغیرہ میں شریک ٹھہرانا۔ یا آریہ سماج کا مادہ اور روح کو باری تعالیٰ کی صفت ازلیت اور خود بخود اور غیر مخلوق ہونے میں شریک ٹھہرانا۔ یہ سب شرک عظیم میں داخل ہیں۔

﴿اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ رَبّ کی جمع ہے [دیکھو نمبر: 2] اور ارباب سے مراد یہ ہے کہ ان کو مسبب الاسباب اور مصالح عباد کا متولی سمجھا جائے اور اس لیے ان کی اطاعت اس طرح کی جائے جس طرح رب کی اطاعت کی جاتی ہے۔ خود قرآن کریم نے اس کی تصریح فرمادی ہے: ﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ [التوبة: 31:9] انہوں نے اپنے علماء اور راہبوں کو اللہ کے سوا رب بنالیا ہے۔ ترمذی نے عدی بن حاتم سے روایت کی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم ان کی عبادت نہ کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا: [اَمَا كَانُوْا يُحَلِّلُوْنَ لَكُمْ وَ يُحَرِّمُوْنَ فَتَاخُذُوْنَ بِقَوْلِهِمْ] (روح المعانی: جلد3، صفحہ 193) ''کیا یہ نہیں تھا کہ وہ تمہارے لیے حرام اور حلال ٹھہراتے اور تم انہی کے قول کے پیچھے چلتے؟'' تو انہوں نے کہا ہاں ایسا ہی کرتے تھے۔ پس جو مسلمان اپنے پیروں اور علماء کے پیچھے آنکھیں بند کر کے چلتے ہیں کہ اپنی عقل وفکر سے کبھی کام نہیں لیتے، وہ بھی اسی فتویٰ کے ماتحت ہیں۔ **اس آیت میں تین قسم کے شرک سے منع فرمایا ہے۔** ایک شرک فی العبادت، دوسرے شرک فی الصفات، تیسرے شرک فی الاطاعت۔

1. **شرک فی العبادت** کو ﴿اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ﴾ میں لیا ہے۔ یہ بہت موٹا شرک ہے کہ کسی چیز کے آگے سجدہ کیا جائے یا اس سے دعا کی جائے جیسے بت پرست کرتے ہیں۔ یا بعض عیسائی بھی حضرت مسیح سے یا حضرت مریم سے دعا کرتے ہیں بلکہ رومن کیتھولک ان کے بت بھی رکھتے ہیں۔
2. اس سے اتر کر **شرک فی الصفات** ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی کسی صفت میں کسی چیز کو کامل شریک ٹھہرانا جس کا ذکر ﴿نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا﴾ میں کیا ہے کسی چیز کے شریک کرنے سے مراد یہی ہے کہ اس میں کامل طور پر کوئی صفت ایسی مانی جائے جیسے اللہ

تعالیٰ کی صفت ہوتی ہے۔

اور تیسرا **شرک فی اطاعت** ہے جس کا ذکر ﴿ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ میں کیا اور ان تمام قسم کے موٹے شرکوں سے منع فرمایا۔

اصول مقابلہ مذاہب اور صداقت اسلام:

جیسا کہ پچھلے رکوع کے آخر میں مَیں نے کہا تھا جب دلائل اور دعا دونوں سے اتمام حجت ہو چکا اور دلائل کے قبول کرنے سے انہوں نے انکار کیا اور دعا میں مقابلہ سے خائف ہوئے تو اب ان پر ایک اور رنگ میں اتمام حجت کیا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ تمہارے اور ہمارے مذہب میں جو امر مشترک ہے اس کو دونوں بنیاد کے طور پر مان لیں تو بہت سا فساد مٹ جاتا ہے۔ ایک عیسائیت کیا جملہ مذاہب پر اسلام کی یہ حجت قائم ہے کہ اگر سب مذاہب میں امر مشترک کو نکالا جائے تو وہ اسلام کا مذہب ہے اس لیے کسی مذہب کا پیرو بھی اسلام کی حقانیت کا انکار نہیں کر سکتا۔ ایک رنگ میں سب قومیں ہی اہل کتاب ہیں گو مخصوص طور پر یہود یا عیسائیوں کو اہل کتاب کے نام سے پکارا گیا ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہر قوم میں ہم نے رسول بھیجا۔ پس اس رسول کی تعلیم ہی اس قوم کی کتاب ہے۔ اب اگر دنیا کی ساری قوموں کے معتقدات اور ساری مذہبی کتابوں کو دیکھا جائے تو ذات باری کے عقیدہ میں جو امر مشترک ان میں پایا جاتا ہے وہ ایک خدا کی ہستی ہے۔ حتّٰی کہ کتب مقدسہ کے پیروؤں کو چھوڑ کر بت پرستوں تک کا بھی یہی عقیدہ تھا کہ ان کے بتوں سے اوپر ایک خدائے واحد ہے اور بت بھی اسی کے دربار تک پہنچانے والے ہیں ﴿ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ﴾ [الزمر: 3:39] ''ہم ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ کے نزدیک کر دیں۔'' پس تمام مذاہب دنیا میں اگر امر مشترک تلاش کیا جائے تو وہ خدائے واحد کی پرستش کا عقیدہ ہے۔ پھر ہر قوم نے اس خدائے ذوالجلال کے نیچے اپنے لیے طرح طرح کے خدا تجویز کر لیے۔ کہیں رامچندر اور کرشن ہیں تو کہیں مسیح۔ پس اللہ تعالیٰ مذاہب میں فیصلہ کے لیے ایک سیدھی راہ بتاتا ہے کہ سب مذاہب میں امر مشترک کو لے لو اسی کو ﴿ كَلِمَةٍ سَوَآءٍ ﴾ فرمایا ہے۔ تو یہ امر مشترک یہی ہوگا کہ صرف ایک خدا کی پرستش کی جائے۔ اس ﴿ كَلِمَةٍ سَوَآءٍ ﴾ میں درحقیقت مقابلہ مذاہب کے عظیم الشان اصول کی طرف دنیا کو توجہ دلائی ہے اور گویا یہ اشارہ فرمایا ہے کہ جب اور کسی راہ سے نہ مانیں تو پھر مقابلہ مذاہب کا اصول پیش کرو اور امر مشترک کو بطور ایک بنیادی اصول کے مان کر آگے چلو۔ تو اس سے بھی اسلام کی صداقت ہی نکلے گی۔

مقوقس کے نام آنحضرت ﷺ کا خط:

﴿ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا ﴾ اَلْآیَۃ یہ وہ الفاظ ہیں جن الفاظ میں صلح حدیبیہ کے زمانہ میں آنحضرت ﷺ نے ہرقل اور مقوقس شاہ مصر کو مخاطب فرمایا تھا۔ مؤخر الذکر چٹھی کا اصل مسودہ مصر کی کسی خانقاہ میں ملا اور اب اس کا فوٹو شائع ہو چکا ہے جس میں بعینہٖ وہی الفاظ ہیں جو صحیح بخاری وغیرہ دیگر کتب حدیث میں ملتے ہیں۔ اس سے صداقت حدیث پر بڑی بھاری شہادت ملتی ہے۔

الْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۵﴾

ہی اتاری گئیں۔ پھر کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟(456)

هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۶﴾

سنو! تم وہ ہو جو اس میں جھگڑ چکے جس کا تم کو علم تھا، پھر اس میں کیوں جھگڑتے ہو جس کا تم کو علم نہیں، اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔(457)

456- **مذہب ابراہیمی بطور امر مشترک:** ﴿لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ﴾ ''حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو؟'' حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر بھی اسی اصول کے لحاظ سے کیا جس کا اوپر ذکر ہے۔ کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وجود بھی چاروں قوموں مشرکین عرب، یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں میں بطور ایک امر مشترک کے تھا کہ چاروں آپ کی بزرگی کو مانتے تھے۔ گویا یہ بتایا ہے کہ توریت اور انجیل تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد کی کتابیں ہیں۔ اصل الاصول وہ ہے جس پر ابراہیم بھی قائم تھے اور وہی خدائے واحد کی عبادت ہے۔ اسی لیے [آیت: 68] میں فرمایا: ﴿اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَ هٰذَا النَّبِيُّ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ کیونکہ یہ نبی اور مومن اس اصل اصول یعنی خدائے واحد کی عبادت پر قائم ہیں۔ حالانکہ تم لوگ طرح طرح کی افراط وتفریط میں پڑ گئے ہو اور خدائے واحد کی عبادت کے ساتھ کسی نے اپنے احبار اور کسی نے اپنے مسیح کی عبادت کو ملا لیا ہے۔

457- هَا حرف تنبیہ ہے اور هٰؤُلَآءِ میں دوبارہ تاکید کے لیے آیا ہے اور اخفش کے نزدیک هَا قائمقام ہمزہ استفہام کے ہے اور استفہام یہاں تعجب کے لیے ہے۔ (ر)

یہودیوں اور عیسائیوں پر اتمام حجت:

﴿فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ﴾ سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کا معاملہ ہے کہ ان کے بارے میں اہل کتاب یعنی یہود حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مذہب کے بارہ میں اور عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مذہب کے بارہ میں جھگڑا کر چکے اور ان جھگڑوں کا ذکر سورہ بقرہ اور سورۃ آل عمران میں ہو چکا۔ تو اب جب اصل الاصول یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مذہب کی طرف توجہ دلائی؛ کیونکہ اسی کے ساتھ وعدہ کے ماتحت یہود ونصاریٰ کا وجود پیدا ہوا، تو فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مذہب کے علم کا تو تم کو کچھ دعویٰ بھی ہے مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مذہب کا ذکر تو تمہاری کتب مقدسہ میں بھی جیسی کچھ وہ تحریف شدہ موجود ہیں نہیں ہے۔ پس اس پر تمہارا جھگڑا کرنا بالکل فضول ہے۔ یا ﴿فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ﴾ سے مراد وہ پیشگوئیاں ہیں جو ان کی کتابوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پائی جاتی تھیں یعنی پیشگوئیوں کے بارہ میں تو تم نے جھگڑا کر لیا۔ مگر یہ اصول

مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّ لَا نَصْرَانِيًّا وَّ لٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ؕ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۶۷﴾

ابراہیم نہ یہودی تھا اور نہ نصرانی، لیکن وہ راست رو فرمانبردار تھا، اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔ (458)

اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَ هٰذَا النَّبِيُّ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ وَ اللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۸﴾

یقیناً ابراہیم سے بہت نزدیک وہ لوگ ہیں جنہوں نے اس کی پیروی کی اور یہ نبی اور وہ جو ایمان لائے اور اللہ مومنوں کا ولی ہے۔ (459)

وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ

اہل کتاب کا ایک گروہ چاہتا ہے کہ تم کو گمراہ کریں اور وہ ف

مقابلہ مذاہب اور اصول مشترکہ کی طرف رجوع کرنا ایک ایسا امر ہے جس کا تم کو علم نہیں تھا۔ مگر بات صاف ہے اس میں جھگڑا کیوں کرتے ہو؟

458- **ابراہیم علیہ السلام سے نفی یہودیت ونصرانیت:** مطلب یہ ہے کہ یہودیت اور نصرانیت کے خاص عقائد ابراہیم علیہ السلام کے نہ تھے۔ یہودیت اور نصرانیت کی نفی کے ساتھ لفظ حنیف کے لانے پر [دیکھو نمبر: 170]۔ اور آخر پر حضرت ابراہیم سے مشرک ہونے کی نفی مشرکین عرب پر اتمام حجت کے لیے ہے۔ گویا ان تینوں قوموں کو ایک اصول کی طرف بلایا ہے کہ جس پر ہم سب کا اتفاق ہے اسی کو بطور اصل الاصول لو۔ اور اس لیے بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کیا ہے کہ اصل وعدہ اسی کے ساتھ ہے جس کے ماتحت عرب میں بھی ایک نبی پیدا ہوتا ہے۔ پس یہ نبی اس کے مذہب کے اصل الاصول پر بھی قائم ہے۔

459- اَوْلٰی۔ وَلِیَ یَلِیْ سے افعل التفضیل ہے اور وِلَآءٌ کے اصل معنی قرب ہیں۔ پس اولیٰ کے معنی اقرب یا قریب ترین ہوئے۔ اور اَوْلٰی بِکَذَا سے مراد اُخْرٰی بِکَذَا ہے۔ (غ) یعنی اس کا سب سے بڑھ کر اہل۔

اِتَّبَعُوْهُ۔ نبی کے متبعین اس کی امت ہوتی ہے جو اس کے نقش قدم پر چلتی اور اس کی ہدایات سے نور حاصل کرتی ہے۔ اسی لیے یہاں ﴿هٰذَا النَّبِيُّ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ کو ﴿الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ﴾ سے الگ کر دیا ہے یعنی محمد رسول اللہ ﷺ اور **مسلمان ابراہیمؑ کے متبعین میں سے نہیں ہیں** گو آپ کا ملت ابراہیم علیہ السلام پر ہونا بیان کیا گیا ہے۔ مگر وہ بحیثیت ایک متبع کے نہیں بلکہ اس کے لیے کہ وہی اصول دین آپ کو بھی وحی ہوتے ہیں ﴿الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ﴾ سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پیرو ہیں جو آپ کے زمانہ نبوت میں آپ کی شریعت پر تھے۔

يُضِلُّوْنَكُمْ ؕ وَ مَا يُضِلُّوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۶۹﴾

اپنے آپ کو ہی گمراہ کرتے ہیں اور وہ محسوس نہیں کرتے۔ (460)

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ اَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۷۰﴾

اے اہل کتاب! اللہ کی آیتوں کا کیوں انکار کرتے ہو حالانکہ تم گواہ ہو۔ (461)

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۷۱﴾ ع 7 8 15

اے اہل کتاب! کیوں حق کو باطل کے ساتھ ملاتے ہو اور حق کو چھپاتے ہو حالانکہ تم جانتے ہو۔ (462)

460- طَائِفَةٌ۔ طَوْفٌ سے ہے جس کے معنی گھومنا ہیں اور طَائِفَةٌ کا لفظ جب انسانوں پر بولا جائے تو اس سے مراد جماعت ہوتی ہے اور کسی چیز کے حصہ یا ٹکڑا کو بھی اس کا طائفہ کہا جاتا ہے۔ (غ)

يُضِلُّوْنَكُمْ۔ اِضْلَالٌ کے ایک معنی صراط مستقیم سے پھیرنے کے ہیں۔ لیکن ضَلَّ بمعنی ضَاعَ وَهَلَكَ (ل) بھی آتا ہے اس لیے اِضْلَالٌ اِهْلَاكٌ کو بھی کہتے ہیں۔ اگر پہلے معنی مراد لیں تو ﴿مَا يُضِلُّوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ﴾ کے معنی ہوں گے اپنے آپ کو اور بھی گمراہ کرتے ہیں۔ کیونکہ جب ایک شخص دوسرے کی گمراہی کے درپے ہوجاتا ہے تو اور بھی راہ حق سے دور چلا جاتا ہے۔ حالانکہ وہ پہلے بھی گمراہ ہی ہوتا ہے۔ دوسرے معنی کی رو سے مراد یہ ہوگی کہ تم کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں خود ہی ہلاک ہوں گے۔

عیسائیوں کی مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی کوششیں:

یہاں ایک پیشگوئی بھی معلوم ہوتی ہے کیونکہ اصل مخاطب تو ان آیات کے نصاریٰ ہی ہیں جیسا کہ سفیان نے بھی کہا ہے: [كُلُّ شَيْءٍ فِيْ آلِ عِمْرَانَ مِنْ ذِكْرِ اَهْلِ الْكِتَابِ فَهُوَ فِي النَّصَارٰى] (ر) یعنی آل عمران میں جو کچھ اہل کتاب کے متعلق آیا ہے وہ اصل میں نصاریٰ کے متعلق ہے۔ گو بعض وقت یہود یا دوسرے اہل کتاب بھی ان میں شامل ہوجائیں۔ اشارہ یہ ہے کہ یہ اہل کتاب یعنی نصاریٰ باوجود باطل پر ہونے کے اور ہر طرح سے ملزم ہونے کے اس قدر زور پکڑیں گے کہ مسلمانوں کو بھی گمراہ کرنے کی کوشش کریں گے یعنی اپنے دین کی طرف لے جانے کی۔ سو اس پیشگوئی کا ظہور اس زمانہ میں ہو رہا ہے۔

461- اللہ کی آیتوں سے مراد یہاں قرآن کریم ہے۔ جس کی صداقت وہ مشاہدہ کر رہے تھے اور خود اس بات کے بھی گواہ تھے کہ ان کی کتابوں میں ایک رسول کے آنے کا ذکر ہے۔

462- یہاں انہی پیشگوئیوں کی طرف توجہ دلائی ہے جن کی طرف پچھلی آیت میں اشارہ کیا تھا۔

وَ قَالَتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْۤ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَ اكْفُرُوْۤا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۷۲﴾

اور اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے کہا کہ دن کی ابتدا میں اس پر ایمان لے آؤ جو ان لوگوں پر اتارا گیا ہے جو ایمان لائے ہیں، اور اس کے آخر میں انکار کردو تاکہ وہ لوٹ آئیں۔ (463)

463- ﴿وَجْهَ النَّهَارِ﴾ وَجْهٌ چونکہ بدن کا وہ حصہ ہے جو سب سے پہلے سامنے آتا ہے اس لیے اس کا استعمال ہر چیز کے پہلے آنے والے حصہ اور اس کے اشرف اور اس کی ابتدا پر ہوا ہے۔ (غ) اس لیے وَجْهَ النَّهَارِ کے معنی اَوَّلَ النَّهَارِ ہیں۔

یہودیوں کی چال کہ منافقانہ طور پر اسلام میں داخل ہوجائیں:

اس آیت کے معنی کئی طرح پر کیے گئے ہیں۔ ایک معنی تو یوں ہیں کہ دن کے پہلے حصہ میں دین اسلام کو قبول کرلو اور پچھلے حصہ میں اس کا انکار کردو۔ کہا جاتا ہے کہ کچھ یہودیوں نے دین اسلام کو بدنام کرنے کے لیے یہ تجویز کی تھی کہ اپنے چند لوگوں کو تیار کیا کہ صبح جا کر نفاق کے طور پر مسلمان بن جائیں اور شام کو کہہ دیں کہ ہم تو اس کا انکار کرتے ہیں۔ ہم نے دیکھ لیا ہے کہ اس دین میں کوئی حق نہیں اور ﴿لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ﴾ کے معنی ہوئے تاکہ مسلمان بھی اپنے دین سے لوٹ آئیں یعنی اس طرح وہ سمجھیں گے کہ اہل کتاب کو کوئی دشمنی تو نہیں وہ مسلمان تو ہوگئے تھے۔ لیکن جب انہوں نے اس دین کے اندر داخل ہوکر اس کو جھوٹا پایا تو اسے چھوڑ دیا، یہی بات درست ہوگی۔ یوں وہ بھی اسلام چھوڑ کر پھر کفر کی طرف لوٹ آئیں گے۔ چونکہ دین اسلام کی یہ خوبی تھی کہ جب ایک شخص اس کے اندر داخل ہوجاتا تو پھر مرتد نہیں ہوتا تھا جیسا کہ ہرقل والی حدیث میں ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی زبان سے بھی شہادت موجود ہے کہ جب اس نے پوچھا: [هَلْ يَرْتَدُّ أَحَدٌ مِنْهُمْ سَخْطَةً لِدِيْنِهِ بَعْدَ اَنْ يَدْخُلَ فِيْهِ] (صحيح البخاري، كتاب الإيمان: 51) کیا ان میں سے کوئی شخص دین میں داخل ہونے کے بعد اس سے بیزار ہوکر مرتد بھی ہوجاتا ہے۔ تو ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ نہیں۔ اور یہ دین اسلام کی صداقت پر بڑی بھاری شہادت تھی کہ مرتدین کا وجود باوجود سخت ایذا رسانیوں کے اور طرح طرح کی مشکلات کے النادر کالمعدوم کے حکم میں تھا۔ اور مسلمانوں کی اس مضبوطی کو دیکھ کر ہی اہل کتاب اس قسم کے حیلے سوچتے رہتے تھے کہ کس طرح دین اسلام بدنام ہو۔ یہ دلائل میں عاجز ہونے کا نتیجہ تھا۔ جب دین اسلام کا ہر پہلو سے غلبہ دیکھا تو ان مخفی تدابیر پر اتر آئے کہ شاید اسی طرح اسلام مٹ جائے۔ جیسا کہ آج بھی اہل کتاب اس قسم کی تدبیریں اسلام کے تباہ کرنے کے لیے کرتے رہتے ہیں۔

ایک معنی ابومسلم نے کیے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ دن کے پہلے حصہ میں ایمان لانے اور پچھلے میں انکار کرنے سے مراد یہ ہے کہ نفاق کے طور پر مسلمانوں کی ہاں میں ہاں ملا دیا کرو۔ مگر فی الواقع اپنے دین پر مضبوط رہو۔ اس لیے جب اپنے لوگوں کے پاس آؤ تو پھر اس کا انکار کرو۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ﴿وَ اِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْۤا اٰمَنَّا ۚ وَ اِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْۤا اِنَّا

وَ لَا تُؤْمِنُوْۤا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِیْنَكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنْ یُّؤْتٰۤى اَحَدٌ مِّثْلَ مَاۤ اُوْتِیْتُمْ اَوْ یُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ

اور سوائے اس کے کسی پر ایمان نہ لاؤ جو تمہارے دین پر چلے۔[464] کہہ، (کامل) ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے کہ کسی شخص کو اس کی مثل دیا جائے جو تمہیں دیا گیا یا وہ تمہارے رب کے نزدیک تمہارے ساتھ جھگڑا کریں

مَعَكُمْ﴾[البقرة: 14:2] ''جب مومنوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور جب اپنے شیطانوں کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں۔'' یہ معنی بھی صحیح اور مناسب موقع ہیں۔ اہل کتاب میں سے بہت سے لوگ محض نفاق کے طور پر مسلمانوں کے ساتھ مل گئے تھے تا اس طرح دین اسلام کو بدنام کریں۔

احکام اسلام میں تفریق کی چالبازی:

تیسرے معنی اصم سے منقول ہیں: [مَعْنَاهُ تَفْرِیْقُ أَحْكَامِ الْاِسْلَامِ إِلٰى قِسْمَیْنِ وَ ذٰلِكَ اَنَّهُ قَالَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ اَنْ كَذَّبْتُمُوْهُ فِیْ جَمِیْعِ مَا جَاءَ بِهِ عِلْمٌ عَوَامُكُمْ كَذَّبَكُمْ لِاَنَّ كَثِیْرًا مِمَّا جَاءَ بِهِ حَقٌّ وَلَكِنْ صَدِّقُوْهُ فِیْ بَعْضٍ وَ كَذِّبُوْهُ فِیْ بَعْضٍ لِیَحْمِلُوْا كَلَامَكُمْ عَلَى الْاِنْصَافِ فَیَقْبَلُوْا قَوْلَكُمْ وَ یَرْجِعُوْا مِنْ دِیْنِ الْاِسْلَامِ وَالرَّغْبَةِ فِیْهِ] (غق) اس کا مطلب یہ ہے کہ احکام اسلام میں تفریق کر کے ان کو دو قسم کے ٹھہرایا جائے اور وہ اس طرح کہ ان میں سے بعض نے بعض کو کہا کہ اگر تم اس کو ساری باتوں میں جھوٹا کہو گے تو عوام تم کو جھوٹا سمجھیں گے کیونکہ بہت سی وہ باتیں جو وہ لایا ہے حق ہیں اس لیے بعض باتوں میں اس کی تصدیق کرو اور اس کو سچا کہو اور بعض میں جھوٹا تا کہ لوگ تمہارے کلام کو انصاف پر حمل کریں اور تمہاری بات کو قبول کریں اور دین اسلام سے اور اس کی طرف میلان سے باز آجائیں؛ اس قسم کی چالبازیاں اب بھی کی جاتی ہیں۔ بعض عیسائی یہ جتانے کے لیے کہ ہم بڑے انصاف پسند ہیں اور مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لیے یوں کہہ دیتے ہیں کہ بے شک پہلے آنحضرت ﷺ صداقت پر تھے اور محض عرب کو بت پرستی سے نکالنا چاہتے تھے۔ لیکن بعد میں دنیوی اغراض مل گئیں اور ایک نیا دین بنالیا گیا۔ اور جنگوں میں ناحق کشت وخون ہوا۔ آج کل پادریوں کی ایک اور چالبازی بھی ہے کہ جھوٹے قصوں کے طور پر ایک عیسائی اور ایک مسلمان کا مکالمہ شائع کر دیتے ہیں جس میں مسلمان کے منہ میں کمزور دلائل ڈال کر مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کی صداقت پر شبہات پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ غرض حق کے مقابل چالبازیوں سے کام عیسائی پہلے بھی لیتے رہے، اب بھی لیتے ہیں۔ انہی چالبازیوں سے کہ یہ دوست بن کر دشمن کا کام کرتے ہیں، یہاں مسلمانوں کو متنبہ کیا ہے۔

464- یہ اہل کتاب کے قول کا بقیہ حصہ ہے۔ اور مراد اس پر ایمان لانے سے جو تمہارے دین کا پیرو ہے یہ ہے کہ حقیقی ایمان تمہارا صرف اسی نبی پر ہو جو شریعت اسرائیلی کا پیرو ہو۔ پس جبکہ ایک طرف بعض لوگوں کو اس چالبازی کے لیے تیار کیا کہ وہ جھوٹے طور پر ایمان کا اظہار کر کے پھر انکار کر دیں یا کچھ حصہ کو صحیح تسلیم کر لیں تو دوسری طرف اپنے پیروؤں کو یہ بھی کہہ دیا کہ تم صرف

رَبِّكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾

گے۔ کہہ، فضل تو اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہتا ہے اسے دیتا ہے۔ اور اللہ کشایش والا جاننے والا ہے۔ (465)

ایسے نبی کو مانو جو تمہاری شریعت کا پیرو ہو۔ اور اس طرح آنحضرت ﷺ پر ایمان لانے سے روکا کیونکہ آپ کی شریعت میں بہت سی باتیں شریعت موسوی کو منسوخ کرنے والی تھیں اور یہ ان کا قول اس کے مطابق ہے جو پچھلی سورت میں مذکور ہے: ﴿قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَ يَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ﴾ [البقرة: 91:2] ''کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لاتے ہیں جو ہم پر اتارا گیا اور اس کا انکار کرتے ہیں جو اس کے سوا ہے۔'' اور اسی پر یہود آج تک قائم ہیں یعنی وہ کہتے ہیں کہ جو نبی آئے شریعت موسوی پر ہی آنا چاہیے۔

465- **مثیل موسیٰ علیہ السلام کی پیشگوئی اور یہودیوں کے اس سے گریز کے حیلے:** ﴿قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ﴾ ان الفاظ کی تفسیر کئی طرح پر کی گئی ہے۔ لیکن سیاق و سباق کے لحاظ سے دو توجیہیں درست ہوسکتی ہیں اور ان میں کچھ اشکال بھی نہیں۔ اول یہ کہ الفاظ ﴿قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ﴾ جملہ معترضہ کے طور پر ہوں اور ﴿اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ﴾ پھر انہی لوگوں کا قول ہو اور اس سب کا جواب ﴿قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ﴾ میں دیا تو گویا جب یہودیوں نے اپنے پیروؤں کو یہ سکھایا کہ ﴿وَ لَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ﴾ سوائے اس نبی کے جو تمہاری شریعت کا پیرو ہو اور کسی کو نہ مانو۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا: ﴿اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ﴾ (اور ﴿قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ﴾ جملہ معترضہ کے طور پر رہا کہ اصل ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے ان کی ان فضول گوئیوں سے کیا بنے گا) یعنی اور اس بات پر بھی ایمان نہ لاؤ کہ کسی شخص کو اس کی مثل دیا جائے گا جو تم کو دیا گیا یعنی جیسی شریعت تم کو دی گئی اس کی مثل کسی اور کو دی جاسکتی ہے۔ گویا [استثناء: 15:18] کی مثل والی پیشگوئی کو نہ مانو۔ کیونکہ اگر تم نے اس بات کو مان لیا کہ مثل والی پیشگوئی سوائے بنی اسرائیل کے کسی اور پر بھی پوری ہوسکتی ہے۔ تو وہ یعنی مسلمان تمہارے رب کے نزدیک تمہارے ساتھ جھگڑا کریں گے۔ رب کے نزدیک جھگڑا کرنے سے مراد ہے: فِيْ كِتَابِهٖ وَ حُكْمِهٖ [دیکھو نمبر: 179]، اور ﴿يُحَآجُّوْكُمْ﴾ کے معنی کے لیے بھی اسی نوٹ کو دیکھو۔ ﴿يُحَآجُّوْكُمْ﴾ میں ضمیر احد کی طرف جائے گی۔ کیونکہ وہ جمع کے معنی کے حکم میں ہے اور مراد مسلمان ہوں گے یا بنی اسماعیل جن کی طرف احد میں اشارہ ہے۔ یہ معنی بعینہٖ اس کے مطابق ہیں جو [البقرة: 76:2] میں ذکر کیا کہ یہودیوں کے علماء اپنے پیروؤں کو کہتے ہیں: ﴿اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ﴾ تم ان پیشگوئیوں کو جو اللہ نے تم پر کھولی ہیں مسلمانوں کو جا کر بتا دیتے ہو تا کہ وہ تمہارے رب کے حکم میں تمہارے ساتھ جھگڑا کرسکیں۔ گویا اسی بات سے یہاں منع کیا ہے کہ جب تم ان کے ساتھ ملو تو یہ پھر بھی تسلیم نہ کرو کہ مثل والی کوئی پیشگوئی ہے ورنہ مسلمانوں کو تمہارے خلاف یہ حجت مل جائے گی۔

يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۴﴾

وہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت سے خاص کر لیتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

اور دوسرے معنی یوں ہوں گے کہ ﴿قُلْ اِنَّ الْهُدٰى﴾ سے ﴿عِنْدَ رَبِّكُمْ﴾ تک سب قُلْ کے ماتحت یہودیوں کی اس بات کا جواب ہو کہ ﴿وَ لَا تُؤْمِنُوْۤا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ﴾ اس صورت میں الھُدٰی ان کا اسم ہوگا اور ﴿هُدَى اللّٰهِ﴾ الْهُدٰی سے بدل ہوگا۔ گویا اس بات کا جواب کہ سوائے موسوی شریعت کے پیرو کے اور کسی نبی کو نہ مانو۔ اللہ تعالیٰ یہ حکم دیتا ہے کہ ان کو کہہ دو کہ کامل ہدایت (جو اللہ کی ہدایت ہے) یہ ہے کہ جو کچھ اے اہل کتاب تم کو دیا گیا یعنی موسوی شریعت اس کی مثل کسی اور کو دی جائے کیونکہ تمہارے ہاں یہ پیشگوئی موجود ہے کہ موسیٰ کی مثل ایک نبی آئے گا اور اسی لیے یہ ضروری ہے کہ جو تم کو دیا گیا یعنی شریعت موسوی اس کی مثل کسی اور کو دیا جائے گا۔ یا (یعنی اگر ایسا نہ ہو تو) مسلمان تمہارے رب کے حکم میں تمہارے ساتھ جھگڑا کر سکیں گے (اور وہ جھگڑے میں غالب رہیں گے اور اس غلبہ کی طرف لفظ يُحَآجُّوْكُمْ میں بھی اشارہ ہو سکتا ہے یا ایسے لفظ مقدر ہو سکتے ہیں جیسے: فَيُدْحِضُ حُجَّتَكُمْ کیونکہ سیاق عبارت اس کا مقتضی ہے۔) دونوں صورتوں میں اشارہ اس عظیم الشان پیشگوئی کی طرف ہے جس کا کوئی جواب اہل کتاب کے پاس نہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کی تھی اور جس کی صداقت کو کل انبیائے بنی اسرائیل نے تسلیم کیا یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس کو بھی تسلیم کیا۔ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مثل ایک پیغمبر کا دنیا میں ظاہر ہونا جس کا ذکر [استثناء: 18:15-18] میں ہے۔ اب یہ موسیٰ کی مثل نبی کا کھڑا کیا جانا سوائے اس کے کیا معنی رکھتا ہے کہ جس طرح ایک شریعت بنی اسرائیل کو موسیٰ کے ذریعہ دی گئی، اسی طرح ایک شریعت بنی اسماعیل میں سے ایک نبی کے ذریعہ سے دنیا کو دی جائے۔ یوں تو بنی اسرائیل میں نبی بہت ہوئے مگر موسیٰ کی مثل ہونے کا کسی نے دعویٰ نہیں کیا۔ حتّٰی کہ حضرت مسیح نے بھی نہیں کیا۔ جیسا کہ [یوحنا: 1:21] سے ثابت ہے کہ یہودی تین کے منتظر تھے۔ الیاس علیہ السلام کی دوبارہ آمد، سو وہ حضرت یحییٰ علیہ السلام میں پوری ہوئی۔ مسیح کی آمد جس کا دعویٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کیا۔ موعود نبی کی آمد، جس کا دعویٰ نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کیا نہ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے اور نہ بنی اسرائیل کا کوئی نبی جو شریعت موسوی کا پیرو ہو ایسا دعویٰ کر سکتا تھا کیونکہ نہ صرف وہ نبی بنی اسماعیل سے ہونا چاہیے بلکہ پیشگوئی کے مطابق یہ بھی ضروری تھا کہ اسے حضرت موسیٰ کی مثل ایک شریعت دی جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خصوصیت جو آپ کو بنی اسرائیل کے انبیاء میں ممتاز کرتی ہے، یہی ہے کہ آپ ایک جدید اور مستقل شریعت لائے۔ اس لیے پیشگوئی میں موسیٰ کی مثل کا لفظ لانے سے سوائے اس کے کچھ منشا نہیں ہو سکتا کہ وہ نبی بھی ایک جدید اور مستقل شریعت لانے والا ہو۔ اس لیے قرآن کریم بنی اسرائیل کے اس اعتراض کے جواب میں کہ ہم اُسی نبی کو مانیں گے جو ہماری شریعت کا پیرو ہو۔ اس پیشگوئی کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ اس کے مطابق تو یہ ضروری ہے کہ جو شریعت تم کو موسیٰ کے ذریعہ سے دی گئی ویسی ہی شریعت کسی اور کو دی جائے۔ تم اصرار کرتے ہو کہ ہم اپنی ہی شریعت کے پیرو نبیوں کو مانیں گے۔ حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیشگوئی اس امر کی مقتضی ہے کہ اس جیسی ایک اور شریعت بھیجی جائے۔ پس تم اپنے اصرار میں غلطی پر ہو۔

وَ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖۤ اِلَيْكَ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖۤ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآىِٕمًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَ يَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾

اور اہل کتاب میں سے وہ ہے کہ اگر تو اس کو مال کے ڈھیر پر امین بنائے تو وہ اسے تجھے واپس دے دے، اور ان میں سے وہ ہے کہ اگر تو اسے ایک دینار پر امین بنائے تو وہ اسے تجھے واپس نہ دے۔ سوائے اس کے کہ تو اس (کے سر) پر کھڑا رہے، یہ اس لیے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہم پر ان امیوں کے بارے میں کوئی (الزام کی) راہ نہیں، اور وہ اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں اور وہ جانتے ہیں۔ (466)

نبوت ایک قوم سے مخصوص نہیں:

اس کے بعد جو الفاظ آتے ہیں: ﴿قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ﴾ اور ﴿يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ﴾ یہ اہل کتاب کے اسی اعتراض کا جواب ہیں۔ یہاں نبوت کو ایک فضل فرمایا، تو فضل ایک قوم سے مخصوص نہیں یہ موہبت ہے جس کو اللہ چاہے دے دے۔ اس کا مقابلہ [البقرة: 105] سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جس طرح کا اعتراض اور جواب وہاں دیا ہے وہی دوسرے الفاظ میں بیان فرمایا ہے کیونکہ وہاں بھی یہ کہہ کر کہ ﴿مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ لَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ ''اہل کتاب میں سے جو کافر ہیں پسند نہیں کرتے اور نہ ہی مشرک کہ تمہارے رب سے تم پر کوئی بھلائی اتاری جائے۔'' جواب دیا تھا: ﴿وَ اللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ﴾ ''اور اللہ اپنی رحمت کے ساتھ جسے چاہتا ہے خاص کر لیتا ہے۔ اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔''

466- ﴿مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآىِٕمًا﴾ بعض نے یہاں لفظی معنی مراد لیے ہیں کہ واقعی اس کے سر پر کھڑا رہے اور اس سے اِدھر اُدھر نہ ہو۔ مگر یہ بلاضرورت تکلّف ہے۔ اس سے مراد مطالبہ اور تقاضا ہے جیسا کہ ابن قتیبہ نے کہا ہے: [أَصْلُهُ اَنَّ الطَّالِبَ لِلشَّيْءِ يَقُوْمُ بِهِ وَالتَّارِكُ لَهُ يَقْعُدُ عَنْهُ]۔ (غق) اصلیت اس محاورہ کی یہ ہے کہ ایک شے کا طالب اس کی رعایت کو ملحوظ رکھتا ہے گویا وہ اس پر کھڑا ہوتا ہے اور ترک کرنے والا اس کی طرف سے سست ہو جاتا ہے یا بیٹھ جاتا ہے۔ جیسا کہ قرآن شریف میں آتا ہے ﴿اُمَّةٌ قَآىِٕمَةٌ﴾ [آل عمران: 113:3] اور مراد ہے: عَامِلَةٌ بِاَمْرِ اللّٰهِ یعنی اللہ کے حکم پر عمل کرنے والی۔

سَبِيْلٌ کے معنی راہ، پھر ہر سبب جس کے ذریعہ سے دوسری چیز تک پہنچا جائے برا ہو یا بھلا۔ (غ) یہاں مراد یہ ہے کہ ہم تک پہنچنے کی کوئی راہ نہیں یعنی ہم پر کوئی پرسش یا الزام نہیں۔

بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَ اتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ ہاں جو شخص اپنے اقرار کو پورا کرتا ہے اور تقویٰ کرتا ہے تو

اہل کتاب کے معاملہ میں اسلام کا منصفانہ رویہ:

اہل کتاب کے بارہ میں قرآن کریم نے باوجود ان کی خطرناک عداوتوں کے اور دن رات اسلام کی بیخ کنی کے درپے رہنے کے نہایت انصاف کا معاملہ کیا ہے۔ اگر ان کی بدیوں کا ذکر کیا ہے تو ان کی نیکیوں کا بھی اعتراف کیا ہے۔ یہاں صرف ان کی بددیانتی کا ذکر نہیں کیا بلکہ ساتھ ہی اس کے ان میں نیک لوگوں کے وجود کا بھی اعتراف کیا ہے کہ وہ سونے کے ڈھیر پر بھی امین بنائے جائیں تو اس میں خیانت نہیں کرتے۔ گویا مسلمانوں کو بتایا ہے کہ کسی قوم کو بعض افراد کی وجہ سے بلاتمیز برا کہہ دینا یا برا سمجھ لینا ٹھیک نہیں۔ اگر کسی کو اس میں برائی دیکھ کر برا کہو تو اس میں نیکی پاؤ اس کا بھی اعتراف کرو اور بلاتفریق مذہب وملت، قوم ورنگ ہر ایک کے ساتھ نیکی اور انصاف کا معاملہ کرو۔

اصل ذکر تو یہاں دینی معاملات اور پیشگوئیوں کا تھا۔ اسی ذکر میں دنیوی معاملہ کا ذکر بھی کر دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین ودنیا کو کس طرح پر قرآن شریف نے اکٹھا کیا ہے۔ اس میں جہاں ایک طرف اہل کتاب کو یہ الزام دیا ہے کہ جب دنیوی معاملہ میں ان کی حالت ایسی خراب ہے کہ ایک دینار کی امانت کا حق ادا نہیں کر سکتے تو دینی معاملہ میں کتاب کی حفاظت میں، پیشگوئیوں کی حفاظت میں وہ کیونکر قابل اعتبار ہو سکتے ہیں؟ تو دوسری طرف مسلمانوں کو بھی سمجھایا ہے کہ دین ودنیا الگ الگ نہیں ہو سکتے۔ اگر وہ دنیوی معاملات میں امانت ودیانت کا حق ادا نہیں کر سکتے تو دین میں ان کا راہ راست پر ہونے کا دعویٰ کس کام کا ہے۔ چنانچہ یہاں معمولی دیانت کا ذکر کرتے ہوئے معاً روحانیت کی طرف انتقال کر کے فرماتا ہے: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ اَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا﴾ وہ لوگ جو اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے عوض تھوڑا سا مال یعنی اس دنیا کی زندگی کا سامان لے لیتے ہیں وہ یوں تکلیف اٹھائیں گے۔ یوں قرآن کریم نے ایک مسلمان کو یہ بتایا ہے کہ وہ روحانیت کوئی چیز نہیں جس کے ساتھ لوگوں سے اچھا معاملہ نہیں۔

اُمی سے مراد:

یہاں اُمیوں کے متعلق مفسرین نے تھوڑا سا اختلاف کیا ہے۔ بعض کے نزدیک تو مطلقاً عرب کے لوگ مراد ہیں اور یہ حالت اہل کتاب کے ان کے ساتھ معاملہ کی اسلام سے پہلے کی ہے۔ مگر بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد مسلمان ہیں یعنی مشرکوں کے ساتھ اہل کتاب کا معاملہ ہوتا رہتا تھا۔ جب اسلام آیا اور بعض لوگ مسلمان ہو گئے تو اہل کتاب نے ان کے اموال کو دبا لیا اور یہ عذر کر دیا کہ یہ لوگ چونکہ مرتد ہو گئے ہیں اس لیے اب ان کا کوئی حق ہم پر نہیں رہا۔ دونوں قسم کی روایات کو ابن جریر نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ مگر الفاظ میں عمومیت ہے اور ﴿اِنْ تَاْمَنْهُ﴾ میں خطاب بھی عام ہے یعنی اے مخاطب۔ اور وجہ یہی ہے کہ **اہل کتاب اپنے آپ کو عرب کے لوگوں سے بڑھ کر سمجھتے تھے** اس لیے ان کے حقوق کو اپنے برابر خیال نہ کرتے تھے۔ چنانچہ ان کا قول دوسری جگہ منقول ہے: ﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ﴾ [المآئدۃ: 18:5] ہم اللہ کے

يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۷۶﴾ یقیناً اللہ متقیوں سے محبت کرتا ہے۔ (467)

اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ اَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَ لَا

وہ لوگ جو اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے بدلے تھوڑی قیمت لے لیتے ہیں ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور نہ اللہ ان سے کلام کرے گا اور نہ قیامت کے دن ان کی

بیٹے اور اس کے پیارے ہیں اور دوسرے لوگ ہمارے سامنے کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ یہ غلط خیال اب بھی اہل کتاب میں مروج ہے کہ وہ عیسائی اقوام یا یورپین اقوام کے مقابل میں دوسری اقوام کے حقوق کو کمتر سمجھتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام یورپین قومیں باوجود ادعائے تہذیب کے ایک نہایت ذلیل حالت میں ہیں جس سے ان کو صرف اسلام کی بلند تعلیم ہی نکال سکتی ہے جو یوں تعلیم دیتا ہے ﴿بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ﴾ عہد کسی شخص کے ساتھ ہو سفید رنگ کے آدمی سے ہو یا سیاہ رنگ کے، فلاسفر سے یا جاہل سے، اپنے ہم مذہب اور ہم قوم سے ہو یا غیر مذہب اور غیر قوم سے **سب کے ساتھ پورا کرنا چاہیے** ایسا ہی امانت کا معاملہ ہے۔ نبی کریم ﷺ نے جب ایام جاہلیت کے خون وغیرہ کے انتقامات اور حقوق کو کالعدم قرار دیا تو ساتھ ہی امانت کے متعلق تاکید بھی فرمادی: [اِلَّا الْاَمَانَةَ فَاِنَّها مَوْدَاةٌ اِلَى الْبَرِّ وَالْفَاجِرِ] (روح المعانی، جلد3، صفحہ203) مگر امانت کے حقوق باطل نہیں ہوتے اور امانت نیک کی ہو یا بد کی سب کی طرف ادا ہونی چاہیے۔ اور چونکہ امانت اور معاہدات میں ہر ایک قسم کی ذمہ داریاں آجاتی ہیں اس لیے گویا یہ سمجھایا ہے کہ انسان کی ذمہ داری نیکوں کی طرف ہو یا بدوں کی، بڑوں کی ہو یا چھوٹوں کی پوری ادا ہونی چاہیے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے متعلق روایت ہے کہ کسی شخص نے کہا **اہل ذمہ** کی بعض چھوٹی چھوٹی چیزیں جیسے مرغی، بکری وغیرہ جنگ کے وقت ہم لے لیا کریں؟ آپ نے فرمایا کہ یہ تو اہل کتاب کے قول کی مانند ہے کہ ﴿لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ﴾ [75] جب وہ جزیہ ادا کردیں تو ان کے اموال میں کسی قسم کا تصرف جائز نہیں سوائے اس کے جو وہ اپنی خوشی سے دیں۔

467- اس چھوٹی سی آیت میں اسلام کی تعلیم کی وسعت ظاہر فرمائی ہے۔ ذکر تو صرف امانت کا تھا مگر ہر ایک قسم کی ذمہ داری کو اس کے اندر داخل کرنے کے لیے پہلے **عہد کے پورا کرنے کی طرف توجہ دلائی**، اور پھر تقویٰ کی طرف۔ عہد کو تو ہر ایک شخص سمجھتا ہے یعنی کوئی ذمہ داری جو انسان علی الانسان اپنے اوپر لے لیتا ہے عہد میں داخل ہو جاتی ہے۔ مگر تقویٰ کے اختیار کرنے میں اشارہ زیادہ باریک امور کی طرف ہے۔ جن کا تعلق امانت سے ہے کیونکہ امانت کی ادائیگی میں ہر قسم کے ان حقوق کی ادائیگی داخل ہے جو انسان کے ذمہ بطور امانت ہوں۔ خواہ وہ عہد کے اندر آتے ہوں یا نہ آتے ہوں۔ گویا **کھلا عہد ہو یا بطور امانت کوئی ذمہ داری ہو** خواہ کسی کے متعلق ہو تو ان عہدوں اور امانتوں کو ادا کرنا ضروری ہے اور اسی طرح پر انسان اللہ تعالیٰ کا محبوب بنتا ہے اور چونکہ اتقا کا مرتبہ ایسا کامل ہے کہ ایفائے عہد بھی اس میں آجاتا ہے اس لیے آخر پر صرف ﴿يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ﴾ فرمایا اور ان عہود میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ عہد بھی داخل ہے جس کے ایفا سے مراد یہ ہے کہ اس کے احکام کی جن کو انسان ایمان لا کر علی

يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ لَا يُزَكِّيْهِمْ ۪ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۷﴾

طرف دیکھے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔[468]

وَ اِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَ مَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ ۚ وَ يَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ

اور ان میں سے ایک گروہ ہے جو کتاب کے متعلق جھوٹ بناتے ہیں تاکہ تم اسے کتاب سے سمجھو۔ حالانکہ وہ کتاب سے نہیں ہے اور کہتے ہیں کہ وہ اللہ کی طرف سے ہے حالانکہ وہ

الاعلان قبول کر چکا ہے تعمیل کرے۔ اسی لیے اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے عہد کا ذکر شروع ہو جاتا ہے۔

468- اس آیت میں ان لوگوں کا انجام بتایا ہے جو اللہ کے ساتھ عہد کر کے اور قسمیں کھا کر پھر ان کو ضائع کر دیتے ہیں۔ یعنی اول ایمان کا اقرار کرتے بلکہ اس کے اوپر قسمیں کھاتے ہیں۔ پھر دنیا کے ادنیٰ ادنیٰ فوائد کے لیے یا اپنی اغراض نفسانی کے لیے اس عہد کی اور ان قسموں کی پروا تک نہیں کرتے۔ ﴿ثَمَنًا قَلِيْلًا﴾ سے مراد متاع الدنیا قلیل ہے اور اشتراء یہی ہے کہ وہ اس عہد کو ترک کر دیتے اور دنیا کے حقیر فائدہ کو لے لیتے ہیں۔

عیسائی اور معاہدات:

روئے سخن بالخصوص عیسائیوں کی طرف ہی ہے جن کے ساتھ یہ بحث چلتی ہے اس زمانہ میں تو عیسائیوں کی کیا طاقت تھی۔ پیشگوئی کے رنگ میں آئندہ کا حال بتایا ہے اور آج ہم کو تمام عیسائی اقوام کی یکساں حالت نظر آتی ہے کہ معاہدات کو وہ ردی کاغذ کے ٹکڑے سمجھتے ہیں اور اپنا مطلب نکالنے کا ذریعہ۔ ان کے انجام میں پانچ باتوں کا ذکر کیا ہے۔

1. اوّل: ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ یعنی صرف دنیا ہی دنیا، دنیا کا مال، دنیا کی حکومت ان کے مدنظر ہے اور دنیا تک ہی ان کی سب کوششیں محدود ہیں۔
2. دوم: اللہ تعالیٰ ان سے کلام نہیں کرے گا نہ دنیا میں نہ آخرت میں۔ دنیا میں مکالمہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے سے پیدا ہوتا ہے آخرت کا مکالمہ اسی کا نتیجہ ہے۔
3. سوم: اللہ تعالیٰ ان کی طرف دیکھے گا نہیں یعنی اس کی جناب میں ان کی کچھ قدر نہ ہوگی۔ کسی کی طرف نہ دیکھنے سے مراد یہی ہوا کرتی ہے کہ اس کی نگاہ میں اس کی کچھ قدر و قیمت نہیں۔
4. چہارم: یہ کہ اللہ تعالیٰ ان کو گناہوں سے پاک نہیں کرے گا۔ کفارہ کا عقیدہ کس طرح ناپاکیوں سے باہر نکال سکتا ہے بلکہ اس سے اور گناہ پر دلیری پیدا ہوتی ہے۔

اور سب سے آخر فرمایا کہ آخری نتیجہ اس دنیا پرستی کا دردناک دکھ ہے۔

وَ مَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَ يَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝٧٨

اللہ کی طرف سے نہیں ہے، اور وہ اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں اور وہ جانتے ہیں۔(469)

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَ

کسی بشر کے لیے (شایاں) نہیں کہ اللہ اسے کتاب اور حکم اور نبوت دے۔ پھر وہ لوگوں کو کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے ہو جاؤ، لیکن (وہ کہتا ہے) تم ربانی ہو جاؤ اس لیے کہ تم کتاب سکھاتے تھے اور اس لیے کہ تم

469- ﴿ يَلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ ﴾ اَلْسِنَةٌ لِسَانٌ کی جمع ہے اور ﴿ يَلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ ﴾ کے معنی مجاہد کے نزدیک يُحَرِّفُوْنَهٗ ہیں۔ (ج) یعنی کتاب کی تحریف کرتے ہیں۔ اَللّیّ کے (جو يَلْوُوْنَ سے مصدر ہے) اصل معنی [فَتْلُ الْحَبْلِ] ہیں یعنی رسہ کا بٹنا یا مروڑنا مگر [لَوّٰى لِسَانَهٗ بِكَذَا] ایک خاص محاورہ ہے جس کے معنی میں راغب نے لکھا ہے: [كِنَايَةٌ عَنِ الْكَذِبِ وَتَخَرُّصِ الْحَدِيْثِ] یعنی جھوٹ اور بات کے بنانے سے کنایہ ہے۔ اور اسی کے مطابق مجاہد نے معنی کیے ہیں۔ پس یہاں لفظی معنی زبان کو مروڑنے کے مراد نہیں بلکہ کتاب میں تحریف کے معنی ہیں یا کتاب کے متعلق جھوٹ بنانے کے اور [لَوَّيْتُ عَنْهُ الْخَبَرَ] کے معنی بھی ایسے ہی آتے ہیں: [اَخْبَرْتُهٗ بِهٖ عَلٰى غَيْرِ وَجْهِهٖ]۔ (ل) یعنی جو اصل حقیقت معاملہ تھی اس کے خلاف اسے خبر دی۔ اور اللوّ اور اللیّ کے معنی اَلْبَاطِلُ یعنی جھوٹ ہیں۔ جس طرح الحوّ اور الحیّ کے معنی اَلْحَقُّ سچ بھی آتے ہیں۔

یہاں اب صاف طور پر ان کی تحریف کتاب اللہ کو بیان کیا ہے جس کی طرف پہلے امانت کے ادا نہ کرنے کا ذکر کر کے اشارہ کیا تھا اور جس طرح سورہ بقرہ میں ﴿ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۗ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ﴾ [البقرة: 79:2] ''اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے۔'' کہہ کر یہ بتایا تھا کہ وہ تحریر میں تحریف کرتے ہیں۔ یہاں کتاب کے پڑھنے میں ان کی تحریف کا ذکر ہے۔ اور مراد یہ ہے کہ کچھ عبارتیں جھوٹ کے طور پر کتاب اللہ کی طرف منسوب کر کے پڑھ دیتے ہیں تا کہ تم ان عبارتوں کو کتاب کا حصہ سمجھو۔ حالانکہ وہ کتاب کا حصہ نہیں یعنی جو کتاب ان کے پاس ہے اس میں بھی وہ عبارتیں نہیں۔ اور پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے، حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں۔ یہاں دو باتوں کی نفی الگ الگ کی ہے۔ ایک یہ فرمایا کہ وہ کتاب میں سے نہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خود کتاب بھی ساری من عند اللہ نہیں یعنی پہلے اس میں تحریف موجود ہے مگر یہ اب پڑھنے میں اور بھی تحریف کر رہے ہیں اور کہ کتاب کا لفظ من عند اللہ سے پہلے اس لیے آیا ہے کہ ﴿ يَلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ ﴾ میں کتاب کے متعلق جھوٹ بنانے کا ذکر تھا سو پہلے اس کی تردید کی بعض مفسرین نے کتاب سے مراد توریت کو اور من عند اللہ سے مراد توریت سے پہلے انبیاء کی کتابوں کو لیا ہے۔ (غ ق)

بِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴿۷۹﴾ (اسے) پڑھتے تھے۔(470)

470- ﴿وَلٰكِنْ كُوْنُوْا﴾ تقدیر اس کی یوں ہے: [وَلٰكِنْ يَقُوْلُ كُوْنُوْا]

رَبَّانِيِّيْنَ۔ رَبَّانِيٌّ کی جمع ہے۔ مفردات میں ہے کہ ربانی یا تو ربان کی طرف منسوب ہے جیسے عَطْشَانُ۔ سُكْرَانُ آتا ہے اور یا رب کی طرف منسوب ہے۔ اگر رب کو مصدر تربیت کرنے کے معنی میں لیا جائے اور ربانی وہ عالم ہے جو علم کو نشوونما دیتا ہے: [اَلَّذِيْ يَرُبُّ الْعِلْمَ] اور یا وہ علم کے ساتھ اپنی تربیت کرتا ہے: [اَلَّذِيْ يَرُبُّ نَفْسَهُ بِالْعِلْمَ]۔ (غ) راغب کہتے ہیں کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے متلازم ہیں۔ کیونکہ جو شخص اپنے نفس کی تربیت علم سے کرتا ہے وہ علم کو بھی نشوونما دیتا ہے اور ایسا ہی اس کے برعکس اور بعض کے نزدیک رب کی طرف منسوب ہے جب اس سے مراد اللہ تعالیٰ ہو اور یہ اس طرح ہے جیسے ایک شخص کے متعلق کہہ دیا جائے اِلٰهِي۔ (غ) یعنی اللہ کی طرف منسوب اور اس سے مراد ہوگی: [مُقْبَلًا اِلٰى مَعْرِفَةِ الْاِلٰهِ وَ طَاعَتِهِ]۔ (غق) یعنی اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اطاعت کی طرف بڑھنے والا۔ اسی لیے ربانی سے مراد بعض نے اہل علم کو لیا ہے یا فقیہ کو، بعض نے عالم حکیم کو بعض نے حکیم متقی کو۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول منقول ہے: [اَنَا رَبَّانِيُّ هٰذِهِ الْاُمَّةِ] میں اس امت کا ربانی ہوں اور جب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فوت ہوئے تو ابن حنفیہ رحمہ اللہ نے کہا: [مَاتَ رَبَّانِيُّ هٰذِهِ الْاُمَّةِ] (مستدرك الحاكم: جلد3، صفحہ 616) اور بخاری میں ہے: [اَلَّذِي يُرَبِّي النَّاسَ بِصِغَارِ الْعِلْمِ قَبْلَ كِبَارِهِ]۔ (صحيح البخاری، كتاب العلم، باب الْعِلْمُ قَبْلَ الْقَوْلِ وَالْعَمَلِ، حديث:10) یعنی ربانی وہ (فقیہ) ہے جو لوگوں کو علم کی آسان باتیں اس کی مشکل باتوں سے پہلے سکھاتا ہے۔ لفظ ربانی میں بھی عیسائی عقیدہ پر ایک زد کی ہے یعنی انسان رب کو پہنچنے والا تو ہو سکتا ہے مگر رب نہیں ہو سکتا۔

تَدْرُسُوْنَ۔ [دَرَسُ الدَّارُ] کے معنی ہیں [بَقِيَ اَثَرُهَا]۔ (غ) یعنی اس کا اثر باقی رہا۔ اس لیے [دَرَسْتُ الْعِلْمَ] کے معنی ہیں [تَنَاوَلْتُ اَثَرَهُ]۔ (غ) یعنی اس کے اثر کو لیا اور چونکہ علم کا ایک دوسرے سے لینا قراءت کے ہمیشہ رہنے سے ہوتا ہے اس لیے درس سے مراد قراءت کا ہمیشہ رکھنا بھی ہے۔ یہاں تعلیم سے الگ درس کا ذکر اسی معنی میں ہے۔

عیسائیت کی تحریف:

تحریف کتاب کے ذکر میں اب ان کی ایک عظیم الشان تحریف کا ذکر کرتا ہے کہ انہوں نے بعض کلمات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف ایسے منسوب کر دیئے ہیں جن سے یہ معلوم ہو کہ وہ یہ تعلیم دیتے تھے کہ وہ خدا ہیں حالانکہ انہی کی کتابوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ایسے اقوال بھی موجود ہیں کہ مجھے خدا نے بھیجا ہے اور اپنی عبودیت کا بھی اقرار ہے تو اس لیے فرماتا ہے کہ ایک ایسے بشر کے لیے جسے اللہ تعالیٰ کتاب اور حکم اور نبوت دے یہ کہاں شایاں ہے کہ وہ پھر لوگوں کو یہ بھی کہے کہ اللہ کی عبادت کو چھوڑ کر میری عبادت کرو اور مجھے اپنا خدا مانو۔ وہ تو یہی تعلیم دے گا کہ تم ربانی بنو یا خدا تعالیٰ کی طرف قدم آگے بڑھانے والے بنو یا عالم وفقیہ بنو۔ کیونکہ عیسائیوں نے جو بعض استعارات کی بنا پر مسیح کو خدا بنایا ہے تو درحقیقت انہوں نے فقاہت سے کام نہیں لیا؛ ورنہ اگر تدبر

وَ لَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَ النَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۸۰﴾ ع 8 9 16

اور نہ یہ کہ وہ تم کو حکم دے کہ تم فرشتوں اور نبیوں کو خداوند بنالو، کیا وہ تم کو کفر کا حکم دے گا اس کے بعد کہ تم مسلم ہو چکے ہو۔ (471)

کرتے تو ان کو صاف سمجھ آجاتا کہ حضرت مسیح کے کسی کلمہ میں اگر خدا کے بیٹے کا لفظ اپنے لیے آ گیا ہے تو وہ خود ہی فرماتے ہیں کہ میرا خدا کا بیٹا اپنے آپ کو کہنا اس لیے قابل الزام نہیں کہ تمہارے بڑے یعنی بنی اسرائیل کے بزرگوں پر تو خدا کا لفظ بھی بولا گیا ہے گویا ان کی مراد یہ تھی کہ جس طرح وہ مجاز اور استعارہ کے رنگ میں خدا کہلائے اسی طرح میں مجاز اور استعارہ کے رنگ میں خدا کا بیٹا کہلایا۔ لیکن ایک قوم اٹھی جس نے نہ تو خدا کی طرف قدم اٹھانے میں ترقی کی نہ علم و فقاہت سے کام لیا اور لفظ پرستی اختیار کر کے مسیح کی طرف اس عقیدہ کو منسوب کر دیا کہ وہ یہ تعلیم دیتا تھا کہ میں ہی خدا ہوں اس لیے میری ہی عبادت کرو۔

علمائے ربانی مثیل اور وارث انبیاءؑ ہیں:

تم ربانی بنو اس لیے کہ تم تعلیم کتاب اور درس کتاب دیتے ہو۔ معلوم ہوا کہ ربانیت کا مرتبہ محض تعلیم و تدریس سے اوپر ہے ایسے ہی علماء یعنی علمائے ربانی کے حق میں کہا گیا ہے: [اَلْعُلَمَاءَ هُمْ وَرَثَةُ الأَنْبِيَاءِ] (صحيح البخاري، كتاب العلم، باب الْعِلْمُ قَبْلَ الْقَوْلِ وَالْعَمَلِ) کہ علماء انبیاء کے وارث ہیں اور انہی کے حق میں ہے: [عُلَمَاءُ اُمَّتِيْ كَاَنْبِيَاءِ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ] میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے نبیوں کی طرح ہیں۔

یہاں اشارہ صاف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف ہے۔ اور **آپ کو اور آپ کی طرح ہر نبی مرسل کو تین چیزیں دینے کا ذکر ہے۔** کتاب، حکم، نبوۃ۔ جس سے معلوم ہوا کہ ہر نبی کو لازماً کتاب و حکم ملتا ہے، حکم سے مراد فیصلہ کرنے کا اختیار ہے یعنی وہ خود صاحب اختیار ہوتا ہے اور وحی الٰہی کے ماتحت فیصلہ کرتا ہے۔ دوسری جگہ اٹھارہ نبیوں کا ذکر کر کے فرمایا ہے: ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ﴾ [الأنعام: 89:6] ''یہ وہ ہیں جن کو ہم نے کتاب اور حکم اور نبوت دی۔''

471- ﴿وَلَا يَاْمُرَكُمْ﴾ یَاْمُرَ پر نصب ہے اس لیے کہ یَقُوْلُ پر عطف ہے اور لَا مزید تاکید کے لیے ہے۔ یا ترکیب عبارت یوں ہے: [مَا كَانَ بَشَرٌ اَنْ ....يَقُوْلُ....وَلَا اَنْ يَاْمُرَكُمْ]

وفد نجران کا خیال کہ آنحضرت ﷺ خود خدا بنتے ہیں:

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے وفد نجران کو بہت سمجھایا تو انہوں نے کہا: [اَتُرِيْدُ اَنْ نَعْبُدَكَ وَ نَتَّخِذَكَ رَبًّا] کیا آپ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کی عبادت کریں اور آپ کو رب بنالیں؟ تو آپ نے فرمایا معاذ اللہ۔ انہوں نے سمجھا ہوگا کہ یہ اس قدر زور جو حضرت مسیح کی خدائی کے خلاف دے رہے ہیں تو شاید اپنے آپ کو خدا منوانا چاہتے ہیں اور کیا غرض ہو سکتی ہے؟ اس آیت میں اللہ نے فرمایا ہے کہ یہ تو کسی نبی کو بھی شایاں نہیں کہ وہ لوگوں کو یہ کہے کہ نبیوں یا فرشتوں کو

وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَاۤ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَ لَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَ اَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ ؕ قَالُوْۤا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَ اَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝۸۱

اور جب اللہ نے نبیوں کے ذریعہ سے عہد لیا کہ جو کچھ میں نے تمہیں کتاب اور حکمت سے دیا ہے پھر تمہارے پاس وہ رسول آئے جو اس کی تصدیق کرنے والا ہو جو تمہارے پاس ہے تو تم نے ضرور اس پر ایمان لانا ہوگا اور ضرور اس کی مدد کرنی ہوگی۔ کہا کیا تم اقرار کرتے ہو اور اس پر میرے عہد کا بوجھ لیتے ہو۔ انہوں نے کہا ہم اقرار کرتے ہیں، کہا پس گواہ رہو اور میں تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں۔ (472)

اپنے خداوند مانو۔ کیونکہ نبی تو مسلم فرمانبردار بنانے آتا ہے اور کسی دوسرے کی عبادت یا اس کو خدا ماننا یہ کفر میں داخل ہے۔ پھر نبی اپنے کیے پر آپ پانی کیوں پھیرے گا۔ اس آیت میں اس استدلال کی طرف بھی اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی نبی کو یہ شایاں ہوتا تو کوئی نبی دنیا میں اور بھی ایسا ہوا ہوتا جس نے یہ تعلیم دی ہوتی۔ مگر حضرت مسیح کے متنازعہ اقوال کو چھوڑ کر کیا دنیا کے کسی اور نبی کا ایسا قول دکھایا جا سکتا ہے؟ جب اس قدر نبی دنیا میں آئے اور کسی نے ایسی تعلیم نہیں دی تو معلوم ہوا کہ مسیح کی طرف ایسی تعلیم منسوب کرنا بھی درست نہیں۔

472- ﴿مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ﴾ میثاق کی اضافت اَلنَّبِيِّيْنَ کی طرف دو طرح پر ہو سکتی ہے یا تو انبیاء معاہدہ مِنْهُ ہیں اور ﴿مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ﴾ سے مراد وہ میثاق ہے جو نبیوں سے لیا گیا اور یا انبیاء معاہد ہیں یعنی عہد لینے والے اور ﴿مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ﴾ سے مراد وہ عہد ہے جو انبیاء نے لیا جیسے میثاق اللہ اس عہد کو کہہ سکتے ہیں جو اللہ نے لیا۔ قرآن کریم میں آتا ہے ﴿وَ مِيْثَاقَهُ الَّذِىْ وَاثَقَكُمْ بِهٖۤ﴾ [المآئدۃ: 7:5] ''اور اس کے اس عہد کو بھی جو اس نے تم سے پختہ لیا۔'' جہاں مِيْثَاقِهٖ سے مراد اللہ کا میثاق یا وہ عہد ہے جو اللہ تعالیٰ نے لیا اور چونکہ انبیاء علیہم السلام نے تو آنحضرت ﷺ کے وقت تک زندہ نہ رہنا تھا اور میت مکلف نہیں اس لیے دوسرے معنی ہی مراد ہو سکتے ہیں۔ گویا ترکیب یوں ہوئی: [اِذَا اَخَذَ اللّٰهُ الْمِيْثَاقَ الَّذِىْ وَثَقَهُ النَّبِيُّوْنَ عَلٰى اُمَمِهِمْ] یہی معنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کیے ہیں۔ جب آپ سے کہا گیا کہ فلاں شخص ﴿مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ﴾ پڑھتا ہے (اور یہ قراءت گویا تفسیر اصل الفاظ کی تھی) تو آپ نے فرمایا: [اِنَّمَا اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى اُمَمِهِمْ] (د) یعنی اللہ تعالیٰ نے نبیوں کا میثاق ان کی امتوں پر لیا۔ اور بعض نے یہاں اَلنَّبِيِّيْنَ سے مراد حذف مضاف پر اُمَمُ النَّبِيِّيْنَ لیا ہے یعنی جب اللہ تعالیٰ نے نبیوں کی امتوں کا عہد لیا۔ ایک اور صورت وہ ہو سکتی ہے جو ترجمہ میں اختیار کی

فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿٨٢﴾ پھر جو کوئی اس کے بعد پھر جائے تو وہی بدعہد ہیں۔

گئی۔ یعنی وہ عہد جو انبیاء کے ذریعہ سے لیا گیا۔ قرآن کریم میں اس کی اور مثال بھی موجود ہے: ﴿اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ﴾ [الأعراف: 169:7] کیا ان سے میثاق کتاب نہیں لیا گیا۔ جہاں میثاق کتاب سے مراد وہ میثاق ہے جو کتاب میں مذکور ہے یا جو بذریعہ کتاب لیا گیا ہے۔ کثیر علماء جیسا کہ امام رازی نے لکھا ہے اسی طرف گئے ہیں کہ یہاں مراد وہی میثاق جو نبی اپنی امتوں سے لیتے تھے۔ [اَلْمُرَادُ مِنَ الْآيَةِ أَنَّ الْأَنْبِيَاءِ عَلَيْهِمُ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ كَانُوْا يَأْخُذُوْنَ الْمِيْثَاقَ مِنْ أُمَمِهِمْ بِأَنَّهُ إِذَا بَعَثَ مُحَمَّدًا ﷺ فَإِنَّهُ يَجِبُ عَلَيْهِمْ أَنْ يُؤْمِنُوْا بِهِ وَأَنْ يَنْصُرُوْهُ، وَهٰذَا قَوْلُ كَثِيْرٍ مِنَ الْعُلَمَاءِ] (تفسير الرازی: جلد1، صفحہ 1186)

لَمَآ۔ اس کے معنی یہاں دو طرح پر ہو سکتے ہیں۔ یا تو مَا موصولہ اور لام ابتدا کے لیے ہے اور معنی یوں ہوں گے وہ جو میں نے تم کو کتاب و حکمت سے دیا اور یا مَا متضمن معنی شرط ہے اور اخذ میثاق کو قسم لینے کے معنی میں لے کر ﴿لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ﴾ کو جواب قسم سمجھا جائے اور جواب شرط یا جزا کے علیحدہ ذکر کی ضرورت جواب قسم کے آجانے کی وجہ سے نہ رہی۔

اَخَذْتُمْ سے مراد یہاں قَبِلْتُمْ ہے تم نے قبول کیا۔ جیسے: ﴿اِنْ اُوْتِيْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ﴾ [المآئدة: 41:5] ''اگر تم کو یہ دیا جائے تو اسے لے لو'' میں۔

اِصْرِيْ۔ اِصْرٌ کے اصل معنی [نمبر: 365] میں بیان ہو چکے ہیں۔ [اَلثِّقْلُ وَالشَّدُّ] بوجھ اور مضبوط باندھ دینا۔ اس کے معنی عہد شکنی کا گناہ بھی آتے ہیں۔ [نمبر: 365] اور اِصْرٌ اس عہد مؤکد کو بھی کہتے ہیں جو توڑنے والے کو ثواب سے پیچھے رکھتا ہے۔ (غ) اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اِصْرٌ کے معنی یہاں مطلق بوجھ یا ثقل ہوں جو اس کے اصل معنی ہیں اور [اَخَذْتُمْ اِصْرِيْ] سے مراد ہو کہ یہ بوجھ جو میں تم پر ڈالتا ہوں کہ رسول موعود کی نصرت کرنا ہوگا اس بوجھ کو تم قبول کرتے ہو۔ چنانچہ دوسری جگہ رسول کریم ﷺ کی شان میں فرمایا: ﴿يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ﴾ [الأعراف: 157:7] ان کے بوجھ کو ان سے ہٹاتا ہے۔ یعنی اس رسول کو قبول کرنے سے وہ بوجھ جو انسانوں پر رکھا گیا تھا قبول کرنے والوں کے ذمہ سے ہٹ گیا۔

آنحضرت ﷺ جملہ انبیائے عالم کے موعود ہیں:

اصل بحث اہل کتاب سے تھی ان پر کامل اتمام حجت کر کے اور پچھلے رکوع میں ان کو پیشگوئیوں کی طرف توجہ دلا کر اب بتایا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی پیشگوئیاں صرف یہودیوں اور عیسائیوں کی کتابوں میں ہی نہیں بلکہ اسلام جملہ انبیائے عالم کا موعود مذہب ہے اور اس رکوع میں یہ ذکر فرمایا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ سب نبیوں کے موعود ہونے کے لحاظ سے **اول النبیین اور بعثت میں آخری نبی ہیں** اور اس سے اگلے رکوع میں یہ ذکر فرمایا ہے کہ خانہ کعبہ سب سے پہلا خدا کا معبد ہے جو زمین پر مقرر کیا گیا اور وہ آخری معبد بھی ہے اس لحاظ سے کہ اس کی خیر و برکت دائمی ہے اور کبھی منقطع نہ ہوگی۔ گویا یہ دونوں رکوع اسلام کی

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَ لَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ تو کیا اللہ کے دین کے سوا کچھ اور چاہتے ہیں اور جو آسمانوں

کمال عظمت کو ظاہر کرنے والے ہیں۔

اس بات پر کہ رسول مصدق جس کے آنے کا یہاں ذکر ہے اس سے مراد آنحضرت ﷺ ہیں قریباً قریباً امت کا اتفاق ہے اور ابن جریر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ روایت ہے: [لَمْ يَبْعَثِ اللّٰهُ تَعَالٰى نَبِيًّا آدَمَ فَمَنْ بَعْدَهُ اِلَّا اَخَذَهُ عَلَيْهِ الْعَهْدَ فِيْ مُحَمَّدٍ ﷺ] (روح المعانی: جلد3، صفحہ 209) یعنی آدم علیہ السلام سے لے کر آخر تک اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی مبعوث نہیں کیا جس سے محمد ﷺ کے متعلق عہد نہ لیا ہو اور یہی صحیح ہے۔

جیسا کہ قرآن کریم میں بار بار ذکر آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک قوم میں اور ہر ایک امت میں ایک رسول مبعوث کیا یا بعض قوموں میں ایک سے زیادہ رسول بھی معبوث کیے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ جس قدر رسول آنحضرت ﷺ سے پہلے آتے رہے یہ سب خاص خاص قوموں کی طرف آتے رہے۔ **کل دنیا کی طرف مبعوث ہونا یہ** صرف ایک ہی رسول کے لیے مخصوص رکھا گیا جو سب سے آخر اور سب کو ایک دین پر جمع کرنے کے لیے آیا۔ تو چونکہ اس رسول نے ساری قوموں کو ایک دین پر جمع کرنا تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ساری قوموں سے بذریعہ ان کے نبیوں کے یہ عہد لیا کہ جب وہ رسول آجائے تو تم سب نے اس کے دین پر چلنا ہوگا۔ کیونکہ اصل غرض یہی تھی کہ نسل انسانی کے اندر سے قومیت کی تفریقوں کو مٹایا جائے اور سب کو بھائی بھائی بنایا جائے مگر مختلف قوموں میں مختلف نبیوں کے آنے سے قومی امتیازات ایک حد تک مضبوط ہوتے چلے گئے۔ کیونکہ ہر قوم ہدایت کے لیے اپنے ہی نبی کو دیکھتی تھی اور اس کو دوسری قوم کے نبی کی تعلیم سے کوئی سروکار نہ تھا اور چونکہ تعلقات بین الاقوام بھی اس وقت نہ تھے۔ سب قومیں اپنے اپنے ملکوں میں علیحدہ علیحدہ پڑی ہوئی تھیں۔ اس لیے ان حالات کا اقتضا بھی یہی تھا کہ ہر قوم کے اندر جدا جدا نبی مبعوث ہو، مگر یہ علیحدگی جو ملکوں اور قومیتوں کی حد بندی سے پیدا ہوئی ہمیشہ کے لیے رہنے والی نہ تھی۔ اس لیے یہ ضروری ہوا کہ جب وہ وقت آجائے کہ تعلقات بین الاقوام کی راہیں کھل جائیں تو قومی رسولوں کی بجائے ایک ہی رسول ساری دنیا کی طرف مبعوث ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی رسول دنیا میں ہوا جس نے علی الاعلان بار بار کہا کہ میں کل عالمین کی طرف آیا ہوں اور جس کے متعلق ارشاد ہوا کہ ہم نے تم کو ﴿كَآفَّةً لِّلنَّاسِ﴾ بھیجا ہے جس نے قومیتوں کی ساری تفریقوں کو مٹایا اور نسل انسانی کو وہ حکم خداوندی سنایا جو ان کو بھائی بھائی بنانے والا تھا ﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ﴾ [الحجرات: 13:49] ''اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تم کو شاخیں اور قبیلے بنایا تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے معزز وہ ہے جو سب سے متقی ہے۔'' تو چونکہ اس رسول نے سب قوموں کو دین واحد پر جمع کرنا تھا۔ اس لیے سب قوموں سے یہ عہد لیا گیا کہ تم نے اس رسول پر ایمان لانا اور اس کی نصرت کرنی ہوگی اور یہ عہد ہر ایک قوم سے بذریعہ ان کے نبی کے لیا گیا۔ یہی وہ مضمون ہے جس کو اس آیت میں بیان فرمایا ہے اسی کی طرف اشارہ ہے جو ایک حدیث میں آیا ہے: [أَنَا أَوَّلُ النَّبِيِّيْنَ خَلْقًا وَّاٰخِرُهُمْ بَعْثًا] (تفسیر السمعانی: جلد4، صفحہ 261) کیونکہ اگر آپ [أَنَا أَوَّلُ النَّبِيِّيْنَ

فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا اور زمین میں ہیں خوشی اور ناخوشی اسی کے

خَلْقًا] نہ ہوتے تو آپ کے متعلق ہر نبی سے وعدہ کس طرح لیا جاتا؟ اور بعثت میں آخری اس لیے ہوئے کہ تا کل نبیوں سے آپ کے متعلق عہد لیا جائے اور آپ بھی کل کی تصدیق کریں۔

آخری رسول کی سب سے بڑی علامت تصدیق رسل عالم ہے:

اس رسول کی سب سے بڑی علامت جو یہاں بتائی وہ یہ ہے کہ وہ ﴿مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ﴾ ہے یعنی اس کی تصدیق کرتا ہے جو پہلی قوموں کے پاس ہے۔ یہ ایک امتیازی نشان ہے جو رسول عربی فداہ امی وابی میں پایا جاتا ہے۔ کیونکہ یہی ایک رسول ہے جس نے اپنے سے پہلے دنیا کے تمام رسولوں پر ایمان لانا ضروری قرار دیا۔ چنانچہ اس کا ذکر قرآن کریم میں بار بار ہے۔ ابتدائے قرآن میں ہی فرمایا: ﴿يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ [البقرة: 4:2] جو کچھ تم سے پہلے نازل ہو چکا اس سب پر ایمان لاتے ہیں اور پھر بار بار فرمایا: ﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ﴾ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہاں بھی اس رسول مصدق کے اس امتیازی نشان کا ذکر فوراً کر دیا جیسا کہ آیت 84 میں فرمایا: ﴿قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَ مَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۪ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ﴾ ''کہہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو ہم پر اتارا گیا اور اس پر جو ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور (اس کی) اولاد پر اتارا گیا۔ اور جو موسیٰ اور عیسیٰ اور نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے دیا گیا ہم ان میں سے کسی میں فرق نہیں کرتے۔'' پس درحقیقت یہاں بتا دیا ہے کہ آنحضرت ﷺ دنیا کے کل نبیوں کی تصدیق فرماتے ہیں۔ اور اس طرح پر قرآن نے خود ہی یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ ﴿رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ﴾ سے کیا مراد ہے؟ کیونکہ محمد رسول اللہ ﷺ ہی دنیا میں ایک رسول ہوا ہے جس نے دنیا کے کل نبیوں کی تصدیق کی ہے اور ان پر ایمان لانا ضروری قرار دیا ہے۔

حواریانِ مسیح کی شہادت آنحضرت ﷺ کے لیے:

حضرت مسیح کے حواریوں نے بھی اس بات کی شہادت دی ہے کہ وہ نبی مثل موسیٰ جس کی پیشگوئی [استثناء: 18:15, 18] میں ہے اس کے متعلق دنیا کے کل نبیوں نے شہادت دی ہے۔ چنانچہ اعمال رسل باب 3 آیت 21 میں ہے:

> ''ضرور ہے کہ آسمان اسے لیے رہے اس وقت تک کہ سب چیزیں جن کا ذکر خدا نے اپنے سب پاک نبیوں کی زبانی شروع سے کیا اپنی حالت پر آویں۔ کیونکہ موسیٰ نے باپ دادوں سے کہا کہ خداوند جو تمہارا خدا ہے تمہارے بھائیوں میں سے تمہارے لیے ایک نبی میری مانند اٹھائے گا جو کچھ وہ تمہیں کہے اس کی سب سنو۔''

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح کے بعد تک اس پیشگوئی کا انتظار تھا اور دنیا میں ایک ہی شخص ہوا ہے جس نے یہ دعویٰ کیا کہ میں وہ نبی ہوں جس کی بابت کل نبیوں نے خبر دی تھی اور جس طرح اس کی خبر سب نبیوں نے دی۔ اسی طرح اس نے سب نبیوں پر ایمان لانا ضروری قرار دیا۔ قرآن کریم اگر تفصیلات میں پڑتا تو اتنی بڑی کتاب تو صرف نبیوں کی پیشگوئیوں کے ذکر

وَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۸۳﴾ فرمانبردار ہیں اور اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ (473)

کے لیے کافی ہوتی۔ اس لیے یہاں یہ بتا کر کہ کل نبیوں سے یہ عہد لیا گیا تھا اس کا موٹا نشان یہ بتایا کہ کل نبیوں کا موعود کل کی تصدیق کرنے والا ہے اور ﴿اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ﴾ [فاطر: 24:35] ''کوئی قوم نہیں مگر اس میں ڈرانے والا گزر چکا۔'' کہنے والا دوسرا کوئی انسان دنیا میں نہیں گزرا اور یہ موٹا نشان بتا کر صاف سلسلہ بنی اسرائیل کے جدامجد اور ان کے آخری نبی کی پیشگوئیوں کا ذکر صراحت سے کر دیا یعنی **حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا کا** ﴿رَبَّنَا وَ ابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيْهِمْ﴾ [البقرة: 129:2] ''اے ہمارے رب! اور ان میں انہی میں سے ایک رسول اٹھا جو ان پر تیری آیات پڑھے اور ان کو کتاب وحکمت سکھائے اور ان کو پاک کرے۔'' اور **حضرت مسیح کی اس پیشگوئی** کا ﴿مُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ﴾ [الصف: 6:61] ''ایک رسول کی خوشخبری دیتا ہوا جو میرے بعد آئے گا۔ اس کا نام احمد ہے۔'' اور باقی سب کے متعلق کہہ دیا ﴿يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِيْلِ﴾ [الأعراف: 157:7] ''اپنے پاس توریت اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں۔'' ﴿وَ اِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ﴾ [الشعرآء: 196:26] ''اور وہ پہلوں کے صحیفوں میں (موجود) ہے۔'' چونکہ کثرت سے کتابوں میں اب بھی آپ کی پیشگوئی موجود ہے اس لیے اگر کسی کتاب میں سے ضائع بھی ہوگئی ہو تو اس پر تعجب نہیں۔

473- يَبْغُوْنَ۔ بَغٰی کے اصل معنی میانہ روی سے تجاوز کو چاہنا ہے [دیکھو نمبر: 115]۔ گویا دین اللہ یا اسلام میانہ روی سکھاتا ہے اور جو اس کو چھوڑ کر کچھ اور چاہتا ہے وہ میانہ روی سے تجاوز کو چاہتا ہے۔

اَسْلَمَ۔ اسلام کے اصل معنی فرمانبرداری کرنا ہیں اور یہی وسیع معنی یہاں مراد ہیں جیسا کہ تمام مخلوق ارضی وسماوی کی طرف اسلم منسوب کرنے سے ظاہر ہے۔

﴿طَوْعًا وَّ كَرْهًا﴾ دونوں مصدر ہیں جو حال کی جگہ پر آئے ہیں یعنی مراد ہے طَائِعِيْنَ وَ كَارِهِيْنَ۔ طَوْعٌ کے معنی ہیں فرمانبرداری اختیار کرنا یعنی رضا ورغبت سے اور کُرْهٌ اس کی ضد ہے۔

اس آیت میں **اسلام کے عالمگیر مذہب ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے**۔ گویا پہلی آیت میں بتایا تھا کہ اسلام تمام انبیاء علیہم السلام کا موعود مذہب ہونے کے لحاظ سے ساری نسل انسانی کا مذہب ہے۔ اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ اسلام اپنی حقیقت میں کل عالم کا مذہب ہے صرف زمین میں انسانوں کا ہی نہیں بلکہ ﴿مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ﴾ [یونس: 66:10] ''جو کوئی آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے۔'' کا مذہب ہے کیونکہ اسلام کے اصل معنی فرمانبرداری ہیں اور مذہب کے رنگ میں قوانین شریعت کی فرمانبرداری کا نام اسلام ہے اور عام رنگ میں قوانین الٰہی کی فرمانبرداری بھی اسلام ہی ہے۔ پس اسلام جمیع مخلوقات کا مذہب ہے کیونکہ اس وسیع عالم میں جو چیز قوانین الٰہی کی فرمانبرداری نہ کرے گی اس کا وجود ہی نہیں رہ سکتا۔ بالفاظ دیگر ہر شے کا وجود ہی قوانین کی فرمانبرداری پر ہے۔ پس حقیقی معنی میں اسلام ہی عالمگیر مذہب ہے کیونکہ چھوٹے سے چھوٹے ذرہ سے لے کر بڑے سے بڑے کرہ تک سب اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں لگے ہوئے ہیں۔

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَ مَاۤ اُنْزِلَ عَلٰۤى اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ مَاۤ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۪ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۫ وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۸۴﴾

کہہ، ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو ہم پر اتارا گیا اور اس پر جو ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور (اس کی) اولاد پر اتارا گیا۔ اور جو موسیٰ اور عیسیٰ اور نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے دیا گیا ہم ان میں سے کسی میں فرق نہیں کرتے اور ہم اسی کے فرماں بردار ہیں۔ (474)

وَ مَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَ هُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۸۵﴾

اور جو کوئی اسلام کے سوا کوئی اور دین چاہتا ہے تو اس سے قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔ (475)

طوعاً و کرھاً فرمانبرداری سے مراد:

﴿طَوْعًا وَّ كَرْهًا﴾ سے یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ خواہ کچھ ہو کوئی چیز قانون الٰہی کی فرمانبرداری سے باہر نہیں نکل سکتی۔ کیونکہ فرمانبرداری تو طوعاً ہی ہوتی ہے یعنی اپنی رضا و رغبت سے۔ لیکن اگر ان چیزوں کو اختیار ہوتا کہ وہ فرمانبرداری کریں یا نہ کریں اور اپنی رضا و رغبت سے وہ فرمانبرداری نہ کرتیں تو کرھاً بھی ان کو فرمانبرداری اختیار کرنی پڑتی یا ﴿طَوْعًا وَّ كَرْهًا﴾ میں دو قسم کی فرمانبرداری کا ذکر ہے۔ ایک تو وہ چیزیں ہیں جن کی خواہش فرمانبرداری کے خلاف ہو سکتی ہی نہیں جیسے مثلاً ملائکہ یا خود زمین و آسمان اور ان کی طاقتیں جیسا کہ ﴿اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ﴾ [حٰمٓ السجدة: 11:41] ''ہم دونوں خوشی سے حاضر ہیں۔'' سے ظاہر ہے طبعی امور میں انسان بھی اسی طرح فرمانبرداری اختیار کرتا ہے۔ مگر وہ امور جن کا تعلق اختیار اور ارادہ سے ہے ان میں کَرْہٌ بمعنی مشقت کے ساتھ فرمانبرداری ہے۔ یعنی اس کام کو انسان طبعاً نہیں کرتا بلکہ مشقت اس کے لیے بکار ہے اور یا کَرْہٌ بمعنی ناخوشی سے یوں فرمانبرداری ہے کہ کافر جب خوشی سے ان قوانین کی فرمانبرداری نہیں کرتا تو ناخوشی سے بھی اس کو کرنی پڑتی ہے۔ کیونکہ ایسے قوانین میں فرمانبرداری دو طرح پر ہے جو شخص ان قوانین پر چلتا ہے وہ سکھ پاتا ہے جو نہیں چلتا وہ دکھ اٹھاتا ہے۔ پس جس نے قانون کی فرمانبرداری طوعاً نہ کی اس کو کَرْھًا یعنی دکھ اور سزا کے رنگ میں کرنی پڑی۔ اسی لحاظ سے مفسرین نے طَوْعًا فرمانبرداری مومن کے لیے اور کَرْھًا کافر کے لیے لکھی ہے۔ (ث)

474- اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ واقعی یہی رسول مصدق ہے جو سب کا موعود تھا کیونکہ اس نے سب انبیاء پر ایمان لانا ضروری قرار دیا۔

475- اَلْخَاسِرُوْنَ۔ خُسْرٌ اور خُسْرَانٌ راس المال کے کم ہو جانے کا نام ہے۔ (غ)

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَ شَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّ جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۶﴾

اللہ ان لوگوں کو کس طرح ہدایت کرے جو اپنے ایمان کے بعد کافر ہوئے اور وہ گواہ ہیں کہ رسول سچا ہے اور ان کے پاس کھلی دلیلیں آچکیں، اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا۔ (476)

اسلام کو چھوڑنا فطرت بگاڑنا ہے:

جب دین اسلام سب انبیاء علیہم السلام کا موعود بھی ہوا۔ سب رسولوں کا مصدق بھی ہوا، بلحاظ اپنے معنی کے تمام ذرات عالم کا مذہب بھی ہوا۔ تو جو شخص ایسے کامل دین کو چھوڑ کر ناقص چیز کو قبول کرے وہ واقعی خسارہ میں ہے اور چونکہ خسران راس المال کے ضائع ہوجانے کا نام ہے۔ اس لیے اس نے گویا اپنے راس المال کو بھی تباہ کر دیا۔ انسان کا راس المال مذہب کے معاملہ میں اس کی فطرت ہے اور حدیث شاہد ہے کہ [كُلُّ مَوْلُودٍ يُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ] (صحيح البخاری، كتاب الجنائز، باب مَا قِيلَ فِي أَوْلاَدِ الْمُشْرِكِينَ: 1385) ہر ایک انسانی بچہ اسی فطری دین پر پیدا ہوتا ہے۔ پس جو شخص اسلام یا کامل فرمانبرداری کی راہوں کو ترک کر کے ادھر ادھر بھٹکتا پھرتا ہے اس نے اپنی فطرت کو بھی بگاڑ دیا۔

نجات اور دوسرے مذاہب:

یہ آیت اس بات کا فیصلہ کرتی ہے کہ کامل راہیں نجات کی صرف اسلام میں پائی جاتی ہیں۔ گو قرآن کریم دوسرے مذاہب میں خوبیوں کا اعتراف کرتا ہے گو اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ سب مذاہب کی ابتدا خدا کی طرف سے ہی ہے مگر ساتھ ہی اس امر حق کا بھی اظہار فرماتا ہے کہ سب مذاہب میں غلطیوں کے راہ پا جانے سے اب انسان کے ذریعہ سے گناہ سے نجات یا اخروی نجات حاصل نہیں کر سکتا۔ یہی معنی ہیں اس حدیث صحیح کے [مَنْ عَمِلَ عَمَلًا لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ] (صحيح البخاری، كتاب الاعتصام بالكتاب، باب إِذَا اجْتَهَدَ الْعَامِلُ أَوِ الْحَاكِمُ فَأَخْطَأَ خِلاَفَ الرَّسُولِ مِنْ غَيْرِ عِلْمٍ ، فَحُكْمُهُ مَرْدُودٌ) (ث) جو شخص ایسا عمل کرتا ہے جس پر ہمارا امر نہیں وہ مردود ہے۔ ہاں ہر ایک نیکی کے کام پر خدا اور اس کے رسول کا امر موجود ہے۔ پس نیکی کا کام کوئی بھی کرے مردود نہیں اور اس لیے یہ ضروری ہے کہ سب لوگ دین واحد پر جمع ہو کر گناہ کی غلامی سے بھی نجات حاصل کریں اور دنیا میں ایک عظیم الشان اخوت نسل انسانی کے قائم کرنے کا موجب بھی ہوں۔

476- **اہل کتاب کا باوجود مشاہدہ صداقت نبوی سے انکار:** گو بعض نے کہا ہے کہ اس آیت میں ایک خاص گروہ کا ذکر ہے جو اسلام لا کر پھر مرتد ہو گئے اور اہل مکہ سے جا ملے اور ان میں ابو عامر راہب کا نام بھی لیا گیا ہے۔ مگر حسن اور ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایات صریحہ ہیں کہ ان آیات میں اہل کتاب کا ہی ذکر ہے اور یہی سیاق و سباق عبارت چاہتا ہے۔ اصل مخاطب تو اس رکوع میں اہل کتاب ہی ہیں۔ اسلام پر اس قدر کھلے دلائل کے باوجود ان لوگوں نے کوئی توجہ اسلام کی طرف نہ کی۔

أُولَٰئِكَ جَزَآؤُهُمْ أَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿٨٧﴾

ایسے لوگوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ اور فرشتوں اور لوگوں سب کی لعنت ہے۔

خَالِدِينَ فِيهَا ۖ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ﴿٨٨﴾

اس میں رہیں گے نہ ان سے عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی۔ (477)

إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِن بَعْدِ ذَٰلِكَ وَأَصْلَحُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٨٩﴾

مگر وہ جنہوں نے اس کے بعد توبہ کی اور اصلاح کی، تو اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ (478)

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَّن تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۖ وَ

جو اپنے ایمان کے بعد کافر ہوئے پھر کفر میں بڑھتے گئے ان کی توبہ قبول نہیں ہوتی،

﴿كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ﴾ سے یہ مراد ہے کہ وہ پہلے انبیاء پر ایمان لائے اور اس کے بعد اب محمد رسول اللہ ﷺ کا کفر کرتے ہیں ﴿وَ شَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ﴾ میں یہ اشارہ ہے کہ درحقیقت رسول اللہ ﷺ کی صداقت کا یہ لوگ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر چکے ہیں۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ﴿يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ﴾ [البقرة: 146:2] ''اسے اسی طرح پہچانتے ہیں جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔'' اور دوسری جگہ فرمایا: ﴿لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ اَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ﴾ [آل عمران: 70:3] ''اللہ کی آیتوں کا انکار کیوں کرتے ہو، حالانکہ تم گواہ ہو۔'' بینات سے مراد کھلے دلائل ہیں جن میں سے کئی ایک یہاں بھی بالتفصیل بیان ہو چکے ہیں۔

اللہ کے ان کو ہدایت نہ دینے سے یا تو یہ مراد ہے کہ ان کو ہدایت کی منزل مقصود پر نہیں پہنچاتا یا یہ کہ ان کو کامیاب نہیں کرتا یا جنت میں نہیں پہنچاتا اور یا یہ کہ ایسے ظالموں سے ہدایت کی توفیق چھین لیتا ہے اور یہ ان کے دلائل کی طرف توجہ نہ کرنے اور باوجود مشاہدہ حق کو قبول نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔

477- ان لعنتوں کے متعلق [دیکھو نمبر: 199]۔ دونوں جگہ اس لعنت کو دوزخ قرار دیا ہے اسی لیے فرمایا: ﴿خٰلِدِيْنَ فِيْهَا﴾ [البقرة: 162:2] ''اسی میں رہیں گے۔''

478- **توبہ کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہے:** اسلام کوئی ایسی مہر کفار کے قلوب پر تجویز نہیں کرتا جو ٹوٹ نہ سکتی ہو۔ ان لوگوں کی زیادتیوں اور کفر پر اصرار وغیرہ کا سارا ذکر کر کے اور ان کی خطرناک سزا کا ذکر کر کے فرماتا ہے پھر بھی جو لوگ توبہ کریں اور توبہ کے ساتھ اصلاح کریں وہ اس سزا کے پانے والے نہیں ہوں گے۔ مگر توبہ کے ساتھ اصلاح شرط ہے اور اس پر غفر کا وعدہ ہے یعنی ان کی وہ طاقتیں جو ان سے بدیاں کراتی تھیں اللہ تعالیٰ ان سے حفاظت کرے گا۔

أُولَٰئِكَ هُمُ الضَّالُّونَ ﴿٩٠﴾ اور وہی گمراہ ہیں۔ (479)

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَن يُقْبَلَ مِنْ أَحَدِهِم مِّلْءُ الْأَرْضِ ذَهَبًا وَلَوِ افْتَدَىٰ بِهِ ۗ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ وَمَا لَهُم مِّن نَّاصِرِينَ ﴿٩١﴾ ع 9 11 17

جو کافر ہوئے اور مر گئے اور وہ کافر ہی تھے تو ان میں سے کسی سے زمین (480) بھر کر سونا بھی قبول نہ کیا جائے گا اگر چہ وہ اسے فدیہ دے۔ ان کے لیے دردناک عذاب ہے اور ان کے لیے کوئی بھی مددگار نہیں ہوگا۔

479- **ازدیادِ کفر:** ﴿ازْدَادُوْا كُفْرًا﴾ سے مراد اِصْرَارٌ عَلَى الْكُفْرِ ہے۔ کیونکہ جب کفر پر اصرار ہوتا ہے تو وہ بڑھتا رہتا ہے اور یا عداوت میں بڑھتے جاتا ہے۔ بعض لوگوں نے اسے یہودیوں سے مخصوص کیا ہے کہ انہوں نے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لا کر پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کیا اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کر کے کفر میں بڑھ گئے۔ مگر یہ بلا وجہ تحدید ہے سارے اہل کتاب مراد ہیں جن کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے۔ اور کفر میں ان کا ترقی کرتے جانا مخالفت حق میں بڑھتے جانا ہے۔ ایسے لوگ اگر گھر میں بیٹھ کر توبہ بھی کریں تو یہ توبہ قبول نہیں ہوتی۔ کیونکہ ان کے اعمال اس کے خلاف ہوتے ہیں۔ اور حق کو وہ ملیا میٹ کرنا چاہتے ہیں۔ توبہ کیسی! اور یا جیسا کہ ابن الانباری اور قفال نے کہا ہے کہ یہ متعلق ہے ان لوگوں کے جن کا ذکر ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا﴾ [البقرة: 160:2] میں پہلے آچکا ہے اور مراد یہ ہے کہ اگر توبہ کر کے پھر کفر کی طرف لوٹ گئے اور کفر میں بڑھتے گئے تو وہ ان کی پہلی توبہ قبول نہ ہوئی۔

480- ﴿مِّلْءُ الْاَرْضِ﴾ مِلْءُ الشَّيْءِ سے مراد ہوتی ہے مِقْدَارٌ یا مَا يَمْلَأُ یعنی وہ مقدار جس سے وہ شے بھر جائے۔ پس اس قدر سونا مراد ہے جس سے زمین بھر جائے۔

مال دنیا آخرت میں کام نہ دے گا:

اس آیت میں صاف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب جو دین حق سے منحرف ہو کر اس قدر سونا کمائیں گے گویا کہ ساری زمین ہی سونے سے بھر جائے گی تو اس قدر سونا بھی اس نقصان کی تلافی نہ کر سکے گا جو دین سے انحراف میں انہوں نے اٹھایا ہوگا۔ ﴿لَوِ افْتَدٰى بِهٖ﴾ اس لیے فرمایا کہ یوں قبول نہ کرنے میں اس قدر اظہار ناراضگی نہیں جس قدر اس میں بطور فدیہ کوئی چیز پیش کی جائے تو اسے قبول نہ کیا جائے۔ گویا یوں فرمایا کہ ان کا ساری زمین کو سونے سے بھر دینا تو کسی کام ہی نہیں بطور فدیہ بھی دیں تو قبول نہیں ہوگا۔ اور ﴿مِنْ اَحَدِهِمْ﴾ اس لیے فرمایا کہ جس قدر سونا سب مل کر پیدا کر سکتے ہیں اتنا اتنا اکیلا بھی کرے تو اسے کچھ کام نہ دے گا۔ بتایا ہے کہ اخلاق اور روحانیت کے مقابلہ میں سونا ہیچ ہے۔